پاکیزہ سوسائٹی
جنوری 2014
www.paksociety.com

7
چینی نکہ چینی
مدیر اعلیٰ

14
جلاد صفت
کاشف زبیر
حالات و واقعات سے بغاوت پر اکسانے والے ایک مرتکب کا دلچسپ کردار

61
ہیرو
آصف ملک
ان جان لیوا لمحات کی داستان جب سانپ کا زہر کسی تریاق بن جاتا ہے...

75
چشم دید
سکندر علیم
باریک بینی سے ماحول میں پیدا ہونے والے تغیر کا غیر معمولی ابہام

87
شکارگاہ
جمال دستی
ہم پیشہ... ہم خیال جوڑے کی ہمراہی میں زینہ بہ زینہ عبور کرتے جرم کے مراحل

91
بدمعاملہ
بشریٰ امجد
مفاد پرستوں کی سنگت... جو نفسیاتی گرہوں کو سلجھانے کا ہنر رکھتے تھے...

96
گرداب
اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی اور مقدر کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

135
ایک تھے دو شکار
سلیم انور
جانے اور انجانے شخص کی شخصیت کے دو پہلو روپ... جرم کی دنیا کا ڈرامائی ڈراپ سین

141
چل چل ساز
تنویر ریاض
دوران ملازمت ایک دوسرے کے درمیان ہاکی چیمپئن شپ کا دلچسپ اور سنسنی خیز مقابلہ

150
جواری
احمد اقبال
زندگی کی بساط پر انوکھے جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

195
پنچایت
محمد تنویر اختر
کھیل ہی کھیل میں زندگی کا پانسا پلٹ دینے والی بازی

198
فیل خانہ
امجد رئیس
سرائیکی وسیب کے تناظر میں ایک خیال انگیز کہانی...

203
حساب برابر
نبیلہ زبیر
بازیِ عشق میں دغا بازی کی ملاوٹ کا تلخ و کسیلا واقعہ

219
بالادست
بابر نعیم
زندگی کی بازی ہار کے اپنی بالادستی

223
خواب
نجمہ مودی
سرابوں اور خوابوں کے سلسلے پر محیط ایک تجسس ورق کہانی...

256
ارض و قرض
مریم گل خان
ایک اجنبی کی دوستی اور شناسا کی دشمنی کا سنسنی خیز فسانہ

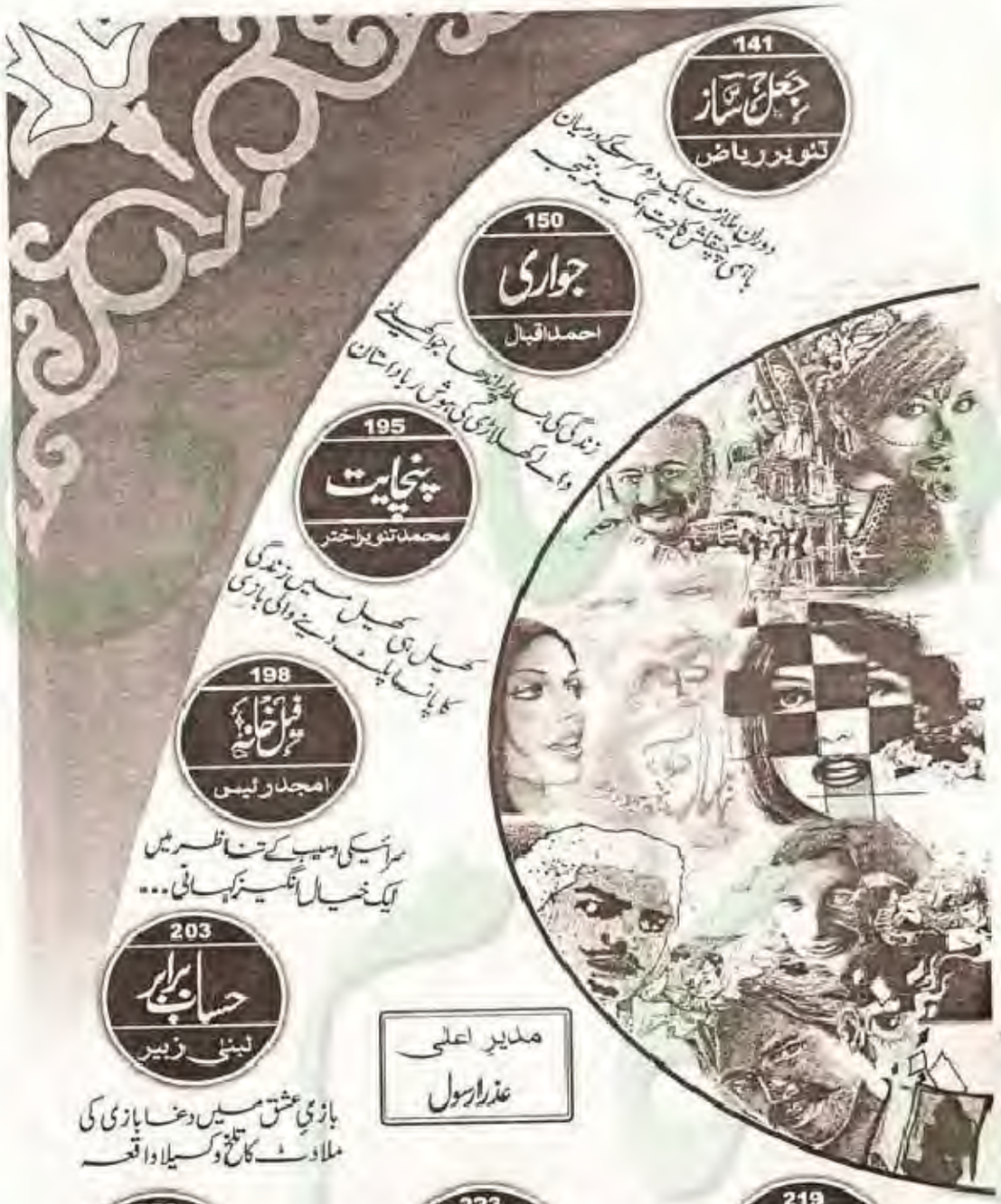

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 44 • شمارہ 01 • جنوری 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (21)

[ایکس فینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مدرکوٹ روڈ، کراچی 75500

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرے رنگ میں بہترین آغاز کے ساتھ عکس لہو رنگ کو شروع کیا اور آخر میں کہانی کے انجام میں بلا کی تشنگی ڈال دی۔ کوئی بھی بات اپنے انجام تک نہ پہنچی۔ جتنے موضوع اور رخ بن گئے تھے کہانی کے کم از کم ایک دو کو تو مکمل کر دیتے۔"

لاہور سے زویا اعجاز کی رائے" جاسوسی نے اس بار بھی اپنے انتظار میں ایسے ہی ترسایا جیسے پاکستانی کرکٹ ٹیم فتح کے لیے اور حکومت سی این جی کے لیے ترساتی ہے۔ اداریہ پڑھ کر یہی کہا جاسکتا ہے پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ عمران بلوچ کی وفات کا بہت رنج ہوا، پروردگار انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ بشیر احمد خان کی تجویز کی ہم مکمل تائید کرتے ہیں۔ کاظمی صاحب، ہم آپ کے شیکسپیئر کی پشتو سے کافی متاثر ہیں جس کا عنوان ہے بریویٹی از دی سول آف مائنڈ۔ افتخار برادر اور عروج ناز کا شکریہ۔ ہمایوں سعید نے بالآخر ہماری عظمت کے قائل ہو کر دانشمندی کا ثبوت دے ہی دیا۔ آغا فرید پچانوے فیصد تبصرہ نکتہ چینی پر اور تین سطریں کہانیوں پر لکھتے ہیں کمال کرتے ہو پانڈے جی۔ لگتا ہے کچھوے کی رفتار سے شمارے کا مطالعہ کرتے ہیں آپ۔ شہنشاہ جنات اوہ سوری میرا مطلب ہے شہزادہ کوہسار عقل کی بھی آپ نے خوب کہی۔ بھائی جس میں عقل ہوگی وہ نقل کرے گا ہی کیوں؟ اب رخ کرتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ شرر بار ایچ اقبال کی تصنیف ملکی لاقانونیت اور غنڈا راج کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کی کاوش اچھی تھی۔ نازیہ نے خود کو شاید ایکتا کپور کی سپر وومین ہیروئن سمجھ لیا تھا۔ گرداب بہت زبردست جا رہی ہے۔ سلو اپنی موجودہ شخصیت کے تخلیق کار بھٹنا گر کو لازمی عبرت ناک انجام سے دوچار کرے گا۔ اسلم بھی بہت نازک صورت حال میں پھنس چکا ہے۔ جواری رفتہ رفتہ اپنے جوبن پر آرہی ہے۔ انور فیکے پتر کا جانشین ثابت ہو رہا ہے۔ ریشم میں اس کی ڈھکی چھپی دلچسپی کافی معنی خیز محسوس ہو رہی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ بالکل پھیکا رہا۔ ایک بے حد عمدہ تھیم کو موزوں طریقے سے نہ لکھا جاسکا۔ تحریر نمکین گاجر کا حلوہ بن کے رہ گئی۔ دوسرا رنگ قدرے بہتر تھا۔ دادا صاحب کا اصل روپ سامنے آجاتا تو اختتام مزید نکھر جاتا۔ طبع زاد کہانیوں میں حساب کتاب ناپ پر رہی۔ سفید پوش طبقے کے مسائل بہت خوب صورتی سے بیان کیے گئے۔ فقیرانہ قتل ایوریج رہی۔ مترجم کہانیوں میں شوقیہ سراغ رساں، تعاقب، دوسرے، فریب قدرے بہتر لگیں، باقیوں نے بور کیا۔ اس دعا کے ساتھ اختتام کرتی ہوں کہ نیا سال وطن عزیز کے لیے امن و سلامتی اور اہل وطن کے لیے خوشیوں کا پیامبر بن کر آئے۔"

میانوالی سے احسان سحر کی تفصیلی باتیں" حسب معمول جاسوسی تھوڑا لیٹ لیا۔ ٹائٹل کا جو انداز دکھایا گیا وہ رنگوں میں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ محفل قوس قزح... میں بکھرے رنگوں کی طرف بڑھے جہاں ہر کوئی اپنا رنگ بکھیرتا نظر آیا۔ شکیل کاظمی جی! کیوں پچھلی عمر کا رونا رو رہے ہو۔ اس عمر میں اللہ اللہ کرو۔ کیوں کسی بوڑھی ہمسائی کو اس عمر میں بدنام کرنے پر تلے ہو، پوتے پوتیوں کو کھلاؤ بیٹھ کر ہاتھ میں تسبیح لے کر صرف۔ آغا جی! ویلکم۔ پچھلے ماہ جھولے والی بات پر دل سے معذرت چاہتا ہوں، مطلب وہ نہیں تھا بات کا، جو لیا گیا۔ خود مجھے بھی بہت اذیت ہوئی۔ قصور کسی کا نہیں۔ پہلی کہانی سے اس ماہ کے تازہ پھول کا آغاز کیا۔ شرر بار ایچ اقبال کافی ماہ کے انتظار کے بعد ہلکا پھلکا انداز لیے حاضر ہوئے۔ نہ الجھاؤ تھا کہانی میں، نہ کرداروں کی بھرمار، آسانی سے ہضم ہو جانے والی تحریر بہت ہی خستہ لگی۔ ڈھونگ میں میاں بیوی کا ایسا شاطر ڈھونگ کہ اینڈ پر بھی قاری کو چونکا گیا۔ پہلی بار ایسی اتفاقیہ صورت حال میاں بیوی کے درمیان دیکھی، بہت خوب۔ دوسرے، کافی پراسراریت پھیلنے کے چکر میں کہانی اپنا معیار کھو گئی۔ ہپناٹائز انسان ہوتا ہے لیکن مرنے کے بعد اس طرح کی سچویشن پیدا نہیں ہوتی۔ حقیقت کے بجائے صرف سراب ہی سراب نظر آیا۔ گرداب میں اس ماہ جاوید علی چھائے رہے۔ للکار کی طرح کافی کاری زخم پہنچایا بھارتیوں کو۔ تنبیہ میں بھی وہی عورت کا جنونی انتقام پڑھنے کو ملا جو کہ شادی شدہ حضرات کے لیے سبق بھی ہے، آگے ان کی مرضی۔ شوقیہ سراغ رساں، یہی سبق کافی ہے کہ جو انسان کا پیشہ ہے اسی پر خوش رہے تو اچھا ہے ورنہ ایسے شوق بہت ہی بھاری پڑتے ہیں۔ رنگوں میں سب سے پہلے احمد اقبال کے رنگ کا مطالعہ کیا۔ اسٹوری شروع میں تو متاثر نہ کر سکی لیکن پھر بیچ میں باپ کی پراسرار گمشدگی اور دادا کی پراسرار سرگرمیوں کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی لیکن پھر ساری دلچسپی دھری کی دھری رہ گئی جب ان سب کرداروں پر پڑا پردہ بھی نہ چھٹ سکا۔ افسوس ہے کہ پانی پی کر بھی پیاسے ہی رہے۔ پہلا رنگ، جذبہ حب الوطنی کا احساس جگاتی خوب صورت تحریر تھی۔ پاکستان میں جب تمام اداروں کے ساتھ مساوی سلوک ہی نہ ہوگا تو ایسے واقعات ہی ہوں گے اور پولیس والوں کو ہمیشہ ہی تنقید کا نشانہ بنانے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایسی مہولتیں انہیں نصیب ہیں۔"

وزیر آباد سے محمد احسن زمان کی داستان" نگاہ روبرو، باادب، باملاحظہ، ہوشیار، مابدولت، بغیر دولت کے تشریف لا رہے ہیں۔ ارے، ارے... اتنا حیران پریشان کیوں تک رہے ہیں۔ جناب کم و بیش ڈیڑھ دہائی کی غیر حاضری کے بعد محفل باؤ ہو میں غوطہ زن ہیں۔ پچھلے مہینے ایک سفر درپیش تھا۔ حسب عادت نظر انتخاب جاسوسی پر جا اٹکی اور میں پھر سے جاسوسی کا اسیر ہو گیا۔ پچھلے ماہ بھی قلم اٹھایا لیکن حالات کی تلخی سے قلم کی کڑواہٹ بڑھ گئی۔ اب پھر ہمت کی ہے دیکھیے کیسا استقبال ہوتا ہے۔ (یقیناً اچھا بہت اچھا) سرورق پر خوب صورت چہرے کی رعنائی خون آلود ہاتھ کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ پس منظر میں شمع ہاتھ میں لیے خاتون نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی ہیں اور عینک والے صاحب بھی حیرت زدہ انداز میں اپنی عینک درست کر رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اپنی محفل کا رخ کیا تو یہاں سارے نام ہی اجنبی نظر آئے۔ ایچ اقبال کا نام پڑھ کر کہانی شروع کی، بڑی عجیب لگی۔ مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ انجام یہ ہو گا۔ لیکن شاید ہمارا وتیرہ بنتا جا رہا ہے کہ خود جینے کے لیے دوسرے کو مارنا ضروری ہے۔ کم از کم ملک کے سب سے بڑے شہر کے حالات کو دیکھیں تو یہ سب درست لگ رہا ہے۔ تنویر ریاض کی شاطر اچھی لگی واقعی مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر بیٹھتا ہے۔ نیٹ کا کردار کافی پراسرار رہا۔ تعاقب میں لیمن مجھے شروع شروع میں فراڈ لگا لیکن دھوکے باز تو ڈیل نکلا۔ ویسے مجھے امید نہ تھی کہ لیمن کامیاب ہو جائے گا۔ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا لیکن کہاں جی، لیمن نے بالآخر دماغی کھیل میں جیت حاصل کر لی اور کڑیاں ملا کر ڈیل کی گردن ناپ لی۔ بابر نعیم کی ڈھونگ بہت شاندار رہی، مختصر مگر پُراثر۔ مریم کے خان کی دوسرے، اف اللہ کی پناہ مجھے علم ہوتا کہ یہ کہانی اتنی خوفناک، ہولناک، ہیبت ناک اور پراسرار [illegible]

ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے چنانچہ فوراً ڈائجسٹ بند کیا اور تکیے کے نیچے چھپا دیا لیکن کہاں جی... نیند نے دور سے ہی جھنڈی دکھائی۔ اللہ کی مار اس ہپناٹزم کے ماہر پر، اچھے بھلے مردے کو کھڑا کر دیا اور ہماری ریڑھ کی ہڈی میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی ہے۔ (بڑے ڈرپوک ہیں)۔ اب گرداب کی بات ہو جائے۔ میں صرف سلو اور شہریار والا حصہ ہی پڑھتا ہوں۔ بقیہ اسلم والے کھیل کی ابھی مجھے سمجھ نہیں آرہی۔ سلو اور شہریار والے واقعات ہی دل گرما دینے والے ہیں۔ مسلمانوں میں یہی خوبی ہے کہ وطن پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور مذہب آگے آجاتا ہے۔ جیسا کہ بھائی جی کر رہے ہیں، دونوں خوب کھل کر کھیل رہے ہیں اور باطل کے سینوں پر مونگ دل رہے ہیں۔ عکس فاطمہ کی فریب نے بھی تھرا دیا۔ اچھے بھلے پڑھتے پڑھتے پھر خونخواری آن ٹپکی۔ ڈریکولا کی جوڑی نے بے چارے ڈیرک کے کس بل نکال دیے۔ ہم جیسے کمزور دل والے تو ان کہانیوں کو نہیں پڑھ سکتے جی۔ اجی لکھ دیا کریں کہ کمزور دل والے حضرات نہ پڑھیں جیسے ڈراؤنی فلموں کے لیے لکھا ہوتا تھا۔ (تجویز کا شکریہ! آئندہ یہی کریں گے) میمونہ عزیز، شوقیہ سراغ رساں کے ہمراہ تھیں۔ پال بے چارہ عورت کی عیاری کا شکار ہو گیا۔ جواری جسے احمد اقبال لکھ رہے ہیں' پورے شمارے میں میری پسندیدہ کہانی ہے۔ اکبر اور انور کی آویزش کا نتیجہ نہ جانے کیا نکلے ان کی نوک جھونک کا بے حد مزہ آرہا ہے۔ جمال دستی صاحب چکر باز لے کر آئے ہوئے تھے۔ ویسے جمال دستی جمشید دستی صاحب کے کیا لگتے ہیں؟ (آپ کو کیا پریشانی ہے؟) حساب کتاب بہت شاندار رہی۔ فقیرانہ قتل میں استاد کی جناتی زبان پڑھ کر خوب لطف اندوز ہوا۔ مزاحیہ انداز خوب رہا۔ زرخیز زمین شمارے کا پہلا رنگ تھا۔ دانش کا کردار تو ہمارے معاشرے کی شان ہے لیکن انہیں پنپنے ہی کون دیتا ہے۔ غیر ملکیوں کا کھیل اس ملک میں اب بہت ہو چکا دیکھیے کب بساط بدلتی ہے بلکہ پلٹتی ہے کیونکہ کافر بھی تدبیر کر رہا ہے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا ہے اور اللہ ہی خوب تدبیر کرنے والا ہے۔ آپ کا کہنا بجا ہے کہ ریاست کے پانچوں ستون دوبارہ شہید ملت والے زبردست مکے کی شکل اختیار کر گئے تو پھر دشمن پانی بھرتا نظر آئے گا۔ عکس لہو رنگ، احمد اقبال کی کہانی تھی۔ اس کہانی کا انجام بڑا عجیب اور عمومی سا تھا۔ دادا صاحب کا کردار بہت پراسرار رہا۔ مجھے ان کی اس طرح خودکشی کی توقع نہ تھی اور یہ بھی کہ شاید کوئی خونخوار قسم کی جنگ ہوگی جس میں کہ یوسف صاحب کوئی ہیرو جیسا کردار ادا کریں گے اور وہیں پر مریم سے ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن معاملہ بالکل الٹ رہا۔ تبصرہ تمام ہوا۔ اتنا عرصے بعد پڑھنے کے بعد کچھ پرانی باتیں تازہ ہو گئیں۔"

ڈاکٹر عمران فاروق جھنگ سے لکھتے ہیں" دسمبر کا جاسوسی 6 تاریخ کی ٹھٹھرتی ہوئی صبح گڈ مارننگ کا سیلیوٹ پلس گرم گرم چائے کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ دونوں ہاتھوں سے ویلکم کیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی، بہت خوب ڈاکٹر انکل۔ ہمایوں سعید بڑے فریم والی نظر کی عینک لگا کر منگنی کے بعد بھابی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں تو بڑی آپا ماہا جی ہاتھوں میں مشعل اٹھائے جگنو بنی ہوئی ہیں، واؤ۔ نیچے صنف نازک رو رو کر اپنے آپ کو اور بھی زیادہ معصوم ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مجموعی طور پر ٹائٹل میری گرم گرم چائے کی طرح بہت اچھا لگا۔ چائے ختم کر کے جلدی سے محفل باؤنسر + گٹکی + دوسرا کی جانب بڑھے۔ تمام دوستوں کے محبت نامے دیکھے۔ بھائی احسان سحر کی شکایتیں اور کرسی صدارت بھی مان گئے۔ انکل جی آپ کو مبارک باد قبول ہو۔ کہانیوں کے متعلق آپ کی جو رائے ہے، میں بھی سو فیصد متفق ہوں۔ مس ایف ایم صاحبہ! آپ اتنا سوچوں میں گم رہی ہو کہ اپنا نام بہت ہی شارٹ کٹ کر دیا ہے۔ تبصرہ لکھتی رہنا یہ نہ ہو کہ سوچوں میں پوری سردیوں کا موسم بھی ہاتھ سے نکل جائے ہاہاہا... تمام نئے دوستوں کو موسٹ ویلکم ان جاسوسی۔ بھائی کاظمی صاحب! آپ ہمایوں سعید کے بارے میں اپنے کہے الفاظ واپس لو، یہ نہ ہو کہ آپریشن کے بعد پتا چلے کہ ہمایوں سعید ہما بن گئی ہے اور کاظمی نے اپنی پڑوسن سے بات کرنا چھوڑ دی ہے۔ بھائی فہد علی جنجوعہ آپ نے مجھے دوبارہ چائے + پکوڑے کی طلب محسوس کروا دی۔ بیگم ایک کپ چائے پلیز۔ بڑی آپا ماہا ایمان اور چھوٹی آپا طاہرہ نگزار صاحبہ آپ دونوں کہاں گم ہو۔ جمعے کی نماز کے بعد میں نے خصوصی طور پر بھائی قیصر اعوان، حافظ شاہد عمران، رانا سنتی حماد فرہاد اور دوسرے تمام بھائی جو جیلوں میں قید ہیں تمام کے لیے دعا مانگی ہے۔ اللہ پاک آپ سب کو رہائی عطا فرمائے، آمین۔ بھائی عمران بلوچ مرحوم کو اللہ تبارک و تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے، درجات بلند کرے، آمین۔"

بھکر سے ثمر خان کی عقل مندی" اس بار جاسوسی نے اپنے بے مثال روپ کا نظارہ 5 تاریخ کو کروایا۔ ٹائٹل پر لاش! کچھ اچھا نہ لگا کہ اخبارات کے بعد اب یہاں بھی یہ دیکھنا پڑا۔ سب سے پہلے پہنچے گرداب کی طرف۔ یہاں ہم نے کافی تیزی دیکھی۔ قسط ختم ہونے کا احساس تب ہوا جب اگلی کہانی کا نام پڑھا۔ سلو کا ہر وقت چوکنا رہنا کام آہی گیا۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آنے والے ناکام ہی رہے۔ شہریار نے ذرا بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا۔ رانے آخر اپنے شہزور کو ڈھونڈ نکالا۔ ادھر ماہ بانو کا بھی کچھ نہ بن سکا۔ مشابرم خان ان ایکشن اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ دوسرا سلسلہ جواری۔ چودھری انور کے گرد یہ کہانی گھومتی رہی۔ اب اس کا باب بند ہی کر دیں۔ نادر شاہ اور فرید کے ٹکراؤ کا انتظار ہے۔ ڈھونگ، واہ کیا کہانی تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ فریب میں فریبی خود فریب میں آگیا اور جان سے گیا۔ مریم کے خان کی ہر کہانی بہت ہی خوب صورت ہوتی ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ امریکی اور چینی ٹکراؤ کی ایک اور کہانی لکھیں۔ اس سے پہلے کہ آپ ہمارے شیطان کی آنت جتنے خط کو بلیک لسٹ کر دیں، خدا حافظ۔"

مانسہرہ سے ڈاکٹر نعیم اکبر سحر کی چہچہاہٹیں" چار دسمبر کو جاسوسی ہاتھ آیا۔ ہماری محفل شوگر پوائنٹ شوگر کے فاتح پہلوان احسان سحر اپنے الفاظ کی جادوگری کی بدولت چھائے ہوئے تھے۔ احسان بھائی! مبارک باد قبول فرمائیے۔ ہمایوں سعید، ہمیں دیر سے پتا چلا کہ آپ بھی وہ کڑوی گولی نگل بیٹھے ہیں جو شوگر کونڈ تھی۔ سو ہماری جانب سے تعزیت قبول فرمالیں۔ لفظ تعزیت کو شوگر کوٹ کر کے مبارک باد پڑھ لیں۔ محسن علی موم اس دفعہ خوب بولے۔ سب سے پنگے لیے ہیں۔ شاباش میرے شیر۔ ایسے ہی دہاڑتا رہ۔ ہماری دعائیں اور دوائیں تیرے ساتھ ہیں۔ احمد اقبال صاحب کی شرر بار اچھی کاوش رہی۔ نازیہ نامی خاتون کو یہ جان لینا چاہیے تھا کہ وہ اس مردوں کے معاشرے کی کمزور کردار ہے جسے عورت کہا جاتا ہے۔ بے شک ناگن بن جائے۔ انجام میں پھن کچلا ہی جاتا ہے۔ دوست گئے، رقم گئی، پلاٹ گیا، عزت نیلام ہوئی۔ انجام خودکشی اور موت یعنی کھایا پیا کچھ نہیں۔ گلاس توڑا جرمانہ بارہ آنے۔ گرداب نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمارے اندر کی اس کمی کو کسی حد تک پورا اور مکمل کر دیا ہے جو موت کے سوداگر کے اختتام سے ہمارے اندر پیدا ہوئی تھی۔ ویلڈن اسما قادری۔ جواری میں تو فی الحال خوب صورت خوب صورت خواتین کی آمد ہو رہی ہے۔ ان خواتین کا رول بھی فی الحال یہی ہے کہ وہ فرداً فرداً ہیرو صاحب پر نثار ہوتی رہیں تاوقتیکہ کہانی کوئی رخ اختیار کر سکے۔ ابھی تک تو جواری وہ کشتی ہے جسے سمندر کی سرکش لہریں اپنے ساتھ بہائے جا رہی ہیں۔ کشتی کب سمندر کے سینے کو چیرنا شروع کرتی ہے۔ یہ کہانی کا آغاز ہے ابھی تک تو...! کاشف زبیر کی حساب کتاب پڑھی۔ ابھی تک اس کے زیر اثر ہوں۔ عکس لہو رنگ آخری رنگ نہ جانے کس جذبے کے تحت لکھا گیا۔ حالانکہ کہانی کا پلاٹ جاندار تھا اور قلم معروف، ہر دلعزیز احمد اقبال صاحب کا۔ پھر بھی کہانی میں تشنگی۔ بہت ساری باتیں قابلِ وضاحت تھیں۔ احمد اقبال صاحب نے خود ہی لکھ دیا کہ "شاید کچھ پڑھنے والوں کو اس کہانی کے انجام سے مایوسی ہو" تو محترم احمد اقبال صاحب تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ عرض ہے کہ "شاید نہیں یقیناً۔"

سحرش افضل کی ریٹنگ سے پسند ناپسند "اس دفعہ جاسوسی کا دیدار 4 دسمبر کو ہوا۔ ٹائٹل پہ ٹائٹل گرل عجب بہار دکھا رہی تھی۔ فہرست کا اسٹائل خوب تھا۔ محفل میں گرمی بہت تھی جو سردی کی وجہ سے اچھی لگی۔ اس بار جاسوسی پڑھنے کا آغاز خلافِ معمول پہلی کہانی سے کیا۔ گزارہ تھا، بہرحال کہانی نے بور نہیں کیا۔ گرداب تو فل ایکشن میں تھی۔ احمد اقبال کی جواری بھی ٹھیک تھی۔ جواری کی تو ہر نئی قسط میں سے ایک نئی کہانی نکل آتی ہے۔ نورین کی کہانی، ریشم کی، چودھری انور کی۔ سلونی کی اور پتا نہیں کتنے لوگوں کی کہانیاں۔ البتہ رنگ دونوں اسٹرانگ تھے۔ میں باقی چھوٹی کہانیاں نہیں پڑھتی کیونکہ ان کہانیوں میں انگریزوں والے نام ہوتے ہیں جن سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ ہاں اگر مسلمانوں والے نام ہوں اور کہانی اچھی لگ رہی ہو تو پڑھ لیتی ہوں۔ اس لیے ان پر نو کمنٹس۔"

خانیوال سے سردار ظفر اقبال وڑائچ کی رائے "دسمبر کا سرورق ٹاپ آف دی ایئر رہا۔ احسان سحر اس مرتبہ چھا گئے، مبارک باد جی۔ اس مرتبہ تمام تبصرہ نگاروں کا تبصرہ کچھ یوں لگا جیسے وہ کوئی کہانی تخلیق کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ تبصرہ نگار ساتھی عنقریب رائٹر بن ہی جائیں۔ مجھے یہ کہنے میں عار محسوس نہیں ہوتا کہ اس مرتبہ تمام تبصرہ کرنے والوں کے تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ شرر بار انتقامی اسٹوری لگی۔ خصوصاً لڑکیوں کو لڑائی اکیلے نہیں لڑنی چاہیے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عکس لہو رنگ بھی یو رنگ رہی۔ زرخیز مٹی زبردست رہی۔ پہلی مرتبہ پولیس کو ایکشن میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرح کی سچویشن شمالی وزیرستان میں ہمارے ساتھ ایک دن میں کئی مرتبہ ہوتی رہتی ہے۔ جواری نے کوئی خاص مزہ نہیں دیا۔ سو بور رنگ رہی۔ گرداب اس مرتبہ انتہائی سنسنی خیز رہی۔ ہمیں اسلم کا انجام دردناک نظر آ رہا ہے اور اب لگتا ہے کہانی کا رخ شہریار کی طرف سڑنے والا ہے۔ جاتے جاتے تمام دوستوں کو پُرخلوص نیا سال مبارک ہو۔"

لاہور سے آفتاب احمد نصیر اشرفی کے قلم کی چاشنی "ایران اور امریکا کے بارے میں آپ کی خوش کمانی اتنی جلد حقیقت میں بدل جائے گی، ہمیں تو بہت حیرت ہوئی کہ آپ امن کے عالمی چودھریوں کے کتنے نبض شناس ہیں۔ اس ماہ جاسوسی کا سرورق واجبی جبکہ اس کے اشتہارات دلکش اور تراش خراش خوب صورت تھی۔ خاص کر محسن مصطفیٰ کی تحقیق پاکستان کے سول اور فوجی اعزاز۔ اس مرتبہ ابتدائی صفحات پر شرر بار اپنی مثال آپ تھی۔ ایک عورت جو صنفِ نازک کہلاتی ہے اور جو اپنی عصمت و عفت اور پاکیزگی کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے کو کوئی ٹھیس پہنچائے تو پھر وہ انتقام کا آتش فشاں بن جاتی ہے جیسا کہ نازیہ نے ایاز نائک کے ساتھ کیا۔ سطر سطر پُرتجسس تحریر نے مصنف کے... لفظوں کو خوب صورت روپ دیا۔ روپ تو شاہد حسین صاحب نے نازیہ کے اسکیچ کو بہت خوب صورت دیا اتنا کہ آدمی دیکھ کر مبہوت ہو جائے۔ احمد اقبال صاحب کی جواری خوب جا رہی ہے اور عکس لہو رنگ ہر چند کہ دوسرا رنگ تھا لیکن خونی رشتوں کا بھرم رکھتی ہوئی یہ داستان اگر پہلے رنگ پر بھی ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ کیونکہ پہلا رنگ زرخیز زمین شیخ ابو یحییٰ کی گو کہ بہت اچھی تحریر تھی لیکن فکشن کی زیادتی نے اسے تھوڑا سا گہنا دیا تھا۔ خط کی طوالت پیشِ نظر ہے اور بلیک لسٹ ہو جانے کا خطرہ لہٰذا اس سے پہلے کہ کسی شاطر ساتھی کا خط ہمارے خط کا تعاقب کرے اور ہمارا خط گرداب کے فریب میں کسی دوسرے کی تنبیہہ کے ڈھونگ میں آئے اور کوئی شوقیہ سراغ رساں ساتھی حساب کتاب مانگ لے اور کوئی چکر باز ہمارا فقیرانہ قتل کر دے، ہم آپ سے نئے سال کی مبارک باد کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔"

شیخوپورہ سے محمد شاہان سعید کی شوخی "جاسوسی 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق دلکش تھا۔ خطوط کی محفل میں اپنے خط کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ میرا نام غلط لکھا تھا۔ آپ نے شایان لکھا تھا مگر میرا نام شاہان ہے۔ کہانیاں کافی دلچسپ تھیں۔ گرداب کافی اچھا جا رہی ہے۔ سرورق کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ میں آپ کو مزے کی بات بتاتا ہوں۔ میں نے بک اسٹال سے جاسوسی کے پرانے شمارے طلب کیے تو اس نے میرے سامنے نومبر 1990ء کا شمارہ بھی رکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ جاسوسی اتنا پرانا ہے؟ کہانیاں تو پرانے زمانے ہی کی تھیں مگر ناول "پاکستانی" دل کو چھو گیا۔ خیر ویسے جاسوسی کتنے سال پرانا ہے؟" (جاسوسی کا پہلا شمارہ 1971ء میں آیا تھا)

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی شمولیت "جاسوسی لیٹ ملا۔ دہشت زدہ صنفِ نازک کی آنکھیں خوف سے پتھرا گئی ہیں۔ دو دو صنفِ مخالف ٹائٹل پر، واہ جی واہ۔ اپنی محفل چینی دان میں پہنچے۔ یہ کیا مابدولت کا تبصرہ نہ ہی ویٹنگ لسٹ میں اور نہ ہی محفل میں... کیا آپ کو ملا ہی نہیں؟ (جی بالکل درست فرمایا، ہمیں ملا ہی نہیں) کرسیِ صدارت پر احسان سحر کو موجود پایا، آپ کا تبصرہ اچھا تھا مبارکاں۔ انکل! اگر میرا تبصرہ نہیں لگا تو تمام ساتھیوں نے ہمیں یاد رکھا، سب کا شکریہ۔ فرید احمد! میں آپ کی رائے سے متفق ہوں پہلے نام بدل لیں اندازِ تحریر سے پتا لگ ہی جاتا ہے۔ محسن علی موم! آپ کو اعتراض کیوں ہے؟ صفدر معاویہ! تعریف کا شکریہ۔ عروج ناز! آپ کا بھی تہ دل سے شکریہ۔ حساب کتاب ایک نصیحت آموز کہانی تھی۔ عطا کے ضمیر نے بھی اس کو کچوکے لگائے مگر مجبوری سب کچھ کروا دیتی ہے۔ ڈھونگ اچھی جامع تحریر تھی۔ دونوں کے ساتھ یہ تو ہونا تھا نا۔ دوسرے خوف میں لپٹی داستان، ہپناٹزم ایک خطرناک عمل

ہے اگر آزاد نہ کیا جائے تو۔ رقم کے لیے اتنے پاپڑ بیلے، موت ہی ہاتھ آئی اس عمل سے۔"

کھاریاں سے بابر عباس اور مسز بابر عباس کی ملی جلی باتیں "جاسوسی کا نیا شمارہ جو کہ ماہ دسمبر کی شکل میں 2013ء کا آخری شمارہ ہے، کسی خوب صورت ہیرے کی طرح جگمگا رہا ہے۔ ہاتھوں میں سرورق حسبِ معمول جاسوسی کی مناسبت سے زبردست ہے مگر سرورق پر لیٹی خرانٹ قسم کی بوڑھی عورت کچھ پسند نہیں آئی۔ صنفِ نازک کے معاملے میں ذاکر صاحب کا ذوق کچھ گرتا جا رہا ہے۔ ذاکر صاحب کچھ خیال کریں۔ سر جی! آپ نے جتنی بھی باتیں کی ہیں یقیناً میں آپ کی ان تمام باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں اور ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں مگر افسوس سر، ہم بے حس قوم ہیں۔ ہم اپنے اندر تبدیلی نہیں چاہتے۔ اس بار کرسیِ صدارت پر ایک ماہ کے لیے میانوالی سے اپنے جانے مانے احسان سحر صاحب براجمان تھے۔ احسان سحر صاحب! گو کہ خط کچھ خاص نہیں تھا پھر بھی مبارک باد قبول کریں۔ ایف ایم 100 صاحبہ! آپ کون سے ریڈیو اسٹیشن پر آتی ہیں اور چونکہ یہ آپ کی پہلی شرکت ہے اس لیے ذرا آرام سے دھیرے دھیرے سے۔ زویا جی! ساتویں شرکت مبارک ہو، اب کہیں اس خوشی میں پاگل نہ ہو جائیں۔ ملک سعید صاحب، یہی جمہوریت ہے۔ اگر آپ کسی کی بات سے متفق نہیں تو کھل کر اظہار کر دیں۔ میں بھی آپ کی بات سے متفق نہیں ہوں۔ بشیر احمد خان! ابھی بچے ہو کچھ بڑے ہو جاؤ۔ ارے شکیل کاظمی! نامعلوم زوجہ وہ جو آپ نے مجھے تصویر بھیجی تھی وہ کس کی تھی؟ واہ جی واہ، اس بار ہمارے پیارے سے آغا فرید احمد خان بھی تشریف لائے ہیں۔ بھایا، میں آپ کو ایک بار پھر محفل میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ راجہ اسلم حیات! یہ کیا آپ نے بشریٰ آنٹی کو آپا کہہ دیا؟ اس کا مطلب ہے کہ آپ بشریٰ افضل آنٹی کے ہم عمر ہیں۔ افتخار حسین اعوان! آپ کو عروج کی عمر پر اعتراض ہے یا سالگرہ پر۔ فہد علی! غلط بیانی مت کریں۔ سرورق کی حسینہ کی شکل کسی فلمی ایکٹریس سے نہیں ملتی تھی بلکہ زویا خان سے ملتی تھی۔ ہمایوں سعید راج بیٹا میرا خیال ہے مذاق کو مذاق ہی رہنا چاہیے۔ جو باتیں گزر چکی ہیں ان پر مٹی ڈالو۔ محسن علی موم! اتنی بھی پھرتیاں ٹھیک نہیں، کہیں کمر میں چک نہ پڑ جائے۔ کاش آپ کا نام موم بتی ہوتا، لوڈشیڈنگ میں تو کام آتے۔ محمد شاہان سعید! اتنی بھی شوخیاں صحیح نہیں، صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اے پہاڑوں کے شہزادے، میرا مطلب ہے کبیر عباس بھیا! اور سنائیں کیا حال ہیں؟ پہاڑ تو ٹھیک ہیں نا جن پر آپ اچھل کود کرتے ہیں۔ محمد جاوید بشیر! عرصہ تو آپ نے لکھا ہی نہیں کتنے عرصے کے بعد تشریف لائے ہیں؟ عروج ناز! تبصرہ کریں بونگیاں نہ ماریں۔ حافظ شاہد عمران! بیٹا یقین کرو تمہارے لیے اور دیگر ان تمام قیدیوں کے لیے جو جیل جیسی منحوس جگہوں میں بند ہیں، رہائی کے لیے دل سے پُرخلوص دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا تم سب کو ان عقوبت خانوں سے رہائی دلائے، آمین۔ کہانیوں پر حسبِ معمول سب سے پہلے اسما قادری صاحبہ کی تخلیق گرداب پڑھی۔ اسما قادری کی گرداب پڑھتے ہوئے صبیحہ بانو کی چھلاوہ یاد آ جاتی ہے۔ بہرکیف گرداب ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ دوسرے نمبر پر جواری پڑھی جس کو عہدِ حاضر کے ایک نامور رائٹر احمد اقبال صاحب لکھ رہے ہیں۔ کہانی ابھی تک صحیح طرح کھلی نہیں اور یہ تب ہی ہوگا جب احمد اقبال صاحب فرید کی کہانی کو فلیش بیک کریں گے۔ پہلا رنگ شیخ ابو یحییٰ کا زرخیز زمین پولیس کی کارکردگی کے عین مطابق تھا۔ زبردست شیخ صاحب۔ یقین کریں آپ کے سرورق کے رنگ نے صحیح معنوں میں حق ادا کر دیا۔ دوسرا رنگ احمد اقبال صاحب کا جس میں سرورق کے رنگ کا کوئی ذکر تک نہیں تھا، صرف اپنے ہلکے پھلکے مزاح کی وجہ سے تھوڑا سا اچھا لگا۔ مجموعی طور پر کوئی خاص نہیں تھا۔"

ضلع خانیوال سے صفدر معاویہ، حسنین معاویہ کی مشترکہ کاوش "دسمبر کا شمارہ 6 کو مل گیا۔ سرورق پر ایسا لگتا ہے کہ ماڈل کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ آنکھوں میں دکھ صاف نظر آ رہے ہیں۔ ساتھ ہی کبیر عباسی صاحب عینک لگائے موجود ہیں۔ پھر آگے بڑھے، آپ کا اداریہ پڑھا۔ اچھا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی تمام باتوں کو شرفِ قبولیت بخشے اور ہم پیارے وطن پاکستان میں امن سے زندگی کی بہاریں گزار سکیں۔ اپنی محفل میں پہنچے تو وہاں شور مچا ہوا تھا۔ کرسیِ صدارت پر محترم احسان سحر صاحب الٹی سیدھی باتیں کرتے نظر آئے۔ میانوالی والوں مبارکاں۔ پتوکی سے ایف ایم 93 نے بہت اچھی باتیں کیں۔ واقعی ہیرو کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ میں تقریباً 2 دن تک ہیرو کے غم میں ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ آغا فرید احمد خان نے کہا کہ نیازی صاحب کے تبصرے ہمیشہ ہی الگ ہوتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ دوستو! میں دو یا تین ماہ بعد آغا فرید کو بتاؤں گا کہ شادی کے بعد بندہ کیسا محسوس کرتا ہے۔ ہمایوں نے منگنی کی اور ہم نے 11 جنوری 2014ء کو شادی کا فیصلہ کر لیا، اپنی خالہ کی بیٹی کے ساتھ پھر بتائیں گے کیا بنتا ہے۔ (کس کا؟) ہمایوں بھی اس دفعہ کھلے کھلے نظر آ رہے ہیں۔ عروج ناز صاحبہ! آپ کو پارٹ ون کی کامیابی پر مبارک باد اور بہناں، آپ اپنی عمر نہ بتایا کریں کیونکہ یہ محفل کی عوام سچ کو بھی جھوٹ سمجھتے ہیں، آگے تم خود سمجھ دار ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ یہ قسط اچھی رہی لیکن ماہ بانو اور اسلم ایک بار پھر سے پھنس گئے اور سلو بھی کہیں غائب ہو گیا اور شہریار بھی پھنس گیا۔ اب اگلی قسط کا انتظار ہے۔ شرر بار میں نازیہ نے بدلہ تو لے لیا مگر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ زیادہ تر کہانیاں اس دفعہ ترجمہ شدہ ہیں۔ آپ مہربانی کر کے زیادہ اپنے معاشرتی نظام کی کہانیاں سامنے لائیں مہربانی ہوگی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ڈیرا اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی فرمائش "ہمیشہ کی طرح جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ سال کے آخری مہینے کا جاسوسی موسم کی طرح اداس لگا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ شاید ٹائٹل گرل بھی سال کے آخری ماہ کو اداس بھری نظروں سے الوداع کہہ رہی تھی۔ کرسیِ صدارت اس مرتبہ احسان سحر کے حصے میں آئی، بہت مبارک ہو۔ فرید احمد خان! شادی کر کے دیکھ لو کہ بندہ جھولے جھولتا ہے کہ جھولے جھلاتا ہے ہاہاہا... فہد علی میں کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے وابستہ نہیں ہوں۔ ہمایوں سعید صاحب! چلو اچھی بات ہے کہ آپ صنفِ نازک کے مخالف نہیں۔ قیصر اعوان صاحب! مجھے شکیل صاحب کی پڑوسن اس لیے یاد آ گئی کہ شاید وہ انہیں بھول رہے ہیں۔ ابرار وارث! آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ ماہا ایمان اینڈ تفسیر عباس! آئی مس یو۔ ماہ فروری میں میری سالگرہ ہے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح پہلے گرداب پڑھی۔ اسما جی، ماہ بانو کی زندگی کی مشکلات دور کریں۔ شہریار پھر پھنس چکا ہے۔ جواری معذرت کے ساتھ اچھی نہیں لگ رہی۔ رنگ بھی کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ البتہ ابتدائی کہانی شرر بار اچھی تھی، نازیہ کو غصے پر کنٹرول کرنا چاہیے تھا۔ سلیم انور کی تنبیہہ بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

سبق آموز تھی۔ بعض اوقات انسان جس کے بارے میں نہیں سوچتا، وہی دھوکا دیتے ہیں۔ کاشف زبیر کی کہانی حساب کتاب بھی اچھی تھی۔ کاشف بھائی! شامی اینڈ تیمور کو لے آئیں، باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

فوجی بستی بہاولپور سے بشیر احمد بھٹی کی تیز رفتاری "سال کا آخری شمارہ اس دفعہ زبردست چمک دمک لیے ہوئے ہے۔ ذاکر صاحب کا فن اب ہر ماہ فن پاروں کا شاہکار نمونہ بنتا جا رہا ہے۔ ان کی مصوری میں خوب نکھار آ رہا ہے۔ سب سے پہلے آخری کہانی احمد اقبال کی عکس لہو رنگ پڑھی۔ ان کی ہر کہانی میں مزاح کا رنگ ہوتا ہے۔ ہر فقرے میں ظرافت نمایاں ہوتی ہے۔ ایمی اور میری کی نوک جھونک نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ پھر پہلی سرورق کی کہانی زرخیز زمین شیخ ابو یحییٰ صاحب کی زبردست کہانی ہے۔ منظر امام کی فقیرانہ قتل مختصر دل ربا تحریر تھی۔ کاشف زبیر نے حساب کتاب کو بڑے انوکھے انجام سے دوچار کر کے مغربی ادب کی طرح حیران کر دیا۔ ایک نیکی سے پانچ لاکھ کی بچت ہوئی۔ مغربی کہانی چکر باز تین صفحے کی مختصر کہانی اچھی رہی۔ جواری کی چھٹی قسط ہنگامہ خیز رہی۔ احمد اقبال تیزی سے اسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ شوقیہ سراغ رساں ایک چلتر عورت کی چترائی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مغربی ادب کی یہ کہانی بھی اچھی رہی۔ شاطر مغربی ادب کی ایک بہترین کہانی ہے۔ ایک گمشدہ بہن یا محبوبہ کی خاطر دیت نام جیسے خطرناک علاقے میں ایک شاطر کھلاڑی کی مدد سے محبوب یا بھائی کی جان بچی۔ گرداب کا مطالعہ جاری ہے۔ کچھ مغربی ادب کی کہانیاں اور پہلی کہانی رہتی ہے۔ تبصرہ جلدی میں لکھا ہے تاکہ خط وقت پر پہنچے، کیونکہ اس دفعہ میں نے جاسوسی سات دسمبر کو خریدا ہے۔"

کورنگی کراچی سے شمس الحق کی مجبوری "سردیوں کی ٹھٹھرتی شام میں خلافِ توقع 3 تاریخ کو جاسوسی کا گرما گرم شمارہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ کچھ مجبوریوں اور کچھ مصروفیت کی بنا پر پچھلے مہینوں میں محفلِ دوستاں میں شرکت سے قاصر رہے مگر یہ کیا بے انصافی ہے کہ کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ زندہ ہو بھی یا... بہرحال ہم نے اپنی مجبوری اور مصروفیت کو پسِ پشت ڈالا۔ ٹائٹل گرل خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ دو تین بچوں کی ماں لگ رہی تھی۔ باقی جاسوسی کا ہی ٹائٹل تھا۔ سب سے پہلے تو میں احسان سحر کو مبارک باد دینا چاہوں گا جو ایک مہینے کے لیے سہی ہمارے صدر تو منتخب ہو گئے، مبارک ہو بھائی۔ کہانیوں میں للکار کے بعد نمبر ون رہ جانے والی گرداب پڑھی۔ اس قسط میں اسما صاحبہ نے یہ کیا ہنگامے کر ڈالے۔ ادھر اسلم کو کیچڑ میں دھنسا دیا ادھر شہریار کو راکے ہاتھ میں دے دیا۔ کیا ہر ناول میں ہمارے ہیرو بھائیوں کا ایسا ہی انجام ہونا ہے؟ ویسے پچھلی قسطوں میں اور اس قسط میں کافی کامیابیاں بھی ملی ہیں، ہمارے سپاہیوں اور ہیرو بھائیوں کو۔ جواری پرانے طرز کی ایک نئی کہانی ہے لیکن دیوی یا للکار کا نعم البدل تو بہرحال نہیں ہو سکتی۔ جواری سے میں اس لیے بیزار ہوں کہ اس نے ہمارے طاہر انکل کا نام ہی غائب کر دیا۔ حساب کتاب واقعی پُراثر، دردانگیز اور سبق آموز تحریر تھی۔ سرورق کا پہلا رنگ واقعی رنگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وطن کی محبت کے موضوع پر کہانیاں تو میری پسندیدہ ہی ہوتی ہیں۔ دانش کے کردار نے یہ ثابت بھی کیا لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہوگا۔ لیکن وطن کی محبت اپنے لوگوں میں ہے ہی اگر تھوڑا سا سسٹم صحیح کر لیا جائے تو اپنی پولیس لندن کی پولیس سے بھی اچھی کارکردگی دکھا سکتی ہے۔ تنویر ریاض کی شاطر بھی اچھی کہانی تھی۔ ویسے جاسوسی میں برا ہوتا ہی کچھ نہیں لیکن کبھی کبھی عکسِ لہو رنگ جیسی کہانی کو سرورق بنا کے دل توڑ دیتے ہیں۔"

لیہ سے محی الدین اشفاق کی خوش گمانیاں "جاسوسی کو دیکھا، دل خوش ہو گیا۔ محفل میں گئے۔ اس بار تو بلیک لسٹ بھی اپنے نام سے خالی تھی۔ سب سے پہلے جواری سے ملے۔ خاور کی تلاش نورین جاری ہے۔ ہر مرحلہ چونکا دینے والا ہے۔ احمد اقبال کی اولین اور آخری کاوشیں زبردست ہیں۔ ایسے مواقع کم کم آتے ہیں۔ گرداب میں ماہ بانو اپنے Baby اور کشور اپنے Baby کے ساتھ پریشان حال ہے۔ انڈیا میں شہریار کی مستیاں عروج پر ہیں۔ مصنفہ کو کافی دیر بعد شہریار کی سرگرمیوں کے تیز کرنے کا خیال آیا۔ جاسوسی اگلے مہینے میں خوب صورت تر ہو سکتا ہے بشرطیکہ کہ ہمارا خط شاملِ شمول ہو جائے۔" (لیجیے ہم بھی چاہتے ہیں کہ جاسوسی میں چار چاند لگ جائیں)

کراچی سے محسن کمال کی ناپسندیدگی "اس بار جاسوسی نے تو کمال کر دیا حالانکہ مجھے لگتا تھا کہ کمال صرف میں ہی کرتا ہوں۔ عام مہینوں کی نسبت اس بار جاسوسی نے 4 تاریخ کو اپنا دیدار کرایا۔ سب سے پہلے گرداب سے شروعات کی۔ للکار کے بعد اب گرداب نے اپنے سحر میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے، جبکہ للکار کے ہوتے کافی دبی دبی اور بورنگ جا رہی تھی، اب کہانی میں کافی تیزی آ گئی ہے۔ احمد اقبال کی جواری، جس سے لوگوں کو خاص طور پر للکار کے چاہنے والوں کو بڑی امید تھی کہ جواری شاید للکار کی جگہ لے سکے گی مگر افسوس کہ جواری للکار کا پاسنگ بھی نہیں، انتہائی بور اور پھیکی اسٹوری ہے۔ بے حد طویل اور بے مقصد مکالمہ بازی نے کہانی کو انتہائی بور کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اناڑی پڑھ رہے ہوں۔ وہی زمینداروں کی آپسی لڑائی۔ اس کے علاوہ معذرت کے ساتھ کہ احمد اقبال کی عکسِ لہو رنگ سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ اس میں بھی طویل اور بور مکالمہ بازی۔ کہانی بے ربط رہی۔ ایچ اقبال کی شرربار عمدہ تحریر تھی۔ انکل ایک بات یہ پوچھنی تھی کہ احمد اقبال اور ایچ اقبال ایک ہی رائٹر ہیں یا الگ الگ۔ (الگ الگ ہیں) انتہائی معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا اس بار ان کی 3 اہم کہانیوں کی وجہ سے ماہ دسمبر کا شمارہ انتہائی ناقص اور بور تھا۔ امید ہے کہ اس بار مجھے بلیک لسٹ نہیں کیا جائے گا، اقبال کا ایک شعر یاد آ گیا۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

ضلع لیہ سے محمد متین اشرف کے عزائم "میری عمر 51 برس ہے۔ 30 سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے، باقاعدگی سے جاسوسی اور سسپنس پڑھ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں ہوگا کہ اب گمراہ، مجاہد، شکاری، مداری، تاوان، آدھا چہرہ، زنداں میں پھول، موت کے سوداگر کے معیار کی کوئی کہانی آپ کے کسی رسالے میں نہیں ہے۔ گرداب ایک اچھی کہانی ہے مگر اسے اب چار کہانیوں میں تبدیل کر دیا گیا، کرداروں کی بھرمار ہے۔ گزارش ہے کہ ایک سلسلہ وار کہانی عراق یا افغانستان کی جنگ پر شروع کرائیں۔ نیز یہ کہ ڈائجسٹ میں مجھے تو کہیں بھی مدیر کا نام نظر نہیں آیا۔ کیا مدیر کوئی نہیں ہے؟ اگر مدیر نہیں

ہے تو مدیرِ اعلیٰ کہاں سے آ گئیں؟ اگر مدیر ہے تو اس کا نام ضرور لکھیں۔ ماہ دسمبر کے جاسوسی میں پہلے صفحات کی کہانی شرربار بہت اچھی رہی۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ نازیہ زندہ رہتی؟ دوسری کہانی عکسِ لہو رنگ جو کہ 36 صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مجھے تو کہانی کہیں نظر نہیں آئی۔ گو کہ احمد اقبال ایک اچھے قلم کار ہیں۔ آپ صاحبِ اقتدار اور صاحبِ اختیار ہیں اگر آپ نے خط شائع کیا تو آئندہ زندگی میں ایک اور خط لکھنے کی کوشش کروں گا۔"

راجہ اسلم حیات ضلع سرگودھا سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں "سب سے پہلے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ (آپ کو بھی سالِ نو مبارک ہو) جاسوسی اس دفعہ کافی لیٹ ملا۔ سرورق جاسوسی سے زیادہ سائنسی لگ رہا تھا۔ ٹائٹل گرل ایسے نظر آ رہی تھی جیسے کسی ڈھانچے کو وگ اور کپڑے پہنا دیے گئے ہوں لیکن کوئی بات نہیں، ہمارے کوہسار بھیا کو پھر بھی ہمیشہ کی طرح کافی حسین نظر آئے گی۔ فہرست میں جھانکا تو احمد اقبال ہی چھائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پہنچے اپنی پیاری محفل میں جہاں احسان سحر کی ناپسندیدگی ادارے کو سب سے زیادہ پسند آئی۔ اسے کہتے ہیں تنقید برداشت کرنا۔ مس ریڈیو اوہ سوری ایف ایم صاحبہ آپ نے تبصرہ لکھتے ہوئے اتنے کاغذ ضائع کیے۔ ظاہر ہے جب للکار پڑھتے ہوئے آپ نے آنسوؤں کی ندیاں بہا دیں تو خط لکھتے ہوئے کتنے کاغذ گیلے کیے ہوں گے۔ ملک سعید صاحب! محبت تو ایک جذبے کا نام ہے جو آنکھوں کے راستے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ کاظمی صاحب! اگر آپ عروج ناز کو خواب میں نظر نہیں آ سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ آیت الکرسی پڑھ کے سوتی ہیں۔ ہمایوں سعید چودہ فروری یعنی ویلنٹائن ڈے پر خودکشی کرنے، میرا مطلب ہے شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ قیصر بھیا! اللہ تعالیٰ جلد آپ کو آزاد فضاؤں کی نعمت سے نوازے۔ ویسے میرے ایک دوست اہلکار بھی سرگودھا جیل میں ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ کبیر عباسی! آپ کا انداز اور کہانیوں پر تبصرہ بہت شاندار تھا۔ عروج ناز صاحبہ! ہر بار خوش خبری کے ساتھ حاضر ہو رہی ہیں۔ پہلے سالگرہ کی پھر پاس ہونے کی، اب کی بار کون سی خوش خبری دیں گی؟ ابرار صاحب! صفدر آباد والوں کا شوشہ اس دفعہ پورا ہونے جا رہا ہے تھوڑا حوصلہ رکھو۔ گرداب میں لگتا ہے اسلم دلدل کی نذر ہو جائے گا اور مشابرم ماہ بانو کو نکال لائے گا جبکہ میری یہ خواہش بھی پوری ہونے جا رہی ہے کہ انڈیا میں سلو اور راوالوں کا ٹاکرا ہو۔ جواری وہیں کی وہیں ہے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی شرربار نے یہ ثابت کر دیا کہ عورت اگر زخمی ناگن بن جائے تو اس کا کاٹا ہوا پانی تک نہیں مانگ سکتا۔ پہلے ہی لگ رہا تھا کہ عامر ہی اصل مجرم نکلے گا۔ پہلا رنگ زرخیز مٹی بہت فاسٹ اور زبردست رہا۔ البتہ ایک عام سے پولیس افسر جو زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھا، اس کا انٹیلی جنس جیسے ادارے اور افسران کو اتنا گائیڈ کرنا کچھ ہضم نہ ہوا۔ کاشف زبیر صاحب کی حساب کتاب بہت شاندار کہانی تھی جس میں انہوں نے ناجائز منافع خوروں و بجلی چوروں، ٹیکس چوروں اور بھتا خوروں کا حساب کتاب بیان کیا۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی رپورٹ "جاسوسی ڈائجسٹ کچھ تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل گرل کے چہرے پر خوف کے سائے نظر آ رہے ہیں۔ اندرونی صفحات پر اداریے سے مستفیض ہوئے۔ میانوالی کے احسان سحر کو مبارک باد۔ پھر سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں شریکِ محفل ہوئے جہاں دوستوں کی محفل جمی ہوئی ہے اور اپنے اپنے تازہ بہ تازہ خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جواری کی بساط پر پہنچے جہاں نئے کردار وارد ہو رہے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ اس کی ایک کہانی بھی ہے۔ دلچسپی برقرار ہے۔ شرربار ایچ اقبال کی آج کل کے حالات کی مناسبت سے حقیقت سے قریب تر کہانی تھی۔ حقیقتاً ایسا ہی دور ہے۔ شاطر تنویر ریاض کی کہانی بہتر تھی۔ تعاقب، ڈھونگ، دوسرے، شوقیہ سراغ رساں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ چکر باز، حساب کتاب، فقیرانہ قتل اور آخری صفحات کی دونوں کہانیاں مجموعی طور پر اچھی تھیں۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی مزہ دیا۔ اس مہینے بس اتنا ہی۔"

سندیلیانوالی سے ابرار وارث کی دل داری "اس دفعہ کا شمارہ 5 تاریخ کو بروقت مل گیا۔ سرورق کا حصہ بہت پیارا تھا۔ مجموعی طور پر بہت اچھا تاثر لگا۔ ملی جلی مخلوق دیکھنے کو ملی۔ بزمِ یاراں میں احسان سحر کو کرسیِ صدارت پر بڑی شان سے متمکن دیکھا۔ احسان بھیا! آپ کی اس بات سے میں بھی بالکل متفق ہوں کہ جواری بیکار اور بس ٹائم پاس ہے جبکہ گرداب بہت اچھی اور حب الوطنی کے تاثر پر لکھی ہوئی بہت پیاری ہے۔ پتوکی والی باجی نے اتنے مہینوں بعد تابی اور عمران کا ذکر کر کے پھر زخم ہرے کر دیے۔ واقعی ایک انمول تحریر تھی۔ رویا جی نے کسی کو مخاطب کیے بغیر تبصرہ لکھ کر ریکارڈ بنایا۔ سید شکیل جی! یہ کون سی پنجابی کا مقولہ ہے بھلا اس کی وضاحت کریں، مجھے سمجھ نہیں آئی۔ ہمایوں سعید! مبارک باد کہ آپ کی شادی کی تاریخ فکس ہو گئی۔ ویلنٹائن ڈے پر ویٹ کرو جی! آغا فرید کا تبصرہ بھی زبردست لگا۔ ان کو ابھی تک نہیں پتا ماہا ایمان کون تھی۔ قیصر اعوان کا تبصرہ پسند آیا۔ اللہ سے دعا گو ہیں کہ جلد آپ کو اسیری سے رہائی دلائے، آمین۔ محسن علی کی معصوم شرارتیں بھی دلچسپ تھیں ہاہاہا۔ شیخوپورہ سے شایان سعید بھئی آ گیا آپ کا مشابرم خان امریکا میں... خوش، اسلم اور ماہ بانو کا اب وہی محافظ رہ گیا ہے وہاں۔ کبیر عباسی بھیا کا شاندار تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ پہلی دفعہ دل سے پڑھا۔ بہت اچھا لگا خاص طور پر گریڈنگ سسٹم والی بات۔ اب یہ ہر دفعہ آپ نے درجہ بندی کرنی ہے۔ عروج ناز اپنے پاس ہونے کی خوشی میں کافی چہک رہی تھیں، مبارک ہو جی۔ بات ہو کہانیوں کی تو جواری پڑھی ہی نہیں کیونکہ اس میں کوئی چارم ہے ہی نہیں۔ جاسوسی ہم گرداب کی وجہ سے پڑھتے ہیں۔ گرداب کی یہ قسط بھی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ اسلم اور ماہ بانو بے چارے پھر پھنس گئے ایک دلدل میں اور دوسری شاید طارق کے ہتھے پھر چڑھ گئی۔ اب مشابرم خان کی ازحد ضرورت ہے۔ دوسری طرف شہریار اور سلو ابھی تک کسی بہتر صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوئے۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی شرربار پڑھی۔ انجام نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ نازیہ نے اتنا اندھا انتقام لیا اور خود بھی نہ رہی۔ شاید انتقام کی آگ ایسی ہی ہے، سب کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کچھ بہتر لگی زیادہ نہیں۔ سب سے اچھی تحریر حساب کتاب کاشف زبیر کی رہی۔ اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور سچ ہے کہ اپنے محبوب بندوں کو گناہ سے بچاتا بھی ہے جیسا کہ عطا کے ساتھ ہوا۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

سراج الحق چترالی، کراچی۔ محسن علی موم، بالاکوٹ۔ قیصر اعوان، سرگودھا۔ مشتاق حسین کھوکھر، اسلام آباد۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ سید اکبر شاہ، اوگی ن، اوکاڑہ۔ ایم اے ہاشمی، بونیر۔ صبا گل، پیر بابا، بونیر۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ذہن کے نہاں خانوں میں موجود منفی سوچوں پر اگر مثبت رویے غالب نہ آئیں تو انسان سب کچھ پا کر بھی تہی داماں رہتا ہے!

جلّاد صفت

کاشف زبیر

بدعنوانی کے سمندر میں ڈالے گئے جال کو بڑی مچھلیاں توڑ کر اگر نکل جاتی ہیں تو چھوٹی مچھلیاں بھی بچ بچا کر فرار حاصل کر ہی لیتی ہیں لیکن بددیانتی سے پہنچنے والے نقصانات کے اثرات کبھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے... زیست کے سفر میں اکثر کہیں پیچھے لُٹ جانے والوں کا مداوا آگے ملنے والی خوشیوں سے ہو ہی جاتا ہے مگر کبھی کبھی تہی داماں وہ جانے کی کسک ہمیشہ دل و دماغ پر قابض رہتی ہے... معاف کر دینا... خوشیوں کی طرف لے جاتا ہے... جبکہ ماضی کی زیادتیوں پر کڑھتے رہنے سے انتقام کی چنگاری کبھی سرد نہیں ہو پاتی۔ اس کی زندگی بھی جہنم مسلسل سے عبارت تھی اور ثمرات میسر تھے لیکن ماضی... وہ سوچوں میں دبی چنگاری کی طرح زندہ رہا اور جب یہ بھڑکی تو شعلہ بن کر ایسے پھیلی کہ تپش دامن دل تک پہنچی... محبت کی مہک سے دشمن کو بھی خود کردہ جُرم کا اعتراف اور کئی گنی زیادتیوں کے اظہار پشیمانی پر مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن نفرت کی چنگاری کو ہوا دینے سے کبھی کبھار وہ خود بھی ان شعلوں میں بھسم ہو کر رہ جاتا ہے جس کی ذات بہت سوں کے لیے قابل پرستش ہوتی ہے۔

حالات کو سنگین سے سنگین بنا دینے والے محرکات کے تباہ کن نتائج کا سنسنی خیز احوال

ریاض احمد دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے بیوی بچے ناشتے کی میز پر موجود تھے اور بار بار اسے آوازیں دی جارہی تھیں۔ وہ شہری انتظامیہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھا۔ اس کی تنخواہ اور دوسری سہولیات بہت اچھی تھیں لیکن یہ چھ سو گز کا بنگلا اور اس کی بیس لاکھ کی کار اس کی آمدنی سے میل نہیں کھاتے تھے۔ ریاض ناشتے کے دوران میں بیوی بچوں کی فرمائشیں سنتا رہا۔ بیوی ڈائمنڈ نیکلس کا مطالبہ کر رہی تھی جس کی قیمت صرف پچپن لاکھ روپے تھی۔ اس کے بڑے بیٹے کو جدید ترین آئی فون چاہیے تھا اور بیٹی اپنی دوستوں کے ساتھ دبئی جانا چاہتی تھی۔ اس نے سب کے مطالبات سنے اور بولا۔ ''بس چند دن رک جاؤ... ایک معاملہ اٹکا ہوا ہے، وہ نکل جائے تو سب ہو جائے گا۔''

''آپ کے پاس کوئی کمی تو نہیں ہے۔'' بیوی نے تنک کر کہا۔ ''اللہ نے اتنا دیا ہوا ہے۔''

ریاض احمد کھسیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کیسے کمایا ہے۔ ''بھئی ان معاملات میں اللہ کا نام مت لیا کرو۔''

ناشتا کر کے وہ باہر آیا۔ ڈرائیور کار کے پاس کھڑا اسے صاف کر رہا تھا۔ ریاض کو دیکھ کر اس نے مستعدی سے دروازہ کھول دیا۔ ریاض

WWW.PAKSOCIETY.COM

سنبھالے کار کی طرف بڑھا تھا کہ اسے بے چینی کا احساس ہوا۔ اس بے چینی کا مرکز ماتھا تھا۔ اس کا ہاتھ ماتھے کی طرف گیا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک سنسناتی آواز سنی اور اگلے لمحے وہ نیچے گر رہا تھا۔ ڈرائیور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کے ماتھے کے سوراخ کو دیکھ رہا تھا۔ ماربل کے سفید فرش پر دور تک خون بکھر گیا تھا۔

☆☆☆

محمود ایاز بہت غریب پس منظر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ ایاز سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ اس وقت سبزی فروش سچ مچ سبزی فروش ہوتا تھا اور سارا دن سبزی بیچ کر بس اتنا کماتا تھا کہ اپنے اہلِ خانہ کو دال سبزی کھلا سکے۔ محمود اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ صرف سات برس کا تھا تو ماں مر گئی۔ امینہ برسوں سے پھیپھڑوں کی مریضہ تھی اور ایاز میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کا علاج کرا سکتا۔ محمود کے لیے یہ زندگی کا پہلا المیہ تھا ورنہ ماں کے ساتھ تو وہ غربت میں بھی خوش تھا۔ اس کا بس ایک شوق تھا اور وہ تھا تعلیم۔ وہ پڑھنا چاہتا تھا اسی لیے ماں نے اس کے باپ سے منوا لیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سبزی کے کام پر نہیں لگائے گا بلکہ پڑھنے کے لیے اسکول بھیجے گا۔ ایاز بیوی کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ محمود نام رکھنے سے اس کا بیٹا سچ مچ محمود نہیں بن جائے گا۔ اس کی قسمت میں باپ کی طرح ایاز بننا ہی لکھا تھا۔ بیوی کے مجبور کرنے پر اس نے محمود کو سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ پرائیویٹ اسکول کے خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

محمود اس میں بھی خوش تھا۔ اسے پڑھنے کا شوق نہیں جنون تھا۔ اس نے پہلی کلاس میں ہی اساتذہ کو حیران کر دیا۔ اسے جو ایک بار بتایا یا سکھایا جاتا، دوبارہ بتانے یا سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پھر وہ رٹتا نہیں تھا بلکہ سچ مچ سیکھتا تھا۔ پہلی کلاس کا نصاب اس نے چھ مہینے میں ختم کر دیا۔ یہ دیکھتے ہوئے اسے امتحان سے پہلے دوسری کلاس میں پروموٹ کر دیا گیا اور امتحان تک اس نے دوسری کلاس کا نصاب بھی چاٹ لیا۔ جب امتحان ہوئے تو اس نے ہر مضمون میں سو میں سے سو نمبر لیے۔ واحد ڈرائنگ تھا جس میں اس کے پچانوے نمبر آئے تھے۔ جس دن اس کا نتیجہ آیا، اسی دن امینہ نے اپنی بتیس سالہ زندگی کا آخری سانس لیا۔ مبارک باد دینے کے لیے آنے والی ٹیچرز اس کی میت میں شریک ہوئی تھیں۔

☆☆☆

رفاقت علی سو کر اٹھا تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ یہ گزشتہ رات شراب اور شباب سے شغل کا فطری نتیجہ تھا۔ وہسکی کی بوتل خالی تھی اور اس کے برابر میں لیٹی لڑکی بھی خالی بوتل جیسی لگ رہی تھی۔ نشا کال گرل تھی اور یہ فلیٹ اسی کا تھا۔ رفاقت ہفتے میں ایک بار اس کے پاس آتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اسی لیے بہت مہنگی تھی۔ لیکن رفاقت کے لیے پیسا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جس محکمے سے تعلق رکھتا تھا، وہ عوام سے پیسا وصول کرتا تھا۔ اگر محکمہ سارا پیسا وصول کرتا تو حکمرانوں کو کشکول لے کر در بدر بھیک مانگنے کی مشق نہ کرنی پڑتی۔

رفاقت علی کا ڈیفنس میں شاندار بنگلا تھا جس میں وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کی آمدنی اور طرزِ زندگی میں فرق تلاش کرتا۔ یہ بنگلا اس کی بیوی کے نام پر تھا۔ ایسے ہی کئی پلاٹ اور جائدادیں اس کے خاندان کے دوسرے افراد کے نام پر تھیں۔ پچیس برس کی رفاقت کے بعد اس کی بیوی اب صرف بچوں کی ماں رہ گئی تھی اس لیے رفاقت کی ہفتے میں ایک رات کانفشن کے اس فلیٹ میں گزرتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ اسی شوق کے لیے دولت رکھتا تھا ورنہ شاید وہ بھی شریف آدمی ہوتا۔ گھر والوں کو اتنا معلوم تھا کہ وہ یہ رات اپنے دفتر میں گزارتا ہے تاکہ پورے ہفتے کی آمدنی کا حساب کر کے اپنا حصہ وصول کر سکے کیونکہ اسی حصے کی بنیاد پر اہلِ خانہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر اس کی بیوی سمیت کسی کو شک یا علم بھی تھا کہ وہ اس رات کہاں ہوتا ہے تو اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ دولت کی فراوانی ہو تو بہت سارے معاملات خیر و خوبی سے چلتے رہتے ہیں۔

رفاقت نے غسل کیا اور کپڑے زیبِ تن کیے۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور ناشتا وہ گھر پر کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی کو سوتا چھوڑ کر وہ باہر سڑک پر موجود اپنی گاڑی تک آیا۔ دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تھا کہ اسے کار میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اسی لمحے اسے دھکا لگا اور وہ اوندھے منہ اسٹیئرنگ پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ عقب سے چلائی ہوئی گولی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ جہاں چند لمحے پہلے بہت سی خواہشات دھڑک رہی تھیں، اب وہاں موت کا سکوت تھا۔

ایاز، بیوی

ساتھ کام پر لگانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب تک اس کے بازو کمزور ہوں، محمود کے بازو اتنے مضبوط ہو چکے ہوں کہ وہ ٹھیلے کا بوجھ سنبھال سکے۔ اس نے محمود کی التجاؤں کو بھی اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ سات سالہ محمود اکیلا کیسے رہے گا، وہ اس کے ساتھ ہو گا تو اسے فکر بھی نہیں ہو گی۔ محمود نے دیکھا کہ باپ اس کی ماننے کو تیار نہیں ہے تو اس نے اپنے اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے بات کی۔ یہ پرائمری اسکول تھا اور اس کا سارا عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ ہیڈ مسٹریس حیران ہوئی کہ اتنے ذہین بچے کا باپ اسے پڑھانا نہیں چاہتا لیکن جب وہ ایاز سے ملی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ مخصوص ذہن کا شخص ہے جسے تعلیم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔ ہیڈ مسٹریس نے ایاز سے بات کی اور اسے قائل کرنا چاہا کہ وہ محمود کو آگے پڑھنے دے۔

''دیکھیں جی، مجھے پڑھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کی چھٹی بارہ بجے ہو جاتی ہے۔ میں صبح چھ بجے کا گھر سے نکلتا ہوں تو شام سات بجے واپس آتا ہوں۔ یہ اتنی دیر گھر میں اکیلا رہے گا۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی۔ تم وہاں سے اسے لے سکتے ہو۔ یہ بہت ذہین بچہ ہے، میں اسے گھر میں بھی پڑھاؤں گی۔ تم اسے سبزی کے ٹھیلے میں لگا کر برباد کر دو گے۔''

ہیڈ مسٹریس اچھی عورت تھی۔ محمود کی تعلیم کے لیے اس نے یہ ذمے داری لے لی۔ یوں محمود اسکول جانے لگا۔ وہاں سے وہ ہیڈ مسٹریس کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا۔ وہ اسے پڑھاتی بھی تھی اور زندگی کے ادب و آداب بھی سکھاتی تھی۔ یہ مدت زیادہ نہیں رہی تھی۔ اسے صرف تین سال ہیڈ مسٹریس سے سیکھنے کا موقع ملا اور اس کے بعد ان کا تبادلہ ہو گیا۔ نئی آنے والی ہیڈ مسٹریس مخصوص سرکاری ٹیچرز والا رویہ اور ذہن رکھتی تھی۔ اسے محمود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اب محمود دس سال کا تھا اور اس قابل تھا کہ اپنی دیکھ بھال کر سکے۔ اتنی سی عمر میں وہ ساتویں کلاس میں آ گیا تھا۔ پرائمری اسکول اب مڈل ہو گیا تھا مگر ہیڈ مسٹریس کے جانے کے بعد محمود کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا۔ اس نے امتحان کے بعد ایک اچھے سرکاری اسکول میں داخلے کی درخواست دی۔ اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے اسے داخلہ دے دیا گیا۔ اس نے میٹرک یہیں سے کیا۔ میٹرک میں اس کا بورڈ میں تیسرا نمبر تھا اور بہت عرصے بعد پہلی بار ایسا آئی ہو۔

اس کی پوزیشن اور ذہانت کی وجہ سے اسے شہر کے ایک بہترین کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ تعلیم کے جنون کے باوجود اس نے ابھی تک نہیں سوچا تھا کہ اسے کیا بننا ہے۔ اس نے کالج میں سائنس یا کامرس کے برعکس آرٹس کا انتخاب کیا۔ جب وہ پہلی کلاس لینے پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ بورڈ میں پہلی سو پوزیشنز حاصل کرنے والے طلبا میں وہ واحد تھا جس نے آگے تعلیم کے لیے آرٹس کا انتخاب کیا تھا۔ باقی سب نے سائنس یا کامرس کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

نور اللہ پٹواری جاگیرداروں کے سامنے عاجزی اور انکساری سے رہتا تھا۔ خود کو ان کا ملازم اور غلام جتاتا لیکن اپنے دفتر میں وہ بالکل بدل جاتا تھا۔ یہاں وہ بادشاہ تھا اور کسی کے لیے کوئی حکم بھی دے سکتا تھا۔ البتہ اس کے پاس بادشاہوں والا ظرف نہیں تھا جو بعض اوقات گالی دینے پر بخش دیتے تھے۔ وہ رعایت کا قائل نہیں تھا۔ حالانکہ اس کی یا دشاہت بھی نسل در نسل چلی آ رہی تھی۔ اس کا دادا پٹواری بنا تھا۔ پھر اس کا باپ پٹواری بنا اور اب وہ پٹواری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تربیت شروع کر دی تھی۔ جب اس کی ریٹائرمنٹ کا وقت آتا تو وہ پہلے ہی بیٹے کو تخت پر بٹھا جاتا۔ اپنے علاقے کی زمینیں اسے یوں یاد تھیں جیسے اس کے ہاتھ کی لکیریں ہوں۔ یہی اس کا فن تھا۔ زمینوں کے کھاتے وہ چشمے تھے جن سے پانی کی جگہ دولت نکلتی تھی۔ یہ کھاتے اس کی جنبشِ قلم کے محتاج ہوتے تھے۔ وہ ان سے ایسی جادوگری دکھاتا کہ صدیوں سے زمینوں کے مالک اچانک بے زمین ہو جاتے تھے۔ یہ وہ بدقسمت ہوتے تھے جن کی چند ایکڑ یا اس سے بھی کم زمین ہوتی تھی اور اس کا وارث کوئی عورت یا ایسا فرد بن جاتا تھا جو زمین کی ملکیت کے لیے لڑ نہیں سکتا تھا۔ نہ بازو سے اور نہ عدالت سے۔ پھر کسی دن اچانک پٹواری کے آدمی آ کر اسے بتاتے کہ وہ جس زمین کو اپنا سمجھتا تھا، وہ اس کی نہیں ہے۔ اسے بے دخلی کے لیے ایک دو دن کا وقت دیا جاتا اور اس کے بعد بے دخل کر دیا جاتا۔ اس کا حلقہ اگرچہ دیہی تھا لیکن اس کا دفتر شہر میں تھا۔ سائل اس سے یہیں آ کر ملتے تھے۔ اس وقت بھی نور اللہ کے دفتر میں ایک بوڑھی عورت اس کے سامنے بیٹھی گڑگڑا رہی تھی۔

''یہ زمین میری ہے۔ میرے سسر نے خریدی تھی پھر میرے شوہر کی ملکیت رہی اور اب میری ہے۔''

''تجھے بتایا تو ہے خریداری میں گڑبڑ تھی۔ سرکار نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

چشم دید

سکندر علیم

محتاط رویے کبھی بڑے نقصان کا سبب بن جاتے ہیں... ایک احتیاط پسند... کم سخن کا ماجرا... وہ لوگوں سے فاصلے کا قائل تھا... وہ اپنے مقررہ ہدف کو عبور کرنا چاہتا تھا مگر اس کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود ایک چشم دید پیدا ہو گیا۔

باریک بینی سے ماحول میں پیدا ہونے والے تغیر کا غیر معمولی ابہام

ڈاکٹر چارلس ہبرلین بے چینی سے کرسی پر بیٹھا پہلو بدل رہا تھا۔ تبھی سراغ رساں ونیڈر کمرے میں داخل ہوا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد ڈاکٹر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔''

چارلس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کیونکہ اسے زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا

''وہیں رہ گیا... وہ کیوں؟''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''مسز پلونی... وہ جرمنوں کو روکنے کے لیے وہاں رک گیا تھا۔''

مسز پلونی بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک رہی تھی۔ ''پلونی جیسا بزدل شخص... مسلح خونخوار جرمنوں کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو گیا؟''

اس بار میرا موڈ ذرا بدل گیا اور میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''مسز پلونی! ٹھیک ہے... وہ تمہارے لیے اچھا شوہر اور تمہارے بچوں کے لیے اچھا باپ ثابت نہیں ہوا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں دنیا جہان کی برائیاں تھیں۔ آخر وقت میں وہ بہادر ثابت ہوا اور اس نے ہمارے لیے اپنی جان قربان کر دی۔''

مسز پلونی اپنے کپ سے چائے کا آخری گھونٹ لے رہی تھی۔ میری بات پر کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اتنی حیرت زدہ تھی کہ اس نے کپ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ ''مت... تمہارا مطلب ہے اس نے جان کی بازی لگائی؟''

''ہاں، اس نے ہماری خاطر جرمنوں کو روکا۔ اس نے ہم سے ایک گرینیڈ لیا تھا اور اس کے دھماکے میں یقیناً وہ بھی مارا گیا تھا۔ اگر اس سے بچ گیا تھا تو جرمنوں نے اسے کہاں چھوڑا ہو گا؟''

مسز پلونی بڑی دیر تک نفی میں سر ہلاتی رہی، بالآخر اس نے کہا۔ ''موسیو ایورٹن! تمہیں شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ پلونی ایسے کسی مقابلے میں نہیں مارا گیا۔''

میں دنگ رہ گیا۔ ''تب اس کی موت کیسے ہوئی؟''

اس بار مسز پلونی جیسے پھٹ پڑی۔ ''کس نے کہا ہے کہ وہ کمینہ مر گیا ہے... وہ منحوس شخص میرا خون چوسنے کے لیے زندہ ہے۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے وہ میرے پرس سے رقم چرا کر شراب لینے گیا تھا اور آنے والا ہو گا۔''

ابھی مسز پلونی کے الفاظ منہ میں تھے کہ دروازہ کھلا اور پلونی ہیری اندر آیا۔ میں ذرا ایک طرف تھا اس لیے اس نے دیکھا نہیں اور سیدھا فریج کی طرف گیا اور اسے کھولتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ''کسی بدبخت نے اپنی گاڑی عین ہمارے گھر کے سامنے لگا دی ہے۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے آیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ بدبخت اس وقت تمہارے گھر میں موجود ہے۔''

پلونی اچھل پڑا اور اس نے مڑ کر مجھے دیکھا تو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے اچانک بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور ایک گھونسا مار کر اسے میز تک پہنچا دیا۔ وہ فوراً کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''پلیز... ہم بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔''

''ذلیل آدمی۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میں گھونسے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دوں، فوراً سے بیشتر سچ اگل دو۔''

پلونی ہیری نے بھی سمجھ لیا تھا کہ اس نے سچ نہ بولا تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے فراڈ کے لیے فرانسیسی فوجی وردی پہنی ہوئی تھی اور وہ جرمنوں سے بچنے کے لیے جنگل میں ایک متروک سیوریج لائن میں چھپا ہوا تھا، جب ہم وہاں پہنچ گئے۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ ہمارے پیچھے آنے والے جرمن سیوریج لائن دیکھ لیں گے اور اسے پکڑ لیں گے۔ البتہ سیوریج لائن کا دہانہ تباہ ہو جاتا تو جرمن اس کے پیچھے نہیں جا سکتے تھے۔ اس نے ہماری مدد کے بہانے ہم سے گرینیڈ لیا اور اس سے سیوریج لائن کا دہانہ بند کر دیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ ہم اس کی بنائی ہوئی سمت میں فرار ہو کر جان بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں گھونسے مار کر سچ مچ اس کا حلیہ بگاڑ دوں لیکن اس کی بیوی کی بے چارگی دیکھ کر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ میں باہر آیا تو مسز پلونی میرے پیچھے آئی اور اس نے لفافہ میری طرف بڑھایا۔

''موسیو ایورٹن! تم جان گئے ہو گے کہ پلونی یا میں اس کے مستحق نہیں ہیں۔''

میں نے اس عورت کو دیکھا جس نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں بس تکلیفیں اور عسرت دیکھی تھی، میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مسز پلونی! یہ رقم اب تمہاری ہے۔ اسے اس شخص سے بچا کر رکھنا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارے کام آئے گی۔''

میں وہاں سے روانہ ہوا تو مسز پلونی آنکھوں میں آنسو لیے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ واپسی کے سفر کے دوران میں نے سوچ لیا تھا کہ ماریا اور بچوں کو پلونی ہیری کی اصلیت بتانا ضروری نہیں ہے۔ مجھے اس بدبخت سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ہاں، اصلیت جان کر ماریا اور بچوں کی نظر میں میرا تاثر مجروح ہوتا اس لیے ان کی نظر میں پلونی ہیری کا بدستور ہیرو رہنا ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ پولیس نے اسے ہیڈ کوارٹر بلانے کے بجائے اس کی فیکٹری میں ہی تفتیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے بے دلی سے گردن ہلائی تو ونڈر کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

اس نے پوچھا۔ ''گزشتہ روز تم کتنے بجے چلے گئے تھے؟''

''ساڑھے تین بجے۔''

''کیا تم ہمیشہ اسی وقت جاتے ہو؟''

''نہیں، میرے جلدی جانے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دراصل مارشل گیس کٹ کمپنی کو کیڑوں کی وجہ سے ہزاروں ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔''

''کیڑے؟''

''ہاں، پتنگے... یہی وجہ تھی کہ میں گزشتہ شب فیکٹری واپس آیا۔''

سراغ رساں ونڈر پیچھے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ان پتنگوں کے بارے میں بتاؤ؟''

چارلس نے رومال سے ماتھے کا پسینا پونچھا اور اس کے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی فلم چلنے لگی۔

☆☆☆

سوموار کے روز وہ مارشل گیس کٹ کمپنی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ بہت زیادہ وزنی ہونے کی وجہ سے اس کے گھٹنے اتنا بوجھ برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایلس فریس پر گئی جو اپنی استقبالیہ میز کا سہارا لیے کافی کا مگ پکڑے کھڑی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک چارلس کا جائزہ لیا اور طنزیہ انداز میں بولی۔ ''کیا یہ فیس نئی ہے؟''

''ہاں۔'' چارلس نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کتنا پیارا رنگ ہے۔'' وہ بولی۔ ''یہ تمہاری سیاہ رنگت پر خوب جچ رہا ہے۔ ویسے تمہارے سائز کے اچھے کپڑے مشکل سے ہی ملتے ہوں گے۔''

وہ دفتر میں بمشکل پانچ منٹ کے لیے آیا تھا لیکن اتنی سی دیر میں ہی ایلس نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔ اگر وہ بھی گوری چمڑی والا ہوتا تو ایلس کو طنز کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

''تھوڑی سی ورزش سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' ایلس نے اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھائی اور بولی۔ ''میں اپنے جسم کو تناسب اور دبلا رکھنے کے لیے باقاعدگی سے چہل قدمی کرتی ہوں۔''

چارلس اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس باتیں کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور میز پر رکھی چیزوں کو ترتیب دینے لگا۔ اسے شدت سے کافی کی طلب ہو رہی تھی چنانچہ وہ بریک روم میں آ گیا۔ اس نے اپنے مگ میں کافی بھری اور میز پر بیٹھ گیا۔

چند لمحے بعد پال تھامسن آیا اور اپنے مگ میں کافی بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے تمہارے کہنے کے مطابق گودام کی تمام کھڑکیوں اور روشن دانوں پر باریک جالی لگوا دی ہے۔ اس کے باوجود پتنگے آ رہے ہیں۔'' وہ بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''ان جالیوں کی خریداری پر خاصی رقم خرچ ہوگئی اور ان کے لگانے پر جو خرچ ہوا، وہ الگ ہے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ مارشل اس پر خوش نہیں ہوگا۔'' پھر اس نے ایک پلاسٹک کا تھیلا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ان لیس کٹ کا جتنی جلد ممکن ہو سکے، ٹیسٹ کر ڈالو۔''

اس کے جانے کے بعد چارلس بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ راستے میں اس کی ملاقات کمپنی کے مالک مسٹر مارشل سے ہوئی جو اپنے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ کیڑے واپس آ گئے ہیں۔ میں تمہاری رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ کوئی بات معلوم ہو تو مجھے سیل پر فون کر دینا۔''

چارلس نے لیبارٹری کا رخ کیا اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، وہ ایک اجنبی شخص سے ٹکرا گیا۔

''مسٹر ولیسن یہ ہمارا نیا ٹریننی ٹونی گلبرٹ ہے۔'' لیبارٹری ٹیکنیشن جولیو نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر چارلس ہبرلین۔'' چارلس نے نوجوان ٹونی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

نئے لوگوں کو تربیت دینا اس کی ذمے داری تھی لیکن اس روز خلاف معمول اس نے لفافہ جولیو کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تم جلدی سے انہیں ٹیسٹ کرو۔ میں ٹونی کو فیکٹری دکھاتا ہوں۔''

''میں نے کبھی کوئی فیکٹری نہیں دیکھی۔'' ٹونی نے کہا۔ ''تم گیس کٹ کس طرح تیار کرتے ہو؟''

''ہم اس جگہ سے شروع کریں گے جہاں خام مال رکھا جاتا ہے۔''

وہ ٹونی کو گودا[illegible]

جہاں ملازمین کہ[illegible]

تھے۔

''تمہیں عمارت سے باہر نکلنے کے بعد اپنا بیج دیوار سے رگڑنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص میں لٹکا ہوا بیج علیحدہ کیا اور اسے عمارت کی دیوار میں لگے بیج ریڈر کے ساتھ کھینچ دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کا تالا کھل گیا اور وہ عمارت سے باہر آ گئے۔

''اگر ہمارے پاس بیج نہ ہو تو کیا ہوگا؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''تب تم دروازے کا تالا نہیں کھول سکتے۔''

''آگ لگ جانے کی صورت میں کیا ہوگا؟''

چارلس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارا بیج گم ہو گیا ہو اور تمہارے ساتھ کوئی ہنگامی صورت حال پیش آ جائے تو تم دیوار میں لگا ہوا بٹن دبا دو گے۔ ایک الارم بجے گا اور فائر اسٹیشن اپنی کارروائی شروع کر دے گا۔'' چارلس اسٹور بیج ٹینک کی قطار کے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھا جن میں سے ہر ایک کے ساتھ اوپر جانے کے لیے ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی۔

''ٹینکرز کے ذریعے جو خام مال آتا ہے، وہ انہی ٹینکوں میں اسٹور کیا جاتا ہے۔''

ٹونی حیرت سے ان اونچے نیچے سلنڈر نما ٹینکوں کو دیکھ رہا تھا جیسے کوئی دیہاتی پہلی بار کسی بڑے شہر میں آیا ہو۔ چارلس نے ایک ٹینک کے نچلے حصے میں لگا ہوا ہینڈل گھمایا تو ایک کھڑکی نما دروازہ کھل گیا۔ ٹونی نے پُرتجسس انداز میں اندر قدم رکھا۔ اس کے پیچھے پیچھے چارلس بھی ٹینک میں چلا گیا۔ اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ بمشکل ایک آدمی سیدھا کھڑا ہو سکے۔

چارلس نے ٹینک کے اندرونی حصے کا بغور جائزہ لیا تاکہ کیڑوں کے اندر آنے کا راستہ معلوم کر سکے لیکن اسے یقین ہو گیا کہ ٹینک میں ایسا کوئی خلا نہیں جہاں سے پتنگے اندر داخل ہو سکیں۔ اس کی تہ مکمل طور پر سیل تھی جبکہ اوپری حصے میں جالی لگا دی گئی تھی۔

''میری سمجھ میں یہ سسٹم نہیں آیا۔'' ٹونی نے کہا۔ ''کوئی بھی شخص بیج کی مدد سے اندر داخل ہو سکتا ہے۔''

''یہ بیج صرف کمپنی کے مخصوص ملازمین کے پاس ہیں اور جو کوئی بھی اس کی مدد سے دروازہ کھولتا ہے تو کمپیوٹر میں اس کی انٹری ہو جاتی ہے۔'' چارلس نے اسے بتایا۔

[illegible] نہیں آیا

نش کی

تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ پروانے ٹینک میں داخل ہوئے اور خام مال کو نقصان پہنچایا۔ دن کے اجالے میں انہیں دیکھنا مشکل تھا البتہ رات کی تاریکی میں وہ بہ آسانی دیکھے جا سکتے تھے۔

اس کے بعد چارلس نے اسے فیکٹری کے مختلف حصے دکھائے اور بتایا کہ کس طرح خام مال سے گیس کٹ تیار کی جاتی ہیں۔ جب وہ فیکٹری کا چکر لگا کر واپس لیبارٹری میں آئے تو جولیو نے ٹونی کو ایک لیب کوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کو پہن لینے سے تمہارے کپڑے محفوظ رہیں گے۔''

''یہ میرا ہے؟'' ٹونی نے حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، جب تک تم یہاں کام کر رہے ہو۔''

ٹونی نے چند بے ربط جملے بولے جو انگریزی سے بالکل مختلف تھے۔ ایسی زبان عام طور پر شہری لڑکے لفظوں کو بگاڑ کر بولتے ہیں لہٰذا چارلس نے ضروری سمجھا کہ شروع میں ہی ٹونی کی طبیعت صاف کر دی جائے۔ اس نے محتاط انداز میں کہا۔ ''جب تم جیسا سفید فام شخص کسی سیاہ فام کا مضحکہ اڑائے تو اسے تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔''

ٹونی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر ہبرلین... میں بھی تمہارے جیسا سیاہ فام ہوں۔''

''معاف کرنا... مجھے تو ایسی کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔''

''ہاں۔'' ٹونی نے اپنا بازو کوٹ کی آستین میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات جو دکھائی دیتا ہے، حقیقت اس سے مختلف ہوتی ہے۔''

☆☆☆

چارلس نے سراغ رساں سے گفتگو کے دوران میں بہت سی غیر اہم باتیں حذف کر دیں۔ اس کی یہ کوشش سراغ رساں ونڈر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے کاغذ پر ایک دائرہ بناتے ہوئے کہا۔ ''گویا تم نے نئے ملازم کو پوری فیکٹری دکھا دی۔ کیا یہ معمول کا حصہ ہے؟''

''ہاں، میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔''

''لگتا ہے کہ مسٹر گلبرٹ کو بیج سسٹم کے بارے میں زیادہ دلچسپی ہے؟'' ونڈر نے پنسل سے کاغذ پر ایک اور دائرہ بناتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے سارا طریقہ سمجھا دیا۔'' چارلس نے کہا۔ ''میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس نے اس بارے میں کسی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''تم یقیناً بہتر سمجھ سکتے ہو۔'' سراغ رساں بولا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

چارلس نے ایک بار پھر اپنی یادداشت کو کھنگالنا شروع کیا۔ یہاں کے دیے ہوئے نمونوں میں پتنگوں کی موجودگی کا انکشاف ہوا تھا جبکہ ٹینک میں ان کے جانے کا کوئی راستہ بظاہر نظر نہیں آرہا تھا۔ چارلس نے فون پر لیبارٹری میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کسی نے جواب نہیں دیا۔

وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ ایلس بڑی بے چینی سے اپنا پرس ٹٹول رہی تھی۔ چارلس کو دیکھتے ہی وہ بولی۔ ''کیا تم نے میرا بیج دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں صرف ایک منٹ کے لیے یہاں سے ہٹی اور میرا بیج غائب ہوگیا۔'' اس نے چارلس کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہی مجرم ہو۔ ''میری چیزیں ہمیشہ اسی طرح پڑی رہتی ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔''

چارلس نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔ اب اس کا رخ بریک روم کی طرف تھا جہاں جولیو اور ٹونی بیٹھے ہوئے تھے۔ چارلس نے بھی اپنا لنچ باکس نکالا اور ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ٹونی کے سامنے پیزا کی پلیٹ اور سوڈے کا ٹن رکھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں ایلس آندھی طوفان کی طرح بریک روم میں داخل ہوئی اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگی پھر اس نے وہاں بیٹھی ہوئی مینڈی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مینڈی! ہمیں وقت کی پابندی کرنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں، تمہیں یہیں بیٹھا ہوا دیکھتی ہوں۔''

مینڈی نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ایلس کو خوفی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گی۔ ایلس اس کی نظروں کی تاب نہ لاسکی اور بولی۔ ''اگر آنکھوں سے کسی کو قتل کرنا ممکن ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت مرجاتی۔''

مینڈی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور ایلس سے بولی۔ ''تم نے ہی مارشل کو بتایا تھا کہ میں کام پر دیر سے آتی ہوں۔''

''میں نے؟'' ایلس نے معصوم بننے کی ناکام کوشش کی۔

''مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' مینڈی نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تنہا چھوڑ دو ورنہ....''

''ورنہ کیا؟'' ایلس نے پوچھا۔

''تمہارے ساتھ وہی ہوگا جس کی تم مستحق ہو۔'' مینڈی نے کہا اور باہر چلی گئی۔

''جانے دو ایلس۔'' جولیو بولا۔ ''مینڈی کے یہاں بچہ ہوا ہے، وہ جلد ہی نارمل ہوجائے گی۔''

''چند منٹ دیر سے آنا کوئی بڑی بات نہیں۔'' نیکا نے کہا۔ ''رات کی شفٹ میں زیادہ کام ہوتا ہے۔''

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' ایلس دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

''تمہیں دوسرے لوگوں کی فکر کیوں رہتی ہے؟'' نیکا نے خالی ڈبا ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اپنے لیے بھی کوئی تلاش کرلو۔''

ایلس نے لمحہ بھر کے لیے نیکا کو دیکھا پھر اس کی توجہ چارلس اور ٹونی کے کھانے پر مرکوز ہوگئی اور وہ بولی۔ ''اوہ میرے خدا، دو آدمیوں کے لیے اتنا زیادہ کھانا۔'' پھر اس نے فریج سے اپنا بیج باکس نکالا اور بولی۔ ''میں تو ہر روز تھوڑی سی سلاد لیتی ہوں۔''

جولیو کولڈ ڈرنک لینا چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنا پرس نکالا اور بولا۔ ''کسی کے پاس بیس ڈالر کا چینج ہے؟''

''میں اپنا پرس میز کی دراز میں رکھ کر آئی ہوں۔'' ایلس نے کہا۔ ''کسی نے آج صبح میرا بیج چرالیا ہے۔ اب تو کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں رہی۔''

''ممکن ہے کہ تم سے ہی گم ہوگیا ہو۔'' جولیو بولا۔

''میں ڈھونڈ لوں گا۔''

''بعض اوقات بڑھاپے میں لوگوں کو بھولنے کی عادت ہوجاتی ہے۔'' ٹونی بولا۔ ''ممکن ہے تمہیں یاد نہ رہا ہو کہ بیج کہاں رکھا تھا۔''

ایلس کے گال غصے سے سرخ ہوگئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جملہ کہتی، چارلس نے بات نبھانے کے لیے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ٹونی کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔''

''بوڑھا ہونا کوئی بری بات نہیں۔'' ٹونی بولا۔ ''بلکہ بڑھاپے میں ہر جگہ رعایت ملتی ہے اور بوڑھے لوگوں کو کبھی کسی چیز کی پوری قیمت نہیں ادا کرنا پڑتی۔''

ایلس کا پارا چڑھ گیا اور وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں تمہاری شکایت کردوں تو تم اس کمپنی میں نہیں رہ سکتے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہ
دندناتی ہوئی کمرے

جولیو نے ٹونی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''اچھا ہوا تم اسے جان گئے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ٹونی نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ وہ کمپنی کی مالک تو نہیں۔''

''اگر وہ چاہے تو تمہاری چھٹی ہوجائے گی۔'' جولیو نے کہا۔

ٹونی کا چہرہ مرجھا گیا اور وہ بولا۔ ''ابھی تو مجھے یہاں آئے آدھا دن ہی ہوا ہے۔''

''میں تمہاری سفارش کردوں گا۔'' چارلس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھ چکا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔'' ٹونی نے طنزاً کہا۔

چارلس کو اپنے کام کے سلسلے میں بار بار ایلس کے سامنے سے گزرنا پڑتا اور وہ ہر مرتبہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی لہٰذا چارلس نے مزید کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے جلد جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے معلوم تھا کہ سورج غروب ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے اور چارلس کو پتنگے دیکھنے کے لیے مکمل اندھیرے کی ضرورت تھی۔ جیسے ہی چارلس نے اپنا کمپیوٹر بند کیا، وہ راہداری میں آکر کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''تم جلدی جارہے ہو؟''

چارلس اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے اسٹینڈ لینے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ ''تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے۔''

ایلس نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے مارشل کو بتادیا؟''

''میں اپنے وقت کا استعمال جانتا ہوں اور مسٹر مارشل کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے۔'' دفتر سے باہر نکلنے کے بعد چارلس کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی اہم کام ادھورا چھوڑ آیا ہے۔ وہ اپنی گاڑی کی چابی میز پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس ہولیا۔ ایلس اس کے دفتر میں کھڑی تھی اور اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ چارلس نے دیکھا کہ وہ اس کی ڈائری کے صفحات پلٹ رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' چارلس نے پوچھا۔

ایلس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ نمودار ہوئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پوچھے تو
تمہاری
ڈائری دیکھ رہی تھی۔''

''تم میری منیجر نہیں ہو اور بہتر ہوگا کہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا۔''

''میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔'' ایلس بولی۔ ''تمہاری ملازمت پہلے کی طرح محفوظ نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بھی یہ بات جانتے ہو۔''

''مجھے دھمکی مت دو۔'' چارلس نے کہا۔

''میں تمہیں صرف یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ مارشل اپنے ملازمین کی کتنی قدر کرتا ہے۔''

''تم لوگوں کی نوکریوں سے کھیل رہی ہو۔'' چارلس نے غصے سے کہا۔ ''یہ کھیل تمہیں بہت مہنگا پڑے گا اور ایک دن تم اس کی وجہ سے نقصان اٹھاؤ گی۔''

یہ کہہ کر اس نے چابیاں اٹھائیں اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ کار میں سوار ہوتے وقت اس کے پیٹ میں اینٹھن ہورہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے آپ کو مصروف نہ رکھا تو دن کا بقیہ حصہ گزارنا مشکل ہوجائے گا چنانچہ اس نے کار کا رخ گرانٹ میوزیم آف فائن آرٹ کی جانب موڑ دیا۔

استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی عورت کو چارلس نے اپنا کارڈ دکھایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''گڈ آفٹر نون، مسٹر ہیریسن... عام طور پر تم اتنی جلدی کبھی نہیں آتے۔''

مہمانوں کو خوش آمدید کہنا اس عورت کے فرائض میں شامل تھا لیکن اس کے لہجے کی مٹھاس چارلس کے دل میں اتر گئی اور وہ مسکراتے ہوئے گیلری کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بڑے انہماک سے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے دروازے پر کچھ شور سا محسوس ہوا۔ ایک عورت وہیل چیئر کے سہارے گیلری کی طرف آرہی تھی۔ اس نے چارلس کے قریب آکر کہا۔ ''آج کا دن بہت طویل ہے۔''

چارلس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے چنانچہ اس نے کہا۔ ''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

عورت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رشونا سیلیا۔''

چارلس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ''بہت خوب صورت نام ہے۔ مجھے چارلس ہیریسن کہتے ہیں۔''

چارلس جس تصویر کو دیکھ رہا تھا، وہ اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس تصویر میں تمہیں کیا خاص بات نظر آئی؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''یہ خاصی چونکا دینے والی ہے اور کوئی بھی شخص اسے دیکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

وہ دونوں مختلف تصویریں دیکھتے اور ان پر تبصرہ کرتے رہے اور انہیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ جب وہ واپس جانے کے ارادے سے داخلی دروازے پر پہنچے تو سورج پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔

''کتنی جلدی وقت گزر گیا۔'' چارلس نے کہا۔ ''میں دفتر میں ایک ایسے پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں جس کے لیے مکمل تاریکی درکار ہے۔''

''بڑا دلچسپ پروجیکٹ ہے، کاش میں تمہارے ساتھ شامل ہو سکتی۔''

''پتنگوں سے زیادہ دلچسپ وہ نمائش ہوگی جو اگلے ماہ منعقد ہونے والی ہے۔'' چارلس نے کہا۔ ''شاید اس کی افتتاحی تقریب میں ہم ایک ساتھ شرکت کر سکیں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔'' رشونا چہکتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

کمپنی کی عمارت سے سفید روشنی باہر آ رہی تھی۔ یہاں ہفتے کے سات دن اور روزانہ چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ اس نے اپنا بیج مرکزی دروازے پر لگے ریڈر میں ڈالا اور اندر داخل ہو گیا۔ ٹونی ایک میز پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' چارلس نے پوچھا۔

ٹونی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''جولیو نے کہا تھا کہ میں یہ پوری کتاب پڑھ ڈالوں۔ ایلس نے مجھے دفتر سے باہر نکال دیا۔ شاید وہ ڈر رہی تھی کہ میں کوئی چیز نہ چرا لوں لہٰذا میں یہاں آ گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ نکالے جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ سیکھ لوں۔''

''کسی کو نکالنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔'' چارلس نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم مزید کچھ دن یہاں گزار سکو گے۔''

''تم واپس کیوں آ گئے؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''یہ دیکھنے کے لیے کہ پتنگے رات میں کس راستے سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ اندر جا سکتا ہوں؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''نہیں، یہاں کام کرنے کے اوقات مقرر ہیں اور تم تو پہلے سے ہی مشکل میں ہو۔''

یہ کہہ کر چارلس اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ اس نے ایک چھوٹے تھیلے میں پلاسٹک کے دستانے، چمٹی اور کچھ دوسری چیزیں ڈالیں۔ جب وہ ٹینک میں داخل ہوا تو توقع کے مطابق وہاں لاتعداد پتنگے موجود تھے جو ٹینک کے دروازے پر لگے ہوئے بلب کے گرد منڈلا رہے تھے۔

چارلس چاروں طرف نظریں گھما کے ان کے اندر آنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ اسے دوسرے ٹینک سے ایک آواز سنائی دی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کوئی چوہا ہے لیکن پھر ایک جانی پہچانی آواز گونجی جسے سن کر چارلس چونک گیا۔ وہ مارشل تھا جو بہ آواز بلند کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ چارلس کو تجسس ہوئی کہ مارشل اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ لکڑی کی چوکیوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر ٹینک کی جانب دیکھنے لگا۔ اسے دو سائے سیڑھی کی جانب جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں ایک مارشل اور دوسری کوئی عورت تھی۔ چارلس کو نیکا کے الفاظ یاد آ گئے جو اس نے لنچ کے دوران میں ادا کیے تھے کہ اصل سرگرمی تورات کی شفٹ میں ہوتی ہے۔

مارشل اور عورت سیڑھی کے آخری سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے پھر اس نے ٹینک پر لگی ہوئی جالی کو زمین پر گرتے دیکھا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد وہ دونوں سیڑھی سے نیچے آتے دکھائی دیے۔ وہ خاموشی سے دم سادھے بیٹھا رہا۔ مارشل نے پہلے اس عورت کو اندر بھیجا اور سگریٹ جلا کر احاطے کا جائزہ لینے لگا۔

چارلس کو وہاں چھپے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک فورک لفٹر آ کر رکا جس پر گریس اور گیس کا سلنڈر رکھا ہوا تھا۔ اس کی ناگوار مہک سے چارلس کا سر چکرانے لگا۔ پتنگوں کی آمد کی وجہ کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ گئی تھی لیکن وہ کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی ملازمت فوراً ختم ہو جاتی۔

بالآخر مارشل نے اپنا سگریٹ ختم کیا۔ بیج نکال کر ریڈر میں ڈالا اور عمارت میں داخل ہو گیا۔ چارلس نے لیبارٹری میں جانے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا جو بہت کم استعمال میں رہتا تھا۔ لیبارٹری میں پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ وہ اس رات ایک قیمتی راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا مسٹر مارشل اور اس عورت نے تمہیں دیکھ لیا تھا؟'' سراغ رساں وینڈر نے پوچھا۔

''نہیں، میں اوجھل رکھا۔''

''تم کیوں چھپ گئے تھے؟''

''میں اسے چھپنا نہیں کہوں گا تاہم میں وہاں پر اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسٹر مارشل کمپنی کے مالک ہیں... اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں تو میری ملازمت اسی وقت ختم ہو جاتی۔''

سراغ رساں نے پرنٹ آؤٹ پر نظر دوڑائی۔ چارلس جانتا تھا کہ گزشتہ چوری کے واقعے کے بعد کمپنی کے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ نے لوگوں کی آمد و رفت کا ریکارڈ رکھنا شروع کر دیا تھا کہ کون کس وقت آیا اور کب گیا۔

''تم فیکٹری سے نکلنے کے بعد کہاں گئے تھے؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔

''گھر۔''

''گھر پر تمہارے علاوہ اور کون ہے؟''

''میں اکیلا رہتا ہوں۔'' چارلس نے جواب دیا۔ ''اور میرے پاس ایسا کوئی گواہ نہیں جو بتا سکے کہ میں نے گھر آنے کے بعد ٹی وی پر فلم دیکھی اور سو گیا۔''

☆☆☆

دوسرے روز چارلس دیر سے دفتر پہنچا۔ چند لمحے دروازے کے باہر رک کر اس نے اپنے آپ کو ایلس کی ممکنہ جرح کے لیے تیار کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ایلس اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گیا اور روزمرہ کے معمول کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔ اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس کی شکایت کرنے ایچ آر والوں کے پاس چلی گئی ہو؟

ٹونی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''گڈ مارننگ ڈاکٹر ہیرلسن... لگتا ہے کہ آج وہ بڑھیا کام پر نہیں آئی۔''

''ممکن ہے کہ وہ بریک روم میں بیٹھی دوسری عورتوں سے باتیں کر رہی ہو۔'' چارلس نے خیال ظاہر کیا۔

''اس کی جیکٹ کرسی پر نہیں ہے۔'' ٹونی نے کہا۔ ''اور اس کا کمپیوٹر بھی بند ہے۔''

چارلس اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ ٹونی کی بات کی تصدیق کر سکے۔ واقعی ایلس کا کمپیوٹر بند تھا اور ایسی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ کام پر آئی ہوئی ہے۔ چارلس نے کہا۔ ''گزشتہ چھ ماہ میں اس نے ایک دن کی خلاف

''آج کا دن سکون سے گزرے گا۔'' ٹونی نے کہا۔

مینڈی نے دروازہ کھول کر جھانکا اور جب اس نے چارلس اور ٹونی کو ایلس کی میز کے پاس کھڑا دیکھا تو اندر چلی آئی اور بولی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''ایلس آج صبح کام پر نہیں آئی۔'' چارلس نے کہا۔

''میں ایچ آر کو فون کرتی ہوں۔'' مینڈی نے کہا۔ ''ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔''

چارلس نے مارشل کو بھیجنے کے لیے اپنی رپورٹ تیار کی لیکن اس میں یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ اسے ٹینک کی چھت پر ایک عورت کے ساتھ دیکھ چکا ہے جو یقیناً اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس نے رپورٹ مکمل کرنے کے بعد قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اسے میل کر دیا کیونکہ وہ خلوص دل سے سمجھ رہا تھا کہ اس واقعے کا ذکر کیے بغیر یہ رپورٹ نامکمل تھی۔

ٹونی اس کے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔ ''جولیو نے کہا ہے کہ تم سے مل لوں۔ جب تک سیمپل ٹیسٹ نہیں ہو جاتے، میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔''

''میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہم کس طرح خام مال کے نمونے اکٹھا کرتے ہیں۔'' چارلس نے کہا۔

ٹونی یہ سنتے ہی مستعد ہو گیا۔ وہ ان لڑکوں میں سے تھا جو مستقبل میں تنظیم سائنس داں بن سکتے تھے بشرطیکہ ایلس جیسی کوئی ہستی اس کے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ ٹونی نے مطلوبہ سامان اکٹھا کیا اور ایک چھوٹے تھیلے میں رکھ کر اس پر اپنا نام جلی حروف سے لکھ دیا۔

''ایک فالتو جوڑی دستانوں کی بھی اپنی جیب میں رکھ لو۔'' چارلس نے اسے مشورہ دیا۔ اس کے بعد وہ اسی راستے پر روانہ ہو گئے جس پر چارلس گزشتہ شب گیا تھا۔ یکایک اسے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔

اس نے چونک کر ٹونی کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''شاید کوئی بلی ہے۔''

چارلس اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور آواز کی جانب لپکا۔ ٹونی بھی اس کے پیچھے تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ نیکا ایک ٹیکنیشن کے سامنے زور زور سے ہاتھ ہلا کر ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی لیکن روسی زبان بولنے کی وجہ سے اس کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''نیکا۔'' چارلس نے اپنا تھیلا زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ روسی زبان میں بیان کرنے لگی۔ اس کی چیخ پکار سن کر بہت سے کارکن اس جانب دوڑے۔ چارلس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نیکا... ہوش میں آؤ، تم ٹھیک تو ہو؟''

نیکا نے کنٹینر کی جانب دیکھا۔ چارلس کی نظریں بھی اسی جانب گھوم گئیں۔ کنٹینر کے نچلے حصے سے ایک انسانی پاؤں باہر نکلا ہوا تھا۔

''پائپ بند ہوگیا تھا۔'' نیکا نے انگریزی میں کہا۔ ''میں یہی دیکھنے آئی تھی کہ کیا خرابی ہے تو میری نظر اس پر پڑی...''

چارلس نے کارڈ بورڈ کا ڈھکنا اٹھا کر اندر جھانکا۔ ایلس پلاسٹک کے تختوں پر ایک بے جان گڑیا کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ خون کے دھبے سفید پلاسٹک کے تختوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کا آدھا حصہ کچل گیا تھا۔ چارلس نے آہستہ سے ڈھکنا برابر کردیا۔

''سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔'' ٹونی نے کہا۔ ''کوئی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔''

سفید کوٹ میں وہ خاصا بارعب نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکا، دوسرے ہاتھ سے سیل فون نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

جولیو مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ ''کیا کسی نے نو گیارہ کو فون کیا ہے؟''

''ہاں، میرا رابطہ ڈسپیچر سے ہوگیا ہے۔'' ٹونی نے کہا۔

''ہمیں اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہیے۔'' جولیو نے کہا۔

''یہ مرچکی ہے۔'' چارلس بولا۔ ''پولیس کے آنے تک ہم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔''

جب مارشل کو اطلاع ملی تو وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اسے ایلس کی موت سے زیادہ یہ فکر تھی کہ اس واقعے سے کام کی رفتار متاثر ہورہی ہے اور خون کے چھینٹے پڑنے سے کئی گیس کٹ بے کار ہوگئی ہیں۔ چارلس کو یہ سن کر غصہ آگیا اور وہ بولا۔ ''ایک عورت مرگئی ہے۔ وہ عورت جو یہاں کئی سالوں سے کام کررہی تھی۔''

''وہ واقعی مرچکی ہے۔'' مارشل نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اسے اس حال میں دیکھ کر افسوس ہوا لیکن مجھے اپنا بزنس بھی تو چلانا ہے۔''

کچھ دیر بعد پولیس والے اور دوسرا عملہ وہاں پہنچ گیا۔ ٹونی نے چارلس کو اشارہ کیا اور اسے ایک کونے میں لے جا کر بولا۔ ''جب پولیس تم سے پوچھ گچھ کرے تو زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بس ہاں یا نہ میں جواب دینا ورنہ وہ تم پر شک کرسکتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چارلس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں قصوروار نہیں ہوں۔''

''تم نے گزشتہ روز ایلس کو دھمکی دی تھی جس کی وجہ سے تم مکمل طور پر بے گناہ نہیں سمجھے جاسکتے۔''

☆☆☆

سراغ رساں وینڈر نے ہاتھ سے لکھے ہوئے کاغذات پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ایلس نے ٹونی کو نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تھی؟''

''اس نے محض ڈرانے کے لیے ایسا کہا تھا۔''

''اس نے اپنی دھمکی پر عمل کیا یا نہیں؟'' وینڈر نے پوچھا۔

چارلس نے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''جو تم سمجھ رہے ہو، ویسا کچھ نہیں ہے۔ ٹونی کو یہاں کام کرتے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔ اتنی کم مدت میں ایلس کی ناراضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کیا وہ اتنی زیادہ ناراض ہوئی تھی کہ ردعمل کے طور پر اسے قتل کردیا جاتا؟ تم نے بھی تو اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔''

''میں یقیناً اس سے ناراض نہیں تھا اور نہ ہی ٹونی۔ تمہیں مشتبہ شخص کو کہیں اور تلاش کرنا چاہیے۔ تم ٹونی پر اپنی توجہ کیوں مرکوز کیے ہوئے ہو؟ محض اس لیے کہ وہ سیاہ فام ہے۔''

''کیا مسٹر گلبرٹ سیاہ فام ہیں؟'' یہ کہہ کر وینڈر نے اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھا۔ چارلس نے محسوس کیا کہ پسینے سے اس کی گردن بھیگ رہی ہے۔

''کیا تم ایلس کے شوہر مسٹر فوربس کو جانتے ہو؟'' وینڈر نے پوچھا۔

''ہاں، میں اس سے مل چکا ہوں۔''

''اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''ایک کمپنی فنکشن کے دوران میں اس کی برابر والی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ خاموش طبع شخص ہے اس لیے ہمارے درمیان زیادہ بات نہیں ہوئی۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور بات محسوس کی؟''

''کسی شخص کو جانچ کر [illegible] کافی ہے۔''

اس کے بعد چ

اور اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد ایک پولیس آفیسر ٹونی کو لے کر راہداری میں آیا۔

ٹونی نے چارلس کو ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ پکڑا دیا جس پر اس کے گھر کا نمبر درج تھا۔ اس نے چپکے سے چارلس کے کان میں کہا۔ ''اگر ان لوگوں نے مجھے نہ جانے دیا تو تم میرے والدین کو فون کرکے بتا دینا۔''

''بے فکر رہو۔'' چارلس نے کہا۔ ''اگر تم بے قصور ہو تو پولیس تمہیں گرفتار نہیں کرے گی۔''

اس تحقیقات کی وجہ سے فیکٹری میں کچھ دیر کے لیے کام بند ہوگیا تھا۔ اگر کوئی اور غائب ہوتا تو وہ تمام ملازمین کی چھٹی کردیتا لیکن مارشل کا خیال تھا کہ وہ پولیس کے جاتے ہی کام دوبارہ شروع کروادے گا اور ملازمین سے کچھ زائد گھنٹے کام لے کر اپنا نقصان پورا کرے گا۔ لوگ فارغ ہونے کی وجہ سے ادھر اُدھر ٹولیوں میں بٹ کر اس قتل کے بارے میں گفتگو کررہے تھے اور یہ جاننے کی کوشش کررہے تھے کہ وہ کیا محرکات تھے جن کی بنا پر ایلس کو قتل کردیا گیا۔

سب سے زیادہ شبہ چارلس پر ظاہر کیا جارہا تھا جو کمپیوٹر پر بیٹھا خود سمیت مشتبہ افراد کی فہرست تیار کررہا تھا۔ اس میں پہلا نام اسی کا تھا کیونکہ اس نے شیرل اور ٹونی کی موجودگی میں ایلس سے غصے سے بات کی تھی۔ دوسرا مشتبہ شخص ٹونی تھا جسے ایلس نے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ تیسرا نام مینڈی کا تھا جس کی ایلس نے دیر سے آنے پر شکایت لگائی تھی اور مینڈی نے اسے سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی۔

ٹونی نے چارلس کے کمرے میں جھانکا۔ اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا اور آنکھیں خوف کی وجہ سے پھیل گئی تھیں۔ چارلس نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''سراغ رساں کو میرے تھیلے میں سے ایلس کا بیج ملا ہے اور اب مجھے وضاحت کرنی ہے کہ یہ بیج میرے تھیلے میں کیسے آیا۔''

چارلس نے فوراً ہی ٹونی کے نام کے آگے یہ چھوٹا سا ثبوت ٹائپ کرلیا اور بولا۔ ''تم نے یہ بیج نہیں چرایا تھا؟''

''مجھے کسی نے پھنسانے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر ہیریسن۔'' ٹونی روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں نے یہ بیج نہیں چرایا۔''

''مجھے یقین [illegible] سے گہرا

[illegible]ات پیدا

کرسکتی ہے۔'' چارلس نے کہا۔

''وہ سراغ رساں بھی یہی سمجھ رہا ہے کہ میں نے ہی یہ بیج چرایا تھا۔'' ٹونی پریشانی کے عالم میں بولا۔

''دراصل یہ سب کچھ غلط ٹائمنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم آج سے کام شروع کردیتے تو تم پر کوئی شبہ نہ کرتا۔''

''ہاں واقعی، یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی مجھ جیسے سیاہ فام لڑکے کا انتظار کررہا تھا کہ اس کا الزام مجھ پر ڈالا جائے۔''

''تمہیں پھنسایا جارہا ہے۔'' چارلس نے کہا۔

''یہ پہلا موقع نہیں ہوگا کہ کوئی بے گناہ سیاہ فام کسی دوسرے کے جرم کے بدلے جیل جائے۔''

ٹونی کرسی گھسیٹ کر چارلس کی میز کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''مجھے کچھ کرنا ہوگا ورنہ وہ سارا ملبا مجھ پر ڈال دیں گے۔'' پھر اس نے ایک نظر کمپیوٹر اسکرین پر ڈالی اور بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا نام بھی مشتبہ لوگوں کی فہرست میں شامل کرلیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس میں نیکا کا نام بھی ڈال دو۔ اسی نے ایلس کو رات میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا تھا۔''

''میرا نہیں خیال کہ نیکا کا اس قتل سے کوئی تعلق ہے۔'' چارلس نے کہا۔ ''تم نے دیکھا نہیں کہ لاش ملنے پر اس کا ردعمل کیا تھا۔''

''ایلس کے شوہر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ سراغ رساں وینڈر اس سے ضرور پوچھ گچھ کرے گا۔''

''ممکن ہے کہ ایلس کا شوہر اس کا سامان لینے آئے۔''

''پولیس نے پہلے ہی اس کی ساری چیزیں اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔'' چارلس میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس کا لنچ باکس نہیں دیکھا ہوگا۔''

''پھر تو وہ باکس فریج میں ہوگا، چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

چارلس اور ٹونی بریک روم کی طرف چل دیے۔ وہ جب راہداری میں پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ چارلس نے ٹونی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود بریک روم میں جھانکنے لگا۔ ٹونی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر مارشل کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا ہے، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ٹونی! یہ کیا کر رہے ہو؟ تم باس کے لڑکے کو مل نہیں جا سکتے۔" چارلس نے کہا۔

لیکن وہ نہیں مانا۔ چارلس بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ٹونی نے کمرے میں داخل ہو کر ادھر اُدھر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ٹونی نے جھانک کر دیکھا مارشل اپنی سرخ اسپورٹس کار کے پاس کھڑا ہوا پال سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر گالف بیگ لٹکا ہوا تھا۔

"وہ ایک چیز یہاں بھول گیا ہے۔" ٹونی نے گالف کھیلنے والی چھڑی کی طرف اشارہ کیا جو مارشل کی میز اور دیوار کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔

جیسے ہی وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو چارلس بولا۔ "ٹھہرو۔" پھر اس نے اپنی جیب سے دستانے نکال کر ٹونی کو دیے اور بولا۔ "انہیں پہن لو تاکہ چھڑی پر تمہاری انگلیوں کے نشانات نہ آئیں۔"

ٹونی نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور اس تنگ جگہ میں سے چھڑی کو نکال لیا۔ چارلس نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر چھڑی کا بغور معائنہ کیا اور بولا۔ "اس پر خون کے دھبے نظر نہیں آ رہے۔ ممکن ہے اس نے انہیں صاف کر دیا ہو۔"

"تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟" ٹونی نے چھڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ سراغ رساں وینڈر نے مارشل کو شامل تفتیش نہیں کیا جبکہ میں اسے گزشتہ شب گودام میں عمارت میں داخل ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اسی نے ایلس کا بیج چرایا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ تمام ملازمین کے آنے اور جانے کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ اس طرح مارشل نے وہاں اپنی موجودگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔"

"اگر تمہاری بات مان لی جائے تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ایلس کو کیوں قتل کیا؟"

"اس نے مارشل کو فیکٹری میں کام کرنے والی ایک عورت کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ نیکا نے ایلس سے کہا تھا کہ ساری سرگرمیاں رات کی شفٹ میں ہوتی ہیں۔ ایلس کو ٹوہ لینے کی عادت تھی اور اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑ گیا۔ مارشل نے وہ بیج تمہارے تھیلے میں ڈال دیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ قتل تم نے کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے ایلس کو مارنے کے لیے یہ چھڑی استعمال نہ کی ہو لیکن شاید اس نے گالف بیگ میں سے اس لیے نکال دیا ہو کہ اس کی جگہ وہ سلاخ رکھ لے جس سے اس نے ایلس کے سر پر ضرب لگائی تھی۔"

دونوں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مارشل اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر گالف بیگ رکھ رہا تھا۔ ٹونی نے چارلس کو ایک طرف دھکیلا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" چارلس نے پوچھا۔

"وہ مردود ثبوت ضائع کرنے جا رہا ہے۔ مجھے اس کا پیچھا کرنا ہوگا ورنہ اس کے جرم کی سزا میں بھگتوں گا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ یہ صحیح طریقہ ہے۔" چارلس اس کے پیچھے جاتے ہوئے بولا۔ "ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"انہیں آتے میں دیر ہوسکتی ہے، ہمیں اسے روکنا ہوگا۔"

ٹونی دوڑتا ہوا ایک کنورٹیبل کی طرف بڑھا اور ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔ چارلس نے بھی اس کی تقلید کی اور جب وہ برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ٹونی نے پوچھا۔ "تم نے دیکھا، وہ کس طرف گیا ہے؟"

"ہاں، بائیں جانب۔ اس کا رخ لیون پارک کی طرف ہے۔"

"کیا تمہارے پاس سیل فون ہے؟" ٹونی نے پوچھا۔

"ہاں۔" چارلس نے اپنی جیب سے فون نکالا اور بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے کہ اس میں کیمرا ہے؟"

"میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" پھر وہ ایک نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ "ہیلو، کیا میں سراغ رساں وینڈر سے بات کرسکتا ہوں؟"

"ہمیں تصویروں کی ضرورت ہوگی۔" ٹونی بولا۔ "اگر ہم ویڈیو بنا سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اگر ہم نے اسے آلۂ قتل پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کی تصویر یا ویڈیو ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے ورنہ پولیس ایک امیر گوری چمڑی والے کے مقابلے میں ایک غریب سیاہ فام کی بات کا یقین کیوں کرے گی۔"

"ہم اس کی

اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ پولیس کو ہی اس سے نمٹنے دو۔"

ٹونی نے سنی ان سنی کر کے کار کی رفتار بڑھا دی۔ تھوڑی دیر بعد اسے مارشل کی کار نظر آ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پارک کے قریب جا کر سڑک تنگ ہوگئی تھی۔ مارشل نے اپنی کار کچے راستے پر اتار دی اور پہاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔ اسی وقت سیل فون پر سراغ رساں وینڈر کی کال آئی۔ ڈاکٹر چارلس ہیریسن نے اسے بتایا کہ وہ اور ٹونی لیون پارک کے قریب مارشل کا تعاقب کر رہے ہیں کیونکہ انہیں شبہ ہے کہ وہ آلۂ قتل پھینکنے جا رہا ہے۔

"ڈاکٹر ہیریسن! میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں فوراً وہاں سے واپس آ جاؤ۔"

چارلس نے فون اپنے سینے سے لگایا اور بولا۔ "ٹونی... سراغ رساں وینڈر چاہتا ہے کہ ہم اس کا تعاقب نہ کریں۔"

"کیونکہ اسے مجھ پر شک ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی نہیں رک سکتا جب تک آلۂ قتل نہ برآمد کر لوں۔"

مارشل کو بیک ویو مرر میں ٹونی کی کار نظر آ گئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ٹونی بولا۔ "مسٹر مارشل نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔"

چارلس نے فون پر وینڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مارشل کی گاڑی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوگئی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"تم لوگ اس علاقے سے نکل جاؤ۔" وینڈر نے کہا۔ "پولیس وہاں پہنچ رہی ہے۔"

مارشل نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ کے آخری سرے پر کھڑی کی پھر اس نے گاڑی کو نصف دائرے میں اس طرح گھمایا کہ وہ دوسری کاروں کے پیچھے چھپ جائے۔ ٹونی نے ایک جھٹکے سے اپنی کار روکی اور پارکنگ لاٹ کے خارجی دروازے پر کھڑی کر دی۔ اس طرح اس نے مارشل کی گاڑی کے باہر نکلنے کا راستہ مسدود کر دیا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔

"وہ جانتا ہے کہ پھنس چکا ہے اس لیے باہر نہیں نکل رہا۔"

ہی مارشل کی

رف بڑھنے

لگا۔ کار کے پاس آ کر اس نے کھلی ہوئی کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور چارلس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو پتنگوں کے بارے میں رپورٹ تیار کرنا تھی۔"

چارلس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ اس امید پر خاموش رہا کہ شاید تھوڑی دیر میں پولیس وہاں آ جائے۔ اس کے بجائے ٹونی بولا۔ "پہلے تم میرے سوال کا جواب دو کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

مارشل اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "جتنی آسانی سے آئے ہو اتنی آسانی سے جا بھی سکتے ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں ایک منٹ میں ملازمت سے فارغ کرسکتا ہوں۔" پھر اس نے چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرا دامن کیوں روک رکھا ہے، اگر تم چاہو تو بہ آسانی کلب کے ممبر بن سکتے ہو مگر اس کے بجائے تم اپنے جونیئر کے ساتھ میرا تعاقب کر رہے ہو۔"

"اگر تمہارا اشارہ رات کی شفٹ میں ہونے والی سرگرمیوں کی طرف ہے تو مجھے معاف ہی رکھو۔"

مارشل کا منہ ایک لمحے کے لیے کھلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے چارلس کی گودام میں موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ غصے سے بولا۔ "تم وہاں نگرانی کر رہے تھے؟"

"میں ٹیبنٹکل دیکھ پایا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا البتہ میں نے وہاں لگی ہوئی جالی کو زمین پر گرتے ضرور دیکھا اور اگر تم زیادہ احتیاط کرتے تو مجھے تمہارے کرتوتوں کا علم نہ ہوتا۔"

"تم اپنے آپ کو ملازمت سے برطرف سمجھو۔" مارشل یہ کہہ کر ایڑیوں کے بل گھوما اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اس نے گاڑی ریورس گیئر میں ڈالی اور کئی گز پیچھے چلا گیا پھر اس نے اپنی کار کا رخ ان کی جانب کر لیا۔

"ٹونی... وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ٹونی نے انجن اسٹارٹ کیا لیکن اتنی دیر میں مارشل کی گاڑی تڑیک آ چکی تھی۔ اس نے سائڈ سے ٹونی کی کار کو ٹکر ماری جو اتنی شدید تھی کہ چارلس اپنی سیٹ پر اچھل پڑا اور اس کا سر کار کی چھت سے ٹکرا گیا۔ مارشل کی کار کو بھی نقصان پہنچا۔ اس کی سامنے کی ایک لائٹ ٹوٹ گئی اور بمپر کو بھی نقصان پہنچا۔

مارشل نے گاڑی ریورس کی اور دوبارہ ان کی جانب

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑھا، ٹونی چلایا۔ ''مسٹر ہیریسن! کار سے باہر نکلو۔''

چارلس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ جام ہو چکا تھا۔ ٹونی جلدی سے گاڑی سے اترا اور دوسری طرف جا کر پسنجر سیٹ والا دروازہ باہر سے کھولنے لگا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ چارلس کو مارشل کی کار کے انجن کی آواز بالکل قریب سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے ٹونی سے کہا۔ ''بھاگ جاؤ۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''وہ تمہیں کچل دے گا۔'' چارلس نے کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں ہوگا، تم یہاں سے بھاگ جاؤ جلدی۔''

جیسے ہی ٹونی وہاں سے ہٹا مارشل کی کار ایک بار پھر اس کی گاڑی سے ٹکرائی۔ اس بار کنور نیبل کا پچھلا حصہ اوپر اٹھا اور اسپورٹس کار اس کے نیچے دب گئی۔ چارلس کی دائیں ٹانگ میں درد کی شدید لہر ابھری اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ ٹونی نے مارشل کی کار کے گرد ایک چکر لگایا اور بولا۔

''میرا خیال ہے کہ مسٹر مارشل مر چکے ہیں۔''

مارشل کیس کٹ کمپنی کا مالک اسٹیئرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ٹونی نے جھانک کر دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا بیگ نکل گیا تھا اور اس میں ایک پائپ رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی لمحے مارشل کراہا اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

تین پولیس والوں نے اس کی تباہ شدہ کار کو گھیرے میں لے لیا۔ انہیں دیکھ کر چارلس نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا جبکہ دوسرا ہاتھ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے جگمگانے لگے اور پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

وہ اسپتال کے بستر پر لیٹا اپنے جسم کے مختلف حصوں کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کے زخم بھرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ٹونی اس سے ملنے آیا تو اس کے ساتھ رشونا بھی وہیل چیئر پر بیٹھی دکھائی دی۔

ٹونی نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یقیناً اس کے آنے کی امید نہیں ہوگی؟''

رشونا نے اپنی کرسی اس کے بستر کے قریب کی۔ اس کی ٹانگ پر چڑھے ہوئے پلاستر کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تمہاری بہادری پر فخر ہے۔''

''یہ سب ٹونی کا کیا دھرا ہے۔'' چارلس نے کہا۔

''میں تو ویندر کے کہنے پر عمل کرنے والا تھا۔''

''سارا ملبا مجھ پر مت ڈالو۔'' ٹونی بولا۔ ''سراغ رساں ویندر نے ہم دونوں پر پولیس کے کام میں مداخلت کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔''

رشونا نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے مارشل اور اس کی بیوی کو میوزیم میں دیکھا ہے۔ اس کے پاس سب کچھ تھا پھر اس نے ایلس کو قتل کیوں کیا؟''

''ہماری مرحومہ ساتھی کو ڈھنڈورا پیٹنے کی عادت تھی۔'' چارلس نے کہا۔ ''اگر وہ مارشل سے خاموش رہنے کا وعدہ کر لیتی تب بھی اسے یقین نہ آتا۔ وہ جانتا تھا کہ بالآخر وہ اس کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔''

''اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ اپنے جرم کو چھپا سکے گا؟'' رشونا نے پوچھا۔

''کیونکہ پولیس دوسرے لوگوں پر شبہ ظاہر کر رہی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مارشل کے پاس اسے قتل کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔''

''لیکن تم یہ بات جانتے تھے۔'' ٹونی نے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ پولیس بالآخر اس کا سراغ لگا لے گی۔''

''ناممکن۔'' ٹونی نے کہا۔ ''مسٹر مارشل نے ایلس کا بیج میرے تھیلے میں رکھ کر مجھے پھنسانے کی کوشش کی۔ اگر ہم اس کا تعاقب نہ کرتے تو وہ آلۂ قتل کہیں پھینک دیتا۔''

''مجھے مارشل کا پیچھا کرنے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے البتہ ایک بات کا افسوس ہے۔'' وہ رشونا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''میں آئندہ مہینے تصویروں کی نمائش کی افتتاحی تقریب میں نہیں جا سکوں گا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ٹونی نے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری وہیل چیئر گھسیٹ کر نہیں لے جا سکتا؟''

''میں نے تمہاری ڈرائیونگ دیکھی ہے۔'' چارلس نے ٹونی سے کہا لیکن اس کی نظریں بدستور رشونا پر تھیں جو ان دونوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''بے فکر رہو، میں احتیاط کروں گا۔'' ٹونی نے کہا اور رشونا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری خوشی کی خاطر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

رشونا اس کا اشارہ سمجھ کر جھینپ گئی اور اس نے اپنے تاثرات چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

شکارگاہ

جمال دستی

وہ ایک تجربہ کار شکاری تھا... اس کا ریکارڈ بے داغ تھا... شکار اس کا شوق نہیں بلکہ حصولِ زر کا ذریعہ تھا... شکاری مہم نے اسے ایک دل ربا کا اسیر بنا دیا... اور اس کی رفاقت نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کا ڈھب تبدیل کر لے... مگر اس کے فیصلے سے پہلے قسمت اپنا فیصلہ سنا چکی تھی...

ہم پیشہ... ہم خیال جوڑے کی ہمراہی میں زینہ بہ زینہ عبور کرتے جرم کے مراحل

سیاہ گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس روز طلوعِ سحر کے وقت بھی بارش ہوئی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ بادل زمین سے آن ملیں گے۔ فضا میں حد درجے خنکی تھی۔

مختلف ڈیزائن کے پھولوں کے ہار بیشتر قبروں پر سے بکھر چکے تھے۔

دلسن کے گہرے رنگ کے ٹاپ کوٹ کے کالر کھڑے تھے۔ سیاہ ہیٹ کا کنارہ سردی کے خلاف مزاحمت کے لیے پیشانی پر جھکا ہوا تھا۔ موسم پریشان کن تھا۔ تاہم روشن دنوں میں بھی قبرستان کو خوشگوار جگہوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

انسانی ذہن جرم کی راہ پر چل پڑے تو نت نئے منصوبے بناتا ہے۔ دلسن کا انداز بھی انوکھا تھا۔ قبرستان اس کی شکارگاہ تھے۔

اپنی تریسٹھ سالہ زندگی میں وہ چالیس بیویوں کو آسودۂ خاک کر چکا تھا۔ وہ قبرستان کا کھلاڑی تھا۔ وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.READERS.PK

کے ساتھ اس کی مہارت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

بفیلو سے پرے ماؤنٹ گیلوری، سینٹ لوئیس اوک، گرووہ، سان ڈیاگو، ال کمپنو اور مزید کئی درجن قبرستان اس کے مجرمانہ کھیل کے میدان تھے۔

یہ اس کا کاروبار تھا۔ جس سے اس نے ناقابل یقین حد تک ہمیشہ مثبت نتائج حاصل کیے تھے۔ ولسن قاتل ہونے کے باوجود بے حس نہیں تھا۔ یہ کچھ عجیب اور ناقابل وضاحت سی بات ہے۔

ہاتھوں میں داستانوں کے ساتھ آبنوسی واکنگ اسٹک... اسٹک کا بالائی بیضوی سرا چاندی کا تھا۔ ممکن ہے چاندی نہ ہو محض چاندی جیسا ہو۔ بہرحال یہ چھڑی اس کے وجود کا جزو لاینفک تھا۔ جیسے کوئی تیسرا ہاتھ ہو۔ یہ تیسرا ہاتھ 30 برس سے اس کے وجود کا حصہ تھا۔ اس نقرئی سر والی چھڑی کے بغیر وہ باہر نہیں نکلتا تھا۔ چھڑی اکثر اس کے ہاتھ میں دائرے کی شکل میں گردش کرتی نظر آتی تھی۔ شاید اسے مزہ آتا تھا یا اس کی عادت تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھڑی کو بطور سہارا استعمال کرنے کے بجائے کسی زیور کی طرح ساتھ رکھتا ہے۔

☆☆☆

وہ قبرستان کی پختہ روشوں پر پُرسکون انداز میں متحرک تھا۔ کبھی کسی قبر کے نزدیک احترام سے کھڑا ہو جاتا لیکن اس کی نگاہ بدستور اس عورت کا جائزہ لے رہی تھی جو ایک تازہ قبر کے پاس موجود تھی۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ قد پانچ فٹ دو انچ ہوگا اور وزن 130 پونڈ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے گیسو طویل اور سیاہ رنگ کے تھے۔ کہیں سفید تار سیاہ بادلوں میں بجلی کی طرح چمکتا نظر آجاتا تھا۔

پچاس گز کے فاصلے سے بھی ولسن بخوبی تمام تر جزئیات کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ ایک تیز نگاہ شخص تھا۔ آبنوسی چھڑی غیر اضطراری طور پر اس وقت بھی اس کے پہلو کے خلا میں عمودی دائرے بنا رہی تھی۔

وہ عورت اس ہفتے چوتھی بار وہاں نظر آئی تھی۔ وہ ہمیشہ اکیلی آتی تھی۔ اس کے وہاں آنے کا مقصد ابھی تک غیر واضح تھا۔ کبھی وہ کسی قبر کے قریب ایستادہ ہو جاتی اور جسم کا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتی رہتی۔ کبھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مردہ گھاس پھوس کو جڑ سے اکھاڑنے لگتی۔

ولسن نے جب اسے دوسری بار وہاں دیکھا... تو وہ اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک وہ رخصت نہ ہو گئی۔ بعد ازاں وہ اس قبر تک گیا جہاں وہ کھڑی رہی تھی۔

وہ قبر ابھی تک بے نام و نشان تھی۔ ولسن کو یقین تھا کہ عورت کا شوہر وہیں مدفون ہے۔ ولسن نے عورت کی کئی حرکتیں نوٹ کیں جو اس کے سوگوار پن کے ساتھ اس کی پریشانی کو بھی ظاہر کرتی تھیں۔

شوہر کے انتقال نے یقیناً اس کی زندگی میں خلا پیدا کر دیا تھا۔ ورنہ اس نے ایسی بیوہ خواتین بھی دیکھی تھیں جو ایک آدھ ہار سے زیادہ قبر پر نہیں آتی تھیں۔ عموماً ایسی عورتیں بے اولاد ہوتی تھیں اور شوہر سے جان چھوٹنے پر مطمئن نظر آتی تھیں۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو ولسن کو ایسی خواتین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی وہ قبرستان آنے والی کم عمر عورتوں کو دیکھتا تھا۔

ولسن برسوں سے جس منصوبے پر عمل پیرا تھا اس کے لیے یہ چالیس سالہ خاتون بالکل فٹ نظر آرہی تھی۔ جو سات دنوں میں چوتھی بار وہاں آئی تھی۔

ولسن بھی اپنی تھیوری کی صحت پر سو فیصد پُریقین نہیں رہا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ ایسی تھیوری نے نہ صرف اسے دولت مند بنا دیا تھا بلکہ وہ کبھی فیل بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی بات اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اتنے عرصے میں وہ بہت زیادہ رواں ہو گیا تھا۔ اس کے اندازے ننانوے فیصد ٹھیک نکلتے تھے۔

وہ پُراعتماد تھا اور اپنا کام صبر و سکون سے کرتا تھا۔ عجلت پسندی اور جلد بازی سے جیسے الفاظ اس کی لغت میں نہیں تھے۔

چالیس سال پہلے اس نے جب پہلا قتل کیا تھا تو اخبارات کے اشتہارات سے استفادہ کیا تھا۔ جلد ہی اس نے یہ طریقہ کار ترک کر دیا۔ اس میں خطرہ بھی تھا اور دیگر جرائم پیشہ افراد سے مقابلہ بھی درپیش تھا جو رسالوں اور اخبارات کے ذریعے اپنا شکار ڈھونڈتے تھے۔

چنانچہ ولسن نے کوئی دوسرا راستہ نکالنے کے لیے سوچ بچار شروع کر دی۔ اس کا دوسرا طریقہ کار اتفاقاً ہی اسے مل گیا جب وہ ایک تربیتی اجتماع میں شریک تھا۔ وہ جس گھر میں کرائے پر مقیم تھا وہاں سے چرچ بھی نزدیک تھا۔ ایک ماہ کی مدت میں اس کا تعارف نصف درجن کے قریب بیوہ عورتوں سے ہوا اور اس سے دگنی تعداد ایسی عمر رسیدہ عورتوں کی تھی جو اب تک غیر شادی شدہ تھیں۔ وہ خود غیر شادی شدہ مرد کی حیثیت سے سامنے

عورتوں میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔

ولسن کو دولت مند عورت منتخب کرنی تھی یا ایسی بیوہ عورت جس نے شوہر کا انشورنس وصول کر لیا ہو اور انشورنس کی رقم خرچ نہ کی ہو۔ ولسن اپنی منتخب کردہ عورت سے بڑی ہوشیاری سے شادی کرتا اور اس کی بھی انشورنس کروا دیتا۔ اسے ہر دفعہ نیا نام استعمال کرنا پڑتا تھا تکمیل وصول کرنے کے لیے۔ تاہم جیسے جیسے الیکٹرونکس اور کمپیوٹرز کا عمل دخل بڑھ رہا تھا ویسے ویسے بار بار کام اور علاقہ تبدیل کرنا خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے چرچ پر انحصار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا میدان عمل یا شکارگاہ قبرستان تک محدود تھے۔

اس کے ذہن نے ایک نئی اختراع تلاش کی جس کی بنیاد دلاسے یا شارٹ کٹ سے احتراز تھا۔ عموماً وہ جن عورتوں کو رجھا کر شادی کرتا تھا، ان میں سے بیشتر کی اپنی انشورنس ہوتی تھی۔ ولسن اپنی دیانت داری، الفت اور خود انحصاری کا یقین دلانے کے لیے پہلا کام یہ کرتا کہ نئی بیوی کو قائل کر لیتا کہ وہ اپنی انشورنس کسی خیراتی ادارے کے نام کر دے یا پھر کسی قریبی ضرورت مند رشتے دار کے نام۔ اس طرح وہ نہایت آسانی سے قتل کے بعد شکوک و شبہات سے صاف بچ نکلتا۔ باقی کی تمام جائداد، اسٹاکس یا کیش وہ سب اس کی جیب میں جاتا۔ وہ اپنی اس پالیسی سے خوش تھا۔

☆☆☆

وہ عورت قبر کے نزدیک موجود تھی۔ اس کے شانے سیدھے تھے۔ ہینڈ بیگ پر گرفت مضبوط تھی۔ ولسن متحیر تھا کہ وہ آخر کتنی دیر وہاں کھڑی رہے گی جبکہ ٹھنڈ ولسن کی ہڈیوں میں اتر تھی۔ آسودگی اور محتاط لائف اسٹائل کے باعث اس کی صحت اچھی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ تریسٹھ سال کا ہوگا۔

آج اس نے پہلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جیسے ہی رخ بدل کر اجنبی عورت کی جانب چلا عین اسی وقت اس نے بھی رخ بدلا۔ ولسن نے اندازہ لگایا کہ باہر جانے کے لیے ان دونوں کو جس گراسنگ سے گزرنا ہے... دونوں قریب قریب ایک ساتھ ہی وہاں پہنچیں گے یعنی مڈبھیڑ کا وقت آن پہنچا تھا۔

عورت، ولسن کو قریب دیکھ کر حیرت زدہ دکھائی دی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر ولسن پر ڈالی اور بہ عجلت اس سے دور ہونے کی کوشش کی۔

رت نہیں ہے۔" اس کی آواز میں مخصوص مٹھاس اور نرمی تھی۔ جس میں شائستگی کا عنصر گہرا تھا۔ اس کی آواز عورتوں کو پُرسکون کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔

"میں اپنی مرحومہ بیوی کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔"

عورت نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا تاہم اس نے اپنی رفتار بڑھانے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ وہ بیرونی گیٹ تک پہنچے تو اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میرا خاوند یہاں مدفون ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکلتی چلی گئی۔

ولسن اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ مطمئن تھا کہ پہلی مڈبھیڑ اس کے حساب سے ٹھیک رہی تھی۔ صرف ایک چیز غیر معمولی تھی وہ عورت ولسن کی توقع سے کہیں زیادہ پُرکشش تھی۔ طویل عرصے بعد کسی عورت نے اسے اپنی کشش اور دلکش نقوش سے متاثر کیا تھا۔ دوسری اہم چیز عورت کا لباس، کوٹ، جوتے اور ہینڈ بیگ تھا۔ یہ اشیا بیش قیمت برانڈ سے تعلق رکھتی تھیں۔

اگرچہ ولسن نے اس کے ملبوسات کی نفاست اور قیمت کو دوسرے دن ہی دور سے محسوس کر لیا تھا تاہم قریب سے اس نے زیادہ بہتر تخمینہ لگایا۔ ولسن کے تجربہ کار خیالات بتا رہے تھے کہ عورت بیوگی سے بیشتر پُرآسائش زندگی کی عادی تھی اور یہ معیار بیوگی کے تجربے سے گزرنے کے بعد بھی برقرار تھا۔

یعنی دو ہی باتیں ممکن تھیں کہ وہ کسی اچھی ملازمت سے وابستہ تھی یا پھر مرحوم خاوند کی انشورنس سے معیار زندگی کو برقرار رکھا ہوا تھا۔

اگلے روز ولسن نے چند اور الفاظ کا تبادلہ کیا جس میں دونوں کے نام بھی شامل تھے۔ وہ مسز الزبتھ آئر تھی اور اس کے شوہر کا انتقال ایک ماہ قبل ہوا تھا۔ ولسن کا حساب کتاب ٹھیک جا رہا تھا۔

ایک ہفتے کے اندر ہمیشہ کی طرح وہ الزبتھ سے راہ و رسم بڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔ علاوہ ازیں اس نے بس اور ٹیکسی کو ترک کر کے اپنی ذاتی خوب صورت سیڈان پر سفر شروع کر دیا۔ عام طور پر وہ اپنی کار سامنے نہیں لاتا تھا۔

آخر ایک روز اس نے الزبتھ کو لنچ پر مدعو کر ڈالا۔ حسب توقع الزبتھ نے اس کی پیشکش قبول کر لی۔ بعد ازاں ولسن کی کارکردگی میں تیزی آتی چلی گئی۔ وہ بہت پُراعتماد تھا۔

دونوں اب مسٹر ولسن تھے نہ مسز آئر بلکہ ان کی شناخت ول اور لارا تھی۔ اس سے پہلے ولسن کا واسطہ ایسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

لحہ اگیز عورت سے نہیں پڑا تھا۔ اس کی گفتگو، چال ڈھال اور ناز و انداز سب کچھ ولسن کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کے لیے تھے۔

جس دن ولسن نے اس کا نرم ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''لارا، میں تم سے شدید پیار کرتا ہوں اور خود کو یہ کہنے سے روک نہیں سکتا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کے کہے گئے ہر لفظ سے چاہت اور سچائی کا بھرپور اظہار ہو رہا تھا۔ ماضی میں ہمیشہ ہی ایسا ہوتا آیا تھا اس معاملے میں وہ چوٹی کا اداکار تھا۔

دونوں ہی اکیلے تھے۔ نہ دوست، نہ کوئی رشتے دار محض چند شناسا تھے۔ برسوں سے کھیلے جانے والا محبت بھرا خونی ڈراما ایک بار پھر تیاری کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

ولسن کی تکنیک اپنی جگہ لیکن بہرحال وہ قسمت کا بھی دھنی تھا۔ دونوں باتوں نے مل کر اسے ایک ماہر شکاری کے روپ میں ڈھال دیا تھا۔

شادی میں تاخیر کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نہ لارا نے ایسی کوئی تجویز دی البتہ ولسن نے علاقے کی تبدیلی کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح وہ اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور ہنی مون بھی نئے گھر میں بنائیں گے۔

''بیوی کی جگہ وہ ہے جہاں اس کا شوہر چاہتا ہے۔'' لارا نے جواب کے ساتھ چاہت سے ولسن کو چوما۔

☆☆☆

ولسن کے لیے ہنی مون کی گھڑیاں نشاط انگیز ثابت ہوئیں۔ اس نے قیام کے لیے ایک نواحی علاقہ چنا تھا۔ وہ کسی تربیت یافتہ میڈیکل ایگزامنر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا کوئی بھی میڈیکل ایگزامنر مخصوص زہر خورانی سے ہونے والے مہلک حملہ قلب کی وجہ دریافت کر سکتا تھا۔

اگرچہ بعض اوقات اسے ماہر میڈیکل ایگزامنر کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ تاہم ایسے علاقوں میں وہ طریقۂ واردات بدل دیتا تھا اور نہایت احتیاط سے قتل کو حادثے کا روپ دینے کے لیے اسے خاصی محنت درکار ہوتی تھی۔

اس مرتبہ اپنے شکار کے ساتھ جو جسمانی اور ذہنی وقت گزر رہا تھا وہ آئیڈیل تھا۔ پہلی بار اسے تدفین کے بجائے بیوی کا خیال آیا۔ لارا میں ہر وہ خوبی تھی جس کی آرزو کوئی مرد کر سکتا تھا۔ کھانا تیار کرنے میں وہ کسی شیف کی طرح تھی۔ قیام گاہ کو وہ جتنا صاف ستھرا رکھتی اتنا ہی خیال وہ ولسن اور اپنا رکھتی تھی۔ شب بسری میں اس کی خود سپردگی ولسن پر جادو کی طرح اثر انداز ہوتی۔ وہ کسی بات پر ولسن سے اختلاف نہیں کرتی تھی۔

ولسن کو خیال آتا کہ وہ تریسٹھ سال سے تجاوز کر چکا ہے۔ اس کے پاس خوشگوار زندگی گزارنے کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ سوائے ایک آئیڈیل ہم سفر کے۔ وہ لارا کی ہمراہی میں جو مسرت محسوس کرتا، اس سے آدھی خوشی بھی اسے اگر اپنی پہلی بیوی سے ملی ہوتی تو آج وہ ایک نارمل آدمی کی طرح گھریلو زندگی بسر کر رہا ہوتا۔

دو ماہ گزر گئے تھے اور ولسن کے خیالات میں تبدیلی جڑ پکڑ رہی تھی۔ تیسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ وہ ایک نئے فیصلے کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔

لارا نے اس کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ایسی باوفا اور شوہر پرست بیوی کسی بھی صورت میں قبرستان پہنچائے جانے کی سزاوار نہیں تھی۔ وہ دل میں بسائے جانے کے قابل تھی۔ اس کے شب و روز کا ہر لمحہ ولسن کے آرام اور دل جوئی کا خیال رکھنے میں صرف ہو رہا تھا۔ ولسن سوچ رہا تھا کہ لارا کے ساتھ وہ اپنی بقیہ زندگی بہت آرام و سکون سے گزار سکے گا۔ کسی نئی تدفین کا بندوبست کیے بغیر۔

حسب معمول ایک رات گارنیچ ٹن گھر سے باہر رکھنے کے لیے وہ احتیاط سے عقبی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ نیم اندھیرا تھا۔ اس کا دھیان اپنی خوابیدہ چاہت کی طرف تھا کہ کہیں وہ بیدار نہ ہو جائے۔ اس نے آخری سیڑھی طے کی تو اس کا قدم وہاں رکھے بچوں کے رولر اسکیٹ پر پڑا۔ رولر اسکیٹ کس نے رکھا، کہاں سے آیا؟ بہرحال وہ بری طرح پھسلا۔ قدموں کا رشتہ زمین سے منقطع ہو گیا۔ کچرے کا ڈبا ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بازو اطراف میں پھیل گئے وہ پیچھے کی جانب دھڑام سے گرا سر کنکریٹ کے پختہ قدچے سے ٹکرایا اور اس کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہونے سے پہلے ہی حلق میں دم توڑ گئی۔ سوچنے سمجھنے کا ایک لمحہ بھی اس کے ہاتھ نہ آیا۔

☆☆☆

لارا، ولسن کی قبر پر اُداس کھڑی تھی۔ اسے قبرستانوں سے نفرت تھی پھر بھی اسے وہاں آنا پڑتا تھا کیونکہ اٹھارہ سال سے قبرستان اس کے لیے شکار گاہ کا کام دے رہے تھے۔ اس دوران میں وہ پندرہ شوہروں کو زیر خاک پہنچا چکی تھی۔ قبرستانوں سے

بدمعاملہ

بشریٰ امجد

معمول سے ہٹ کے کام کی انجام دہی کے لیے غیر معمولی دلیری کی ضرورت ہوتی ہے... اس نے بھی ٹھان لیا تھا کہ ہر صورت اسے اختتام تک پہنچانا ہے... دانائی... ہمت اور ارادے کو ناقابل تسخیر سمجھنے والے شخص کا المیہ... ایک ہی ضرب نے اس کے تمام اقدامات کو مسمار کر دیا...

مخلص دوستوں کی سنگت... جو نفسیاتی گرہوں کو سلجھانے کا ہنر رکھتے تھے...

موت بھی رنگ بدل بدل کر آتی ہے۔ کب، کہاں اور کیسے... کچھ پتا نہیں۔ تاہم کسی نہ کسی بہانے ساتھ لے ہی جاتی ہے... یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی ذی روح کو مفر نہیں۔ نہ عمر کی کوئی قید ہے۔ تدفین کا عمل ایک ناخوشگوار مرحلہ ہے... تاہم یہ مرحلہ کبھی بڑے میکانکی اور پُرجوش انداز میں مکمل ہو جاتا ہے... چہرے سوگوار دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقی غم بہت کم چہروں پر ہوتا ہے۔ گلوریا کی موت بھی عجیب اور اچانک تھی۔

میرے چہرے پر بھی رنج کی گہری لکیریں تھیں۔ کیونکہ میں گلوریا کا شوہر جو ٹھہرا۔ قبرستان میں، ٹیلی ویژن انڈسٹری کے افراد میری توقعات سے بڑھ کر شریک ہوئے وارد

م وہ

پرندوں کی طرح ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں روشن اور چمکیلی تھیں۔ جن میں سوال اور تجسس تھا۔ مجھے لگا کہ اکثریت نے گلوریا کی موت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ ان کی نہ ختم ہونے والی گفتگو اور سرگوشیاں، ناقابل فہم پرندوں کی آوازوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ نہ صرف متجسس تھے بلکہ ان کا انداز تفتیشی تھا۔ اس انداز نے انڈسٹری کے بعض آفیشلز کو متعجب بھی کیا۔

☆☆☆

تدفین کے بعد میں نے ضروری معاملات نمٹائے۔ وکیل کے دیے ہوئے کچھ کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔ گلوریا کے معاملات اور تعلقات میری توقع سے بڑھ کر نکلے تھے۔ اس نے انڈسٹری میں وسیع پیمانے پر ماہرانہ انداز میں سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ جبکہ میرے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مالی معاملات ابھی حالت میں تھے۔ برنارڈ نے کوئی دسویں مرتبہ مجھ سے اظہارِ تعزیت کیا۔ میں نے بے ہاؤس بند کیا اور جزائر کی جانب پرواز کر گیا۔

ہیلن نے پُرتپاک انداز میں محبت سے میرا استقبال کیا۔ وہ ایک اوسط قد کی سادہ سی عورت تھی، مجھ سے عمر میں دو سال بڑی تھی۔ تاہم خاصی دولت مند تھی۔

گلوریا کی ناگہانی موت اور تدفین کے ہنگامے کے دوران میں وہ آرام کرتی رہی تھی۔ سادہ اور بڑی ہونے کے باوجود اس کا جسم متناسب تھا۔ ہماری ملاقاتیں کئی ہفتے سے جاری تھیں۔ اسی دوران میں اس نے کئی بار ہچکچاتے ہوئے مجھے شادی کے اشارے دیے تھے۔ لیکن گلوریا کی وسیع جائداد کی وجہ سے میں ہیلن کے معاملے میں شادی کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

ہم دونوں کی لاس اینجلس واپسی ایک دوسرے کی ہمراہی میں ہوئی۔ وہاں ہوٹل میں متصل کمروں میں مقیم ہوئے اور چند روز بعد گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ وہ نیویارک چلی گئی جہاں اسے اپنی جائداد کے معاملات دیکھنے تھے اور بچوں سے ملنا تھا پھر اسے سان فرانسسکو واپس آنا تھا تاکہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہ رہے۔

میں واپس بے ہاؤس چلا آیا اور ایک اچھے بروکر سے رابطہ کیا۔ یہ ایک قیمتی اور شاندار مکان تھا جو چٹانوں کی بلندی پر تعمیر تھا۔

مکان میں مکمل سناٹا تھا۔ تنہائی کے باعث میں یہاں نامعلوم سی بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ میں کشادہ اسٹوڈیو میں آ گیا جو کبھی گلوریا اور میں نے مل کر ڈیزائن کیا تھا۔

میں نے پانچ دن وہاں تنہائی میں گزارے... گلوریا کی یاد نے مجھے پُرسکون نیند سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ پانچ دن بعد ایک پست قد، گندا سا اجنبی، دوپہر کے وقت وہاں پہنچا۔ وہ جس گاڑی میں آیا تھا وہ بھی اسی کی طرح مجہول سی تھی۔

''مسٹر فلیچر؟'' اس نے استفہامی نظر سے مجھے دیکھا۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے جواب دیا اور اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کی۔

''مسٹر فلیچر! مجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔'' وہ بولا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں نیلا اینوکپ ہے۔ اس کے پاس سے پسینے کی بو بھی آ رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کچھ دکھانا چاہتا ہے۔ اس کا رویہ معقول تھا، تاہم وہ کچھ نروس لگ رہا تھا۔ اچانک اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی لیکن یہ کوئی معمول کی خوشگوار مسکراہٹ نہیں تھی۔ مجھے یہ مسکراہٹ کافی بدنما لگی۔

معاً مجھے خطرے کا نامعلوم احساس ہوا اور ذہن میں گھنٹی بجنے لگی۔ میں ہچکچاہٹ کے عالم میں اسے اسٹوڈیو میں لے آیا۔ میں خاموش تھا۔

وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''ہم دونوں مل کر یہ آسانی یہ کام کر سکتے ہیں۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ امید ہے آپ میرے بارے میں منفی اندازے نہیں لگائیں گے۔ ہم دونوں اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔''

اس قسم اور اس سے ملتی جلتی صورتِ حال سے متعلق اپنے حصے کے ڈراؤنے خواب میں پہلے ہی کافی دیکھ چکا تھا۔ میں نے جب زبان کھولی تو مجھے اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

''میں بالکل نہیں جانتا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو... اور کیا بات کر رہے ہو؟''

اس نے ہاتھ میں موجود لفافہ میز پر رکھ دیا۔ یہ لفافہ عام لفافوں کی نسبت بڑے سائز کا تھا اور شروع سے میری آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔

''میں اسسٹنٹ منیجر ہوں، تھرفٹی کوئیک۔'' اس نے کھلنا شروع کیا۔ میرا ہمنوتی ڈاکٹر ہے۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ ادھر سامنے کی جانب۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ میری دھڑکنوں کی رفتار اعتدال سے ہٹنے لگی۔ میں میز پر پڑے لفافے سے نگاہیں چرا رہا تھا۔

''کہر کی وجہ سے آج وہ گھر تمہیں نظر نہیں آئے گا۔ میں اپریل میں یہاں آیا تھا اور اپنی بہن کے گھر ٹھہر گیا۔ وہ مجھے خبطی کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے فوٹوگرافی کا جنون ہے... اس لت نے مجھے مالی بدحالی میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ ایک مہنگا شوق ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' تھرفٹی کوئیک نے سوال کیا۔

میں اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا اور سمجھ رہا تھا کہ آگے وہ کیا بات کرنے والا ہے لیکن میں نے بددلی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مسٹر فلیچر اس وقت میں نکون (NIKON) سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے پاس ٹرائی پوڈ اور مختلف اڈاپٹرز... نیز 35 ملی میٹر کے دور مار عدسوں کے لوازمات بھی ہیں۔ مجھے اس وقت F22 اور 1600 ملی میٹر کی ضرورت تھی اور میں ٹرائی ایکس (TRI-X) استعمال کر رہا تھا۔ یقیناً آپ کے لیے یہ ٹیکنیکل امور بے معنی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ دس اپر

ہوا بھی خاصی دھیمی تھی۔ تیز ہوا عدسوں کے لیے ٹھیک نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں تصویر دھندلا جاتی ہے۔ میرے اندر کا فوٹوگرافر مچل رہا تھا۔ میں کیمرے اور عدسوں کی مدد سے نئے تجربات کرنا چاہتا تھا۔'' وہ بولتا رہا۔ میں نے پسینے کی نمی گردن پر محسوس کی۔

میں بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ میں کسی فلم کا اسکرپٹ سن رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ چوہا، حادثاتی طور پر واردات میں ''شاہد'' کی حیثیت سے ملوث ہو چکا ہے اور بہت جلد رقم کا مطالبہ کرنے والا ہے۔ میں جان گیا تھا کہ میز پر پڑے لفافے میں کیا ہو سکتا ہے۔ میرے لیے مثبت پہلو یہی تھا کہ وہ ابھی پولیس تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کے انداز گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس نے اپنی معاشی بدحالی کا ذومعنی اشارہ بھی قصداً دیا ہوگا۔ میں نے قطعیت کے ساتھ سوچا۔ ظاہر ہے ایسے لوگ پولیس کے بجائے اپنے شکار کی طرف جاتے ہیں۔

اب میں اس کی بات سننے سے زیادہ اپنے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے پاس دو ہی امکان تھے۔ پہلا، رقم سے اس کا منہ بند کر دوں۔ دوسرا، گلا دبا کر اس کی آنکھ بند کر دوں۔ دوسرا آپشن تو میں نے فوراً ہی مسترد کر دیا۔ ایسا سوچنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلانے والی بات تھی۔ اس کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ تصویر کشی کا کوئی جنونی نہیں بلکہ ہیشہ ورلیک میلر تھا جو یقیناً پوری منصوبہ بندی سے آیا تھا۔ اس کو ختم کرنے کا مطلب، میری کہانی بھی فی الفور ختم ہو جاتی۔

میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ پہلا آپشن استعمال کرنے کی صورت میں بھی مجھے صرف عارضی مہلت ملے گی۔ اس کا آنا جانا لگا رہے گا۔ تاہم عارضی مہلت بھی غنیمت تھی اور اسی مہلت کے دوران میں مجھے مستقل حل تلاش کرنا تھا۔

''مسٹر فلیچر! آپ سن رہے ہیں؟'' کوئیک نے سوال کیا۔

''ہاں، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے خیالات کے گرداب سے نکل کر دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔

''ہاں... تو میں کافی فاصلے پر اپنے مطلوبہ منظر کو تلاش کر کے فوکس کر رہا تھا۔ اس دوران میں نے کئی شاٹ بھی لیے۔ میں ایکسپوژر ٹائم ساتھ ہی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ یہ کتنا ضروری ہے۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے بیزاری ظاہر کی۔

''خیر، کوئی بات نہیں۔'' کوئیک نے کہا۔ اگرچہ وہ شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ تاہم حرص کی چمک اس کی آنکھوں میں [illegible]

آگے بڑھاؤں گا۔ مرحومہ... نن... نہیں، میرا مطلب ہے کہ ''مقتولہ'' ریکارڈ پر یہاں اکیلی تھی...''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میری آواز بلند تھی لیکن اپنی آواز کا کھوکھلا پن میں نے بھی محسوس کیا اور ایک اچٹتی نظر میز پر پڑے لفافے پر ڈالی۔

''پلیز مسٹر فلیچر!'' اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ مجھے بات مکمل کرنے دیں۔''

میں خاموش رہا۔ وہ پھر گویا ہوا۔ ''ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے تو ہم دونوں کی مشکل آسان ہو جائے گی۔''

اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی بیگم یہاں اکیلی تھیں اور آپ نے اپنی حاضری کہیں اور ثابت کی تھی جبکہ ایسا نہیں تھا اور آپ بھی یہیں تھے۔'' اس نے توقف کیا۔ میں نے اشتعال محسوس کیا لیکن ضبط کر گیا۔

''پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ کسی متحرک چیز کو دور سے فوکس کرنے کا تجربہ کروں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک وزنی گالی اس کی نذر کی...

''پھر میری متلاشی نظروں نے ایک عجیب منظر ڈھونڈ نکالا... میں دنگ رہ گیا بلکہ خوف زدہ ہو گیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے جبڑے بھینچ کر ایک اور گالی اس کی شان میں تخلیق کی۔ ساتھ ہی اپنی قسمت کو بھی کوسا۔

''یہ دیکھیں، میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' اس نے لفافے میں سے ایک تصویر منتخب کی۔ ''کتنا صاف پرنٹ ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ کم از کم اس تصویر کے لیے مجھے آپ سے معذرت کرنی چاہیے۔ یہ 16 بائی 20 (16×20) ہے اور 35 ملی میٹر کے حساب سے، غیر موزوں سائز ہے... جبکہ قضا میں ہلکی دھند بھی موجود ہے... پھر بھی اس کی کوالٹی ملاحظہ کیجیے۔''

میں تصویر کے بجائے براہِ راست اسے گھور رہا تھا۔ میرا احساسِ جرم مجھے تصویر دیکھنے سے روک رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تصویر میں کیا ہوگا۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ بس دم باقی تھی۔

دھند میری آنکھوں میں اترنے لگی۔

''پلیز، مسٹر فلیچر! دیکھیں میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں، یہ محض ایک اتفاق تھا۔ آپ تصویر کا معیار تو دیکھیں۔''

میں نے دھندلی نظر بلیک اینڈ وائٹ پرنٹ پر ڈالی۔ جہاں میں ریلنگ سے نیچے گلوریا کو گہرائی میں چٹانوں کی جانب گرتے دیکھ رہا تھا... اس خبیث نے وہ نازک اور مختصر لمحہ کامیابی سے کیچ کر لیا تھا۔ گلوریا سر کے بل

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے جارہی تھی... اس کا لباس اور زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ تصویر میری دھندلی نگاہ کے سامنے جھلملا رہی تھی۔ ایسی صورت میں، میں خود کو یا گلوریا کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ نہ پہچاننے کی ضرورت تھی کیونکہ اس حالت میں بھی ''بے ہاؤس'' کی عقبی سنگی دیوار کا انوکھا ڈیزائن قطعی واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے بھی میں تصویر سے زیادہ اس لمحے کی یادوں میں کھویا ہوا تھا... مگر جب گرتی ہوئی گلوریا کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ان گنت سوال ناچ رہے تھے، وہی سوالات مجسم ہوکر عجیب عجیب شکلوں کی صورت میں دوبارہ نمودار ہو گئے۔ وہ تصویر اور میری دھندلی نظروں کے مابین حائل تھے۔

تصویر یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ گلوریا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا اور نہ وہ خود سے کودی تھی۔ نیز اس وقت نہ صرف عمارت میں موجود تھا بلکہ... اس سے آگے میں نے سوچنا بند کردیا۔ کونیک نے تصویر واپس لفافے میں رکھ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ لفافے میں اور بھی تصاویر ہیں۔

میں نے رومال کی مدد سے آنکھوں کی دھند صاف کی اور براہ راست کونیک کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ فوراً بولا۔ ''میں نے نیگیٹو ایک خط کے ساتھ محفوظ جگہ پر رکھ دیے ہیں۔''

''ظاہر ہے۔ ورنہ میں تمہیں بھی اب تک اٹھا کر گہرائی میں پھینک چکا ہوتا۔'' میں نے زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے بتایا تھا نا کہ اس علت نما شوق نے میری حالت کافی بوسیدہ کردی ہے...''

''بس... بس...'' میں نے اسے روکا۔ ''مطلب کی بات کرو۔''

''آپ شاید مجھے بلیک میلر سمجھ رہے ہیں۔ ایسا ہوتا تو میں زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کی کوشش کرتا جبکہ میں تو صرف زندگی کو ذرا سہل کرنا چاہتا ہوں۔''

''تصاویر کے بدلے تمہیں کیا چاہیے؟'' میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ میرا اعتماد واپس آرہا تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ بعدازاں مجھے اس نئے مسئلے کا کوئی مستقل اور شافی حل تلاش کرنا پڑے گا۔

''مسٹر فلیچر!'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''میں نے سوچ کر ایسا حل نکالا ہے کہ ہم دونوں کی مشکل آسان ہوجائے گی۔ میں کوئی لالچی شخص نہیں ہوں۔ میں آپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ بس مجھے تھوڑی سہولت درکار ہے۔ مجھے ایک بہتر اپارٹمنٹ کی ضرورت ہے... کچھ عدد سے اور کیمرے کے لوازمات خریدنے ہیں۔ میں ٹیکنیٹو نہیں بیچنا چاہتا... مجھے خرچ کرنے کا سلیقہ نہیں ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے تھوڑی رقم ملے لیکن دفعے دفعے ملتی رہے۔ جیسے آدمی ریٹائر ہونے کے بعد پنشن لیتا ہے۔ مجھ پر کچھ قرض بھی ہے۔ فوری طور پر شاید آپ یقین نہ کریں، صرف ایک ہزار ڈالرز درکار ہیں... پھر اگلے دو مہینے میں محض ہزار ڈالرز۔ اسی طرح ہم دونوں مل کر کوئی مناسب ڈیل طے کر لیں گے... آپ قطعی بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔'' اس نے بات ختم کی۔

''خوب، بہت خوب...'' میں نے اس کے ذہن رسا کی داد دی۔ ''گویا یہ ایک ہمیشہ کا دردسر ہوا۔ یعنی جب تک ہم میں سے کوئی ایک زندہ ہے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔''

''نہیں، نہیں۔'' اس نے تردید کی۔ ''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ چند مہینے میں ہم کسی مناسب معاہدے تک پہنچ جائیں گے۔ میرا یقین کیجیے۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال تک میری شکل نظر آئے گی۔'' اس کا انداز ملتجیانہ تھا۔ میں کافی حد تک اعصاب پر قابو پاچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوف زدہ بھی ہے۔ میرے ذہن میں ہیلن سے شادی کا تصور پھر اجاگر ہونے لگا۔

اجنبی، مسٹر کونیک... بلیک میلر تھا یا ضرورت مند... بہرحال مجھے اس کی بات فی الحال تو ماننی ہی تھی... وہ جو پروگرام بنا کر لایا تھا اس میں وقت کا عنصر میرے لیے اہم تھا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں اطمینان اور سکون سے سوچ سکتا تھا کہ اس سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ اگر وہ واقعی کوئی عادی بلیک میلر نہیں تھا تو چند مہینے میں اس کا رویہ اور مطالبات اس کے بارے میں میرا ذہن صاف کر سکتے تھے۔ فی الوقت ہزار ڈالرز کی کوئی اہمیت نہیں تھی...

طے ہوا کہ مجھے کب، کہاں اسے دس اور بیس کے نوٹوں کی شکل میں ہزار ڈالرز ادا کرنے ہیں۔

☆☆☆

اس کے جانے کے بعد میں نے دو جام چڑھائے اور خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ گلوریا سے چھٹکارا پانے کے مقابلے میں، اس بلیک میلر سے نمٹنا قدرے آسان معلوم ہورہا تھا۔

دو دن بعد میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ ایک بار تھا۔ وہ بتائے ہو

میں نے رقم کا لفافہ اس کے حوالے کیا۔ میں وہاں رکا نہیں اور جلدی اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی میں بیرونی دروازے کی جانب چند قدم ہی بڑھا تھا کہ دو ہٹے کٹے افراد نے مجھے دائیں بائیں سے قابو کیا۔ لمحہ بھر میں میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگ چکی تھی۔ مجھے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ میں نے پلٹ کر کونیک نامی بلیک میلر کو دیکھنا چاہا لیکن دونوں پولیس اہلکاروں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ہتھکڑی اعلان کررہی تھی کہ میں پولیس کی گرفت میں ہوں، مجھے فوراً ہی باہر موجود سرکاری سیاہ سیڈان میں منتقل کردیا گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہوچکا تھا۔

مجھے نہیں پتا مجھے کہاں لے جایا گیا۔ بہرحال میں تنہا اور حالت اسیری میں تھا۔ میں کب اور کیسے سویا، مجھے نہیں پتا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت میری مسٹر کونیک، یعنی بلیک میلر سے ملاقات کرائی گئی۔ میرے منہ پر جیسے قفل لگ چکا تھا۔ کان سائیں سائیں کررہے تھے۔

وہ کسی رخ سے مجہول اور بوسیدہ بلیک میلر نہیں لگ رہا تھا۔ نہ وہ آواز تھی، نہ وہ حلیہ اور چال ڈھال... پولیس کے دو افراد اس کے ہمراہ تھے۔

اس کی آنکھوں کی چمک اور لباس کی نفاست، ٹی وی انڈسٹری کے گلوریا کے دوستوں سے ملتی جلتی تھی۔ چہرے پر سنگ دلی کے آثار تھے۔

''فلیچر بے بی! میری اداکاری اور محنت کی تعریف نہیں کرو گے؟'' کونیک زہریلے انداز میں مسکرایا۔ مجھے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میرا بدن سن تھا، بیٹھا نہیں تو شاید گر ہی پڑتا۔

''تم شاید سمجھ نہیں پا رہے ہو کہ ہوا کیا؟'' وہ بولا۔ ''دراصل مجھ سمیت گلوریا کے دوستوں کو یقین تھا کہ گلوریا کو قتل کیا گیا ہے۔ تم نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی تو ثابت کردی تھی لیکن ہم گلوریا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ شاید اس کے شوہر سے زیادہ مگر ہم بے بس تھے، ہمیں کوئی سرا نہیں مل رہا تھا محض شک تھا۔ ہم نے ایک رضاکار ٹیم تشکیل دی، جس کا ایک فرد تمہاری نگرانی پر مامور تھا۔ اس نے تمہاری اور ہیلن کی ملاقات کا احوال تو ہم تک پہنچا دیا۔ تاہم اس کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ ہمارا شک پختہ ہوگیا۔ فلیچر بے بی، تم سن رہے ہو نا؟'' وہ رک گیا۔

میں سکتے کے عالم میں تھا۔ خاموش... گم صم...

''تم پریشان ہو شاید۔'' اس کا چہرہ پتھرایا ہوا لگ رہا تھا۔ ''خیر... ہم گلوریا کو واپس نہیں لاسکتے تھے۔ لیکن تمہیں کس کے لیے ہمیں ٹھوس ثبوت درکار تھا۔ کیونکہ تم پریشان لگ رہے ہو اس لیے میں تفصیل میں جانے سے گریز کروں گا۔'' اس کے چہرے پر بے نیازی اور بیگانگی کا تاثر گہرا ہوگیا۔ ''ہم نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ اسے قابلِ عمل بنانے کے لیے ہمیں کافی تگ و دو کرنی پڑی۔ تدفین کے بعد تمہاری عارضی غیر موجودگی نے ہمیں کچھ سہولت فراہم کردی تھی... ہماری ٹیم نے ماہر نفسیات سے بھی مشورہ کیا۔ ''بے ہاؤس'' میں شوٹنگ کے لیے ہمیں قانون کی مدد بھی حاصل کرنی پڑی... کامیابی کا دارومدار میری اداکاری اور مجرم کی نفسیات کے ایک ناگزیر پہلو یعنی ''احساسِ جرم'' پر تھا۔ تم جیسے مجرم اور عادی یا پیشہ ور مجرم کی نفسیات میں ''احساسِ جرم'' کے معاملے میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ ہم نے اس پر کافی کام کیا لیکن میں بات کو مختصر کروں گا... ہماری ٹیم کو انڈسٹری سے کچھ رضاکار بھی مل گئے۔ گلوریا کا رول ''نینا'' نے ادا کیا۔ نینا کو بچانے کے لیے ایک حفاظتی جال ہمیں لازمی چاہیے تھا۔ کافی مشکل پیش آئی لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اپنے مطلب کی ایک تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ الیکٹرونکس میں جس تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں... وہ دن دور نہیں جب رنگین عکس بندی کا آغاز ہوجائے گا۔ تمہاری بدقسمتی اور ہماری خوش قسمتی کہ ابھی بلیک اینڈ وہائٹ ہی چل رہا ہے۔ لفافے میں تمام تصاویر غیر متعلق تھیں۔ یہی ایک تصویر تھی جسے دیکھنے سے پہلے ہی میں فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ تصویر تم نے محض رسمی انداز میں دیکھی۔ اگر تم عادی مجرم ہوتے تو اتنی جلدی نہ ٹوٹتے اور تصویر لازماً غور سے دیکھتے پھر بلیک اینڈ وہائٹ عکاسی کے باوجود ہمارا منصوبہ فلاپ ہوجاتا... مختصر تم سیدھے ہمارے بچھائے ہوئے جال میں آن پھنسے اور رقم لے کر پہنچ گئے۔ جیسے ہی تم نے رقم ادا کی، ہمارا کام ختم ہوگیا۔ تم نے ساکت کا ثبوت دیا مسٹر فلیچر... آخری بات یہ کہ میں اسسٹنٹ منیجر نہیں بلکہ ٹی وی آرٹسٹ ہوں... اب میں چلتا ہوں، تم گلوریا سے ملنے کی تیاری کرو۔''

وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک تضحیک آمیز نظر مجھ پر ڈالی جس میں نفرت کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ گنگناتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس کے قدموں کی چاپ میں موت کی آہٹ تھی۔ کسی نے اسے کچھ کہا، اس کے ہنسنے کی آواز آئی۔

قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی لیکن موت کی آہٹ نزدیک سے نزدیک تر...

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں
لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے
روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ
جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ
ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح
ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی
روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے
جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے -
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو- محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں
میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یا تو بس ہو جاتی
ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ
اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی باری پلٹ
بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے
... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا
ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور
کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی
لامتناہی سلسلہ

قسط 55

WWW.PAKSOCIETY.COM

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یار سوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُرجوش جوان جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پبلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے ایک گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان خاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو بھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں دم توڑ دیتی ہے۔ ماریا کی ماں سنتھیا جو زوف ورماسے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہر یار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہر یار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہر یار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہر یار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے شہر یار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلا دی جاتی ہے۔ شہر یار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیا جاتا ہے۔ اور خود انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں جہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک چودھری سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں۔ شہر یار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو بھی ایف بی آئی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو اور شہر یار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ سلو اور شہر یار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ جاوید علی را کے چند بے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو سینئر را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہر یار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہر یار اندو اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ شہر یار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ شہر یار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی ماہ بانو کے ساتھ قید کر لیا جاتا ہے۔ تاہم وہ ایڈی کی مدد سے قید سے نکل جاتا ہے اور مارک اور دیگر افراد پر قابو پا کے ماہ بانو کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ شہر یار، سلو اور ڈاکٹر فرحان ممبئی پہنچ جاتے ہیں اور بھائی جی کے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں اور اشوک کو مارنے کا پروگرام بناتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔ ادھر مینجر ذیشان، مشاہد رحم خان کو آرلینڈو بھیجتا ہے تاکہ وہ ماہ بانو اور اسلم کو یا زیاب کرا سکے۔ جاوید علی اور سلمان بھارتی حدود میں جا کر فروٹ فارم پر موجود اسلحہ تباہ کر دیتے ہیں۔ اسلم جنگل میں سفر کے دوران پروفیسر ہنری کی بائیک کی آواز سن کر اس کا تعاقب کرتا ہے اور دونوں لڑائی کے دوران دلدل میں گر جاتے ہیں۔ ماہ بانو اس کی مدد کرنے پہنچتی ہے مگر اس کے سر پر کوئی شے لگتی ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ادھر شہر یار، سلو، اشوک کو ٹھکانے لگانے کے بعد بھائی جی کے ہوٹل میں قیام کرتے ہیں تاہم شہر یار وہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ نکل رہے ہوتے ہیں تو انہیں وہاں سلو کا ٹریسر بھٹا گرنظر آتا ہے۔ وہ ایک بنگلے میں ٹھہرتے ہیں۔ اس رات بھٹا گر بنگلے پر حملہ کر دیتا ہے اور شہر یار کو قابو کر لیتا ہے۔ وہ سلو کے بارے میں استفسار کرتا ہے تاہم شہر یار بھی نہیں جانتا کہ سلو کہاں ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماہ بانو، ایڈی کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر خود اسلم کے پیچھے گئی تھی لیکن ایڈی کو لگا کہ وہاں رکنے کے بجائے ان دونوں کے پیچھے جانا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح ایک تو وہ حالات سے باخبر رہتا، دوسرے ضرورت پڑنے پر ان کے کام بھی آ سکتا تھا۔ اسے وہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگے تھے خصوصاً اسلم... جس بے غرضی سے اسے اپنے شانے پر لاد کر سفر کرتا رہا تھا، اس چیز نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اٹھا کر چلنے کی وجہ سے ان کے سفر کی رفتار کم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے اسے وہاں بے یار و مددگار چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ ایک رات ماہ بانو کے کمرے میں بُرے ارادے سے گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی لیکن بہرحال اس کی نیت تو واضح تھی۔ اس کے باوجود ماہ بانو نے بھی اپنے شوہر سے اسے وہاں چھوڑ جانے کو نہیں کہا تھا۔ ان لوگوں کی اس اعلیٰ ظرفی نے اس کے دل کو اسیر کر

طرح ان سے انسیت و محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سات سالہ وجود میں تخلیق کیا گیا جوان آدمی کا دماغ بھی اسے یہ راہ دکھا رہا تھا کہ اسے اب ان لوگوں کا ہی وفادار رہنا ہے جو بُرے وقت میں اس کا سہارا بنے ہیں۔

اپنی اس سوچ کی وجہ سے اس نے ہمت کی اور زخمی ہونے کے باوجود سست روی سے آگے بڑھنے لگا۔ اس طرح حرکت کرتے سے اس کی زخمی ٹانگ میں بہت تکلیف ہو رہی تھی، اس کے باوجود وہ ہونٹ بھینچے مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ماہ بانو کی طرح اس نے بھی اسلم کی جانب سے فائر کی آواز سنی اور تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اسی سمت میں سفر کر رہا تھا جہاں اسلم اور ماہ بانو گئے تھے لیکن اس کے سفر کی رفتار بہت سست تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کیا صورتِ حال ہے۔ کچھ اور وقت گزرا تو اس نے ماہ بانو کی بلند چیخ سنی اور مزید مضطرب ہو گیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کی رفتار میں اضافہ ہو جائے۔ اس کوشش میں اس کی ٹانگ کے زخم سے خون رسنے لگا اور تکلیف میں بھی اضافہ ہو گیا لیکن اس نے آگے بڑھنا بند نہیں کیا۔ آخر وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے صورتِ حال کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کے سامنے جو منظر تھا، اس میں صرف ماہ بانو اور ڈاکٹر طارق نظر آ رہے تھے۔ ہنری یا اسلم کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ماہ بانو بے ہوش ہے اور طارق اس کے بے ہوش وجود کو اٹھا کر اپنی بائیک پر لادنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ منظر ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ بازی ماہ بانو اور اسلم کے بجائے ان کے مخالفین کے ہاتھ میں رہی تھی۔ البتہ ہنری کا غیاب اس کے لیے الجھن کا باعث تھا۔ اگر وہ لوگ حاوی رہے تھے تو اس وقت ہنری کو بھی طارق کے ساتھ ہی نظر آنا چاہیے تھا لیکن وہاں اس کی پنکچر ہو کر گری ہوئی بائک کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اپنی اس الجھن کو فی الحال اس نے پسِ پشت ڈالا اور ماہ بانو کو بچانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس صرف ایک پھل کاٹنے والی چھری تھی جس سے وہ اتنی دور سے طارق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

بے شک وہ ذہین اور پھرتیلا تھا لیکن اپنے مختصر اور زخمی وجود کی وجہ سے دو بدو طارق جیسے بھرپور جوان آدمی سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اس خبیث کو ماہ بانو کو لے جاتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس کی نظر [illegible] پڑی۔ بڑی سی

کوشش سے ایڈی اس تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے ایک نظر طارق پر ڈالی۔ وہ اپنے اطراف سے مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کی حرکات و سکنات میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے کسی طرف سے خود پر حملے کا خدشہ ہو۔ یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں تھا اور اس کی ساری توجہ صرف اس بات کی طرف مبذول تھی کہ کسی طرح بے ہوش ماہ بانو کو اپنے ساتھ بائک پر بٹھا سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ رسّی کا استعمال کر رہا تھا۔ رسّی سے باندھنے کی صورت میں ماہ بانو کے چلتی بائک سے گرنے کا اندیشہ ختم ہو جاتا۔

ایڈی نے اس کی اس مصروفیت کو دیکھا اور احتیاط سے پسٹل کی طرف بڑھا۔ اس کے حرکت کرنے کی وجہ سے زمین پر پڑے سوکھے پتے ذرا سے چرمرائے لیکن خوش قسمتی سے ایک ہرن عین اسی وقت دوڑتا ہوا سامنے سے گزرا اور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ چرمراہٹ کی آواز پر ذرا سا چونکنے والا طارق مطمئن ہو گیا کہ اس کی وجہ ہرن تھا۔ یوں ایڈی نے نہایت آسانی سے پسٹل تک رسائی حاصل کر لی اور بہت خاموشی سے طارق کی طرف بڑھا۔ اس جگہ چونکہ زمین صاف تھی اس لیے آوازیں پیدا نہیں ہو رہی تھیں۔ طارق اس زاویے سے کھڑا تھا کہ اس کی ایڈی کی طرف پشت تھی۔ ایڈی اس کی پشت پر پہنچا تو عین اسی وقت وہ بائک پر سوار ہو کر اسے کک لگانے لگا۔ ایڈی بھی اچک کر اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔ طارق نے اس کا میٹھنا محسوس کر لیا اور بُری طرح بدک کر پیچھے دیکھا۔ ایڈی کو پسٹل اٹھائے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں لیکن پھر اس نے تیزی سے خود پر قابو پا لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''ہیلو ایڈی! مجھے امید تھی کہ یہاں تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

''پروفیسر اور اس لڑکی کا شوہر کہاں ہیں؟'' طارق کی خوش اخلاقی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''وہ دونوں لڑتے لڑتے اس دلدل میں جا گرے تھے۔'' طارق نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایڈی کی توجہ بٹانے کی کوشش کی لیکن اس کی توقع کے برعکس ایڈی نے نہ تو اس پر سے نظریں ہٹائیں اور نہ ہی اس کی پسٹل پر گرفت کمزور ہوئی۔ طارق مایوس سا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر کمزور نظر آنے والا ایڈی ذہانت کے اعتبار سے بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور اسے اتنی آسانی سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جس وقت گولی چلی تھی، میں اپنی بائک سمیت ان درختوں میں گھس گیا تھا۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے درختوں کے بارے میں بتایا۔ ایڈی نے اس بار بھی اس کے اشارے پر نگاہ دوڑائی۔

''ٹھیک تھا کہ فائر کرنے والے کا کوئی ساتھی بھی ضرور آس پاس موجود ہوگا اس لیے خاموشی سے انتظار کرتا رہا اور ان دونوں کے جھگڑے میں ٹانگ نہیں اڑائی۔ جب دونوں لڑتے ہوئے دلدل میں گرے تو یہ بھاگتی ہوئی پیچھے کی طرف نکلی اور میں نے اسے بے ہوش کر دیا۔ اسے میں اپنے ساتھ لے کر شہر جانا چاہتا تھا لیکن تم درمیان میں آ گئے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟ اصولاً تو تم ہمارے جرم کا حصہ ہو اس لیے تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔'' اپنی بات ختم کر کے طارق نے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے، شہر چلو۔'' ایڈی نے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جس سے دشمنی اور دوستی میں سے کسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا تاہم مسلسل خود پر قابو پاتے ہوئے پسٹل نے طارق کو اس بات کا احساس ضرور دلایا تھا کہ فی الحال اسے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ یوں بھی جنگل میں جس تیزی سے آگ پھیل رہی تھی، وہ مزید وہاں نہیں رک سکتے تھے۔ آگ پر تو شاید محکمۂ جنگلات کسی طرح قابو پا لیتا لیکن وہ کسی کا سامنا کر کے اس کے سوالات کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے کوشش کرنی تھی کہ شہر پہنچ کر کسی ایسے فرد سے رابطہ کر سکے جو اس معاملے کو ہینڈل کر لے۔ اپنے چہرے کا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے اس نے بائک اسٹارٹ کر دی اور آگے کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ وہ تینوں بائک پر اس ترتیب میں تھے کہ سب سے آگے طارق خود تھا۔ اس کے پیچھے رسی سے بندھی ماہ بانو کا وجود بائک کے دونوں طرف جھول رہا تھا اور سب سے پیچھے ایڈی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مختصر الوجود تھا اس لیے پیچھے بچنے والی تنگ جگہ میں بھی سما گیا۔ طارق کی پشت سے لگی اس کے پسٹل کی نال مسلسل اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ طارق نے بھی دل میں سوچا کہ پہلے یہاں سے نکل جائے، اس کے بعد اس چھوٹی سی بلا سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔ وہ تیزی سے جنگل سے باہر جانے والے راستے پر سفر کرتا رہا۔ آخر کار جنگل کے نیم تاریک ماحول نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا اور وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں درخت اور جھاڑیاں بہت کم تعداد میں رہ گئے تھے اور اس بات کا امکان تھا کہ آگ کی حدود ختم ہی ہوا چاہتی ہیں۔

''ہم شہر پہنچنے والے ہیں۔'' طارق کے اعلان نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ درحقیقت اس وقت اس کی توجہ طارق سے زیادہ ماہ بانو کی طرف تھی جو ہولے ہولے کراہ رہی تھی اور اس کا کراہنا اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ ہوش میں آ رہی ہے۔

''بائک روک دو۔'' آخر کار اس نے طارق کو حکم دیا اور اس کے عمل کرنے کے بعد اس سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا کہ طارق اس پر حملہ نہ کر سکے لیکن پلٹ کر اس پر حملہ آور ہونے کی پوزیشن میں رہے۔

''اسے نیچے اتارو۔'' اس کی بات پر طارق نے ایک لمحے کو سوچا۔ ''میرا حکم صادر کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں تھا کہ طارق کیا کر سکتا ہے۔ اس نے ماہ بانو کو اپنے ہاتھوں سے تھام کر بائک سے اتارا اور یکدم ہی اس نے اپنا سر جھکا کر اپنا ماتھا اس کے ماتھے سے ٹکرا دیا۔

''پسٹل پھینکو۔۔۔ ورنہ میں اس کا سر پھاڑ توڑ دوں گا۔'' اس صورتِ حال پر ایڈی کے لیے گھبرایا لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا کر اس نے طارق کو دھمکایا۔

''بے شک توڑ دو۔ یہ میری محبوبہ نہیں ہے جو میں اس کی جان کی فکر میں ہلکان ہوں۔'' اس کے اس جواب نے طارق کو مایوس کر دیا۔ اس کا ماہ بانو کو اغوا کرنے کا مقصد ایڈی کو بلیک میل کر کے اپنا کام نکالنا تھا جس پر ایڈی نے بائک چلتے ہی قبضہ کر لیا تھا اس لیے فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک گہری سانس کے ہاتھوں اپنے اس طرح بے بس ہو جانے پر اس نے دانت کچکچائے اور اس کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔ رسی کی بندشیں کھلیں تو ماہ بانو کے وجود میں کچھ جان آئی۔ ہوش اسے پہلے ہی آ گیا تھا لیکن جس حالت میں وہ سفر کر رہی تھی، سوائے کراہنے کے کوئی آواز نہیں نکال پا رہی تھی۔

''ہم تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کر کے یہاں سے آگے بڑھو گی تو سڑک پر کسی نہ کسی سے لفٹ مل جائے گی۔'' ایڈی نے سپاٹ لہجے میں اس سے کہا تو وہ سسک پڑی۔

''اسلم۔۔۔ اسلم کہاں ہے؟''

''بہتر ہے کہ فی الحال تم صرف اپنی فکر کرو۔'' ایڈی نے اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ تبھی طارق کو اس کے بائک پر بیٹھنے کا اشارہ

طارق نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ماہ بانو کو یہاں بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ دونوں شہر جانے والے ہیں۔

''یہ پانی کی بوتل رکھ لو۔'' ایڈی خود بھی اچک کر طارق کے پیچھے بیٹھ گیا اور بائک سے لٹکتی پانی کی بوتل نکال کر ماہ بانو کی طرف اچھالی۔ چھوٹے سے وجود میں بڑا دماغ رکھنے والا وہ لڑکا اپنے دماغ کی وجہ سے ہی بھرپور قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ اس کی جسمانی حالت جتنی دگرگوں تھی، یہ وہی جانتا تھا۔ زخم سے مسلسل رسنے والے خون نے اسے بے حد کمزوری میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے بار بار اپنی بصارت کے دھندلا جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس احساس سے وہ بار بار سر جھٹک کر نجات حاصل کر رہا تھا کیونکہ اپنے کام کی تکمیل سے پہلے اپنے حواس کا ساتھ چھوڑ دینا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''واپس جنگل کی طرف چلو۔'' طارق نے بائک اسٹارٹ کی تو اس کے حکم کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑا۔

''اگر ایسا نہیں کرو گے تو میں یہیں تمہارا دی اینڈ کر دوں گا۔'' ایڈی نے پسٹل کی نال کو پوری قوت سے اس کی پشت پر چبھوتے ہوئے دھمکی دی تو اسے اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

''یہ تم صحیح نہیں کر رہے ہو۔'' تعمیلِ حکم کے باوجود طارق نے اسے احساس دلانا ضروری سمجھا۔

''میں کیا کر رہا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' ایڈی نے سرد مہری سے جواب دیا۔

''اپنے اس عمل پر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' طارق کی گیدڑ بھبکی کا جواب دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ طارق یہ مسکراہٹ نہ دیکھ سکا بلکہ پھر اس کے دیکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچا کہ ایڈی کے پسٹل کی نال نے بڑی پھرتی سے اس کی پشت سے سر تک کا سفر طے کیا اور انگلی کی جنبش نے طارق کا کاسۂ سر توڑ کر اس کے شیطانی دماغ کو ہمیشہ کے لیے تاریکی میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیا۔ گولی چلنے کی آواز سے جنگل میں پرندوں نے کہرام سا مچا دیا۔ بائک کا کنٹرول سنبھالے طارق کا زندگی سے رشتہ منقطع ہوا تو بائک بھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی اور ہی اڑتا ہوا دور جا گرا۔ گرنے کے نتیجے میں کتنی ہڈیاں ٹوٹیں اور کہاں کہاں درد نے اپنے پنجے گاڑے، یہ حساب لگانے کے لیے اسے مہلت نہیں ملی اور طمانیت کے گہرے احساس کے تحت اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس جنگل کی زمین کے نیچے حالتِ قید میں برسوں پرورش پاتا اس کا وجود اگرچہ یہیں اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا لیکن یہ اطمینان تو تھا کہ وہ قیدی کے بجائے آزاد انسان ہے اور بے شک اس کی دنیا میں آمد اس کی مرضی سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ یہاں سے جا تو اپنی مرضی سے رہا تھا... اور یہاں سے جانے کا فیصلہ اس نے اس لیے کیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ عام انسانوں کی دنیا میں اس کا وجود بالکل مس فٹ ہے۔ مس فٹ کی حیثیت سے جیتے رہنے کے مقابلے میں یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ خود کو فنا کر لیتا... سو اس نے کر لیا تھا۔

☆☆☆

شاہد کے بازو پر سر رکھ کر سوئی ہوئی چاندنی کی آنکھ بالکل اچانک کھلی لیکن کمرے میں چھائے گھپ اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہی۔ یکبارگی اسے شدید خوف کا احساس ہوا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ لوگ کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہو چکے ہیں۔ نیند کے خمار سے نکلتے ہی اسے دو باتوں کا ادراک ہوا تھا۔ اول یہ کہ اس کی آنکھ کسی کھٹکے کے سبب کھلی تھی۔ دوم کمرے میں جلتا زیرو کا بلب خود بخود بند نہیں ہوا تھا بلکہ کسی نے بند کیا تھا۔ خوف کے اس عالم میں اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو برابر میں سوئے شاہد کو جگانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے اس ارادے پر عمل کر پاتی، ایک آہنی ہاتھ نے اس کے منہ کو دبوچ لیا۔ اس نے اضطراری طور پر خود کو آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن پھر فوراً ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ حملہ آور نے اسے بے ہوشی کی کوئی دوا سنگھائی تھی۔ بالکل یہی عمل شاہد کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔

دوبارہ ان دونوں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو کاٹھ کباڑ سے بھرے ایک سیلن زدہ کمرے میں ننگے فرش پر بندشوں میں جکڑا ہوا پایا۔

''یہ ہم کہاں ہیں شاہدے؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں اپنے شوہر سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میں تو اپنے بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اب آنکھ کھلی ہے تو یہاں ہوں۔'' شاہد اس سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے لگتا ہے کہ میں چودھری یا بائی جی کے غنڈوں میں سے کسی نے اغوا کیا ہے۔'' چاندنی نے سہمے ہوئے انداز میں قیاس آرائی کی۔

''تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے کڑیے۔'' اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لحیم شحیم آدمی بولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس آدمی کی شکل ان کے لیے اجنبی تھی لیکن تیور دیکھ کر وہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ کوٹھے پر گزرے ماہ و سال نے انہیں اتنا تجربہ تو ضرور عطا کیا تھا کہ وہ جان سکیں کہ اس قسم کے غنڈے کسی نہ کسی پیسے والے کے پالتو ہوتے ہیں اور اپنے مالک کے حکم پر دوسرے لوگوں کی ہڈی پسلی توڑنے سے لے کر جان لینے تک ہر کام کر گزرتے ہیں۔

''تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' آخر کار چاندنی نے ہی ہمت کر کے اس سے دریافت کیا۔

''میں نہیں، میرے آقا چاہتے ہیں کہ تم ان کی راہ سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم سیدھی طرح سے اس کے لیے راضی نہیں ہوتے تو میں دو منٹ میں تمہیں ان کی راہ سے ہٹا سکتا ہوں۔'' بولتے بولتے اس کے تیور جارحانہ ہو گئے۔ چاندنی اور شاہد میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہہ سکتے۔

''پچھلی واری تو ہمارے سنگی انجانے میں چوٹ کھا گئے تھے لیکن اب تم نے دیکھ لیا نا کہ ہم کتنے آرام نال تمہیں تمہارے ٹھکانے سے اٹھا لائے ہیں۔ تمہارا وہ مچھر پہرے دار ادھر ہی پڑا سروی کھا رہا ہوگا۔ ہورا اگر ہوش آ گیا تو دیکھ لے گا کہ ہم کیسے اس دی ناک دے نچے (نیچے) سے تم دونوں کو اٹھا لائے ہیں۔'' اس نے اپنی بات سے واضح کر دیا کہ وہ لوگ نہ صرف اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ ان کی نگرانی کی جا رہی ہے بلکہ نگرانی کرنے والے کو ناک آؤٹ کر کے انہوں نے اپنی برتری بھی ثابت کر دی تھی۔

''اب تسی دسو کہ اگر میں تم دونوں کو مار کر تمہاری لاشیں ادھر ہی گاڑ... دوں تو کون تمہاری مدد واسطے آئے گا۔ تمہارے پچھلوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہو گی کہ راتوں رات تسی کتھے غائب ہو گئے ہو۔'' وہ اچھی طرح انہیں خوف زدہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

''آخر تم ہم سے چاہتے کیا ہو؟ اگر مارنا ہے تو مار ڈالو، اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' آخر کار شاہد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا لیکن الفاظ کے برعکس اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ موت کے خیال سے اس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے ہیں اور وہ زیادہ دباؤ برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

''نہ سوہنیے نہ۔ اتنی سوہنی جوڑی ہے تساں دی۔ میرا جی نہیں مانتا کہ بھری جوانی میں تمہیں موت دے دوں۔ تمہیں تو ابھی بہت لمبی حیاتی جینا چاہیے۔'' ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا کیونکہ اس کے سخت تاثرات کے ساتھ یہ نرم باتیں کسی طور لگا نہیں کھا رہی تھیں۔

''اگر ہمارے بچنے کی کوئی راہ ہے تو بتاؤ۔'' ذہین چاندنی نے اندازہ لگا لیا کہ انہیں اس طرح اغوا کر کے یہاں لانے اور پھر مذاکرات کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ انہیں قتل کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کا اصل مقصد جاننے کی کوشش کی۔

''یہ کی ہے نا تُو نے عقل مندوں والی گل... تو من، زندہ رہنے کے لیے تجھے بس اتنا کرنا ہوگا کہ چودھری صاحب اور بائی جی کے خلاف جو پرچہ کٹوایا ہے اسے واپس لے لو اور عدالت سے مافی مانگ لو کہ لوگوں کی چڑھائی میں آ کر تم نے بیکار میں قنون (قانون) کا وقت برباد کیا ہے۔'' وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا جسے سن کر شاہد کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں اپنی معصوم بہن کو اذیت ناک موت کا شکار بنانے والوں کو معاف کر دوں؟''

''تو اس کے سوا تیرے پاس چارہ کیا ہے۔ نہیں مانتا میری گل تو نہ مان۔ میں ابھی تم دونوں کا کام تمام کر دیتا ہوں۔ آگے سارا قصہ آپوں آپ ہی ختم ہو جائے گا۔'' وہ فوراً تیور بدل کر درشتگی سے بولا تو چاندنی نے جلدی سے درمیان میں مداخلت کی۔

''تم ہمیں تھوڑی دیر کی مہلت دے دو بھائی۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آدھا گھنٹا دے رہا ہوں، دونوں پچھتی کوئی فیصلہ کر لو۔'' وہ شاہد کو قہر بار نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

''کیا تم اپنی جان بچانے کے لیے میری بہن کا خون معاف کر دینا چاہتی ہو چاندنی؟'' شاہد نے درد بھرے لہجے میں اپنی جیون ساتھی سے دریافت کیا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے شاہد۔ اگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی تو اپنی جان دینے کے سوا کچھ نہیں

آزاد گھومتے رہیں گے۔''

''لیکن اس صورت میں میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا کہ میں نے اپنی بہن کے خون کا سودا نہیں کیا۔'' چاندنی کی دلیل کے جواب میں وہ جذباتیت سے بولا۔

''جذباتی مت بنو شاہد۔ ایسے ڈائیلاگ فلموں اور ڈراموں میں تو اچھے لگتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں بالکل بیکار ہوتے ہیں۔ اتنے سال کوٹھے پر گزارنے کے بعد بھی اگر تم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نہ سمجھ سکے تو اور کب سمجھو گے؟'' چاندنی کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

''آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟'' اس نے بے بسی سے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ بہت لمبی زندگی جینا چاہتی ہوں۔'' اس نے فوراً لہجے میں نرمی سمو لی اور شاہد کا ہاتھ اپنے نرم و گداز ہاتھ میں تھام لیا۔ بندھے ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہی موجود تھے اس لیے اس عمل میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن اپنی بہن کی دردناک موت کا خیال میرے دل سے نہیں نکل سکتا۔'' اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم اس بات کو اپنے دل سے نکال دو لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنی زندگیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کریں۔ چند سال بعد جب یہ قصہ پرانا ہو جائے گا اور سب کے ذہنوں سے شاہد اور چاندنی کا خیال نکل جائے گا، تب تم کسی تدبیر سے اپنی بہن کے قاتلوں سے بدلہ لے لینا۔'' وہ بہت لگاوٹ سے اسے جو سمجھا رہی تھی، موجودہ صورتِ حال میں سمجھانا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔

''دیکھو شاہد! کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ ہم یہاں سے کہیں دور ایک دوسرے کے سنگ اچھی اور پُرسکون زندگی گزاریں۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو جس کے آنگن میں ہمارے پیارے پیارے بچے کھیلیں اور ہم انہیں زندگی کی وہ ساری خوشیاں دیں جن سے ہم اپنے بچپن میں محروم رہے۔'' مصلحتوں کے بعد خوابوں کے سلسلے نے زبردست کام کیا اور نیم دلی سے دشمن کی بات مان لینے پر غور کرنے والا شاہد کھلی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خوابوں کے سنگ چلنے پر پوری طرح رضامند ہو گیا۔

[illegible] تھی، اسے بھی بدلہ ضرور لوں گا۔ ادھر اس کے فیصلے پر شاداں و فرحاں چاندنی کو یقین تھا کہ ایسا کوئی وقت کبھی نہیں آئے گا اور جب وہ اپنے خوابوں کی دنیا بسا چکے ہوں گے تو شاہد کبھی خود میں اتنا حوصلہ نہیں پائے گا کہ صرف ایک انتقام کی خاطر ان نعمتوں کو ٹھوکر مار کر جا سکے۔ یوں اس رات عدل و انصاف کے لیے کی جانے والی ہر کوشش اس سیلن زدہ کمرے میں فقط اس لیے دم توڑ گئی کہ غریب کی بزدلی اور خود غرضی میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ اپنے حق کے لیے ڈٹ سکے... اور جہاں حوصلہ نہ ہو، وہاں نظامِ انصاف قائم ہونا بھی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

شہریار اس حالت میں چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا کہ ایک انڈرویئر کے علاوہ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا اور اس کی نظروں کے عین سامنے بھٹا گرا ایک کرسی پر پاؤں پر پاؤں رکھے بظاہر بہت پُرسکون بیٹھا ہوا تھا۔

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنے جرائم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ سلو کے بارے میں بتا دو تو تمہاری مشکل خاصی آسان ہو سکتی ہے۔'' اس نے بہت دھیمے لہجے میں اپنا وہ مطالبہ دہرایا جو اس سے قبل بھی کئی بار کر چکا تھا۔ بھائی جی والے بنگلے سے اسے گرفتار کرنے سے لے کر اپنے اس ٹھکانے پر لانے تک وہ اسی طرح دھیمے لہجے میں یہ مطالبہ کرتا رہا تھا لیکن اب جو صورت حال تھی، اس سے شہریار کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی طرف سے مطلوبہ جواب نہ پا کر وہ اور اس کے ساتھی اسے تختۂ مشق بنا کر خوب ستم ڈھائیں گے۔ وہ ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے اچھی طرح تیار کر چکا تھا چنانچہ بھٹا گر ہی کی طرح پُرسکون لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اس لیے اعتراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی میرے ساتھی کی بات تو اس کے بارے میں، میں خود کچھ نہیں جانتا تو تمہیں کیسے کچھ بتاؤں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اگر خود اپنے آپ سے ہمدردی نہیں رکھتے ہو تو پھر میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' بھٹا گر نے شانے اچکا کر یوں کہا جیسے اسے اس کی بے وقوفی پر افسوس ہو۔ ''او کے تو پھر میں چلتا ہوں کیونکہ میرا یہاں رکنا بیکار ہی ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

شہریار انتظار کرنے لگا کہ دیکھو اب کیا ظہور میں آتا ہے۔ اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ بھٹا گر اپنے اس رویے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے اعصاب کشیدہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کو گرفتار کرنے سے لے کر اب تک کسی نے اس کے ساتھ روایتی مار پیٹ نہیں کی تھی لیکن اس طرح چھت سے الٹا لٹکا کر واضح کردیا تھا کہ شرافت سے تعاون نہ کرنے کے نتیجے میں اس کا کیا حشر ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے اس حشر کے لیے تیار تھا لیکن ان کا مطالبہ نہیں مان سکتا تھا۔ بھٹنا گر کے باہر جانے کے تقریباً دو منٹ بعد ایک لمبا تڑنگا پہلوان نما آدمی اندر داخل ہوا۔ اس پہلوان نے بھی ایک انڈرویئر کے علاوہ کوئی لباس نہیں پہن رکھا تھا اس لیے اس کے مضبوط مسلز کی خوب نمائش ہورہی تھی۔ ریسلرز کی طرح اس نے اپنے پورے جسم پر تیل نما کوئی ایسی شے لگا رکھی تھی کہ روشنی میں اس کا جسم خوب چمک رہا تھا۔ اس کا سر بھی بالوں سے محروم تھا اور جسم کی طرح ہی چمک رہا تھا۔ چہرے پر بردا ڑھی مونچھیں نام کی کوئی شے نہیں تھی، البتہ بھویں خوب گھنی اور چوڑی چوڑی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ عام آدمی اسے دیکھ کر خوامخواہ ہی رعب میں آجائے اور اپنے دل میں فیصلہ کرلے کہ اس پہلوان سے کسی طور نہیں بگاڑنی ہے۔ لیکن شہریار اس سے قطعی متاثر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ میں موجود خاردار کوڑے کو دیکھ کر بھی اس نے اپنے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور یونہی آنکھیں کھولے اسے دیکھتا رہا۔

پہلوان نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا اور اسے ایسی تولنے والی نگاہوں سے دیکھتا رہا جیسے قصائی ذبح کے لیے پیش کیے جانے والے جانور کو دیکھتا ہے۔ چند سیکنڈ تک اچھی طرح شہریار کا جائزہ لینے کے بعد اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ دوڑی اور وہ دھیرے سے بولا۔

''مرغا جان دار ہے۔ مزہ آئے گا۔'' بولنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے کوڑے والے ہاتھ کو تیزی سے حرکت دی اور خاردار کوڑا بجلی کی تیزی سے لپکتا ہوا شہریار کے جسم پر آکر لگا۔ کوڑے کی ایک ضرب ہی ایسی تھی کہ شہریار کے جسم میں مرچیں سی بھر گئیں اور وہ جان گیا کہ خاردار دھاتی کوڑے نے اس کے پہلو کی کھال ادھیڑ ڈالی ہے۔ اپنی چیخ پر قابو پانے کے لیے اسے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچنا پڑا۔ اس کے بعد تو گویا اس پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ تابڑ توڑ جسم پر پڑنے والے کوڑوں نے بازو، پیر، پیٹھ، پیٹ، سینہ... جسم کا کوئی حصہ نہیں چھوڑا اور لمحوں میں اس کا پورا جسم دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ہوگیا۔ اتنی شدید تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے اسے خود پر خاصا جبر کرنا پڑا تھا۔ چیخوں پر قابو رکھنے کے لیے اس نے ہونٹوں کو اتنی بُری طرح بھینچا تھا کہ نچلا ہونٹ اپنے ہی دانتوں کی زد میں آکر زخمی ہوگیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔ خون تو جسم کے باقی حصوں سے بھی رس رہا تھا کہ خاردار کوڑے نے اس کے پورے جسم کو ہی بُری طرح ادھیڑ ڈالا تھا۔

''بہت جان ہے تجھ میں۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ کتنے پانی میں ہے۔'' پہلوان نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر زور سے جھٹکا دیا اور نفرت بھرے لہجے میں بولتا ہوا ایک شیلف پر پڑا ڈبا اٹھانے لگا۔ شہریار کی نظروں نے جہاں تک کام کیا تھا، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ کمرا بطور خاص عقوبت گاہ کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہوگا۔ وہاں دیواروں پر ایسے کئی خوفناک ہتھیار لٹکے ہوئے تھے جو موجودہ زمانے میں تو متروک ہوچکے تھے، البتہ ماضی میں کئی ظالم و جابر بادشاہوں اور راجاؤں کے ہاں ان کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔ وہاں دیوار گیر الماریاں بھی تھیں اور جانے ان میں کون کون سے آلاتِ ستم بھرے ہوئے تھے۔ فی الحال تو وہ پہلوان گودریجے سائز کا وہ ڈبا کھولتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ڈبے کا ڈھکن ہٹا کر وہ اس کے قریب آیا اور ہاتھ اندر ڈال کر ڈبے میں موجود شے باہر نکالی۔ اگلے ہی لمحے شہریار کے زخموں میں آگ سی لگ چکی تھی۔ پہلوان نے ڈبے میں سے سرخ پسی ہوئی مرچوں اور نمک کا سفوف نکال کر اس کے زخموں پر ملنا شروع کردیا تھا۔ ضبط کے باوجود شہریار کے لبوں سے ایک سسکاری نکل گئی جس پر پہلوان قہقہہ لگا کر ہنسا اور مٹھیاں بھر بھر کر سفوف اس کے جسم پر ملنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''صاحب کو روسٹ کیا ہوا بکرا بہت پسند ہے۔ پہلے تجھے اچھی طرح مرچ مسالا لگا دوں پھر روسٹ بھی کردوں گا۔'' اپنی اس بات پر اس نے اس طرح عمل کیا کہ نمک مرچ کا مکسچر اچھی طرح اس کے جسم پر ملنے کے بعد ایک الماری کھول کر اس میں سے انگیٹھی نکالی۔ انگیٹھی ربر کے پائپ کے ساتھ ایک گیس سیلنڈر سے منسلک تھی۔ بے حد برداشت رکھنے کے باوجود شہریار ایک لمحے کو تھرا سا گیا۔ پہلوان سچ مچ اسے روسٹ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کمال یہ تھا کہ تشدد کے اس عمل کے دوران اس نے ایک بار بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے کچھ جاننے سے زیادہ اس بات میں دلچسپی ہے کہ ہاتھ آئے شکار کو کس طرح زیادہ سے زیادہ اذیت دے سکتا ہے۔

شہریار جس تکلیف

خود ہی جانتا تھا۔ اس کے جسم کا ایک ایک مسام دہائی دے رہا تھا اور وہ کسی کے سامنے فریاد نہیں کرسکتا تھا کیونکہ فریاد کرنے کا مطلب تھا، اپنی ہار تسلیم کرلینا اور وہ سب بتانے پر رضامندی ظاہر کرنا جو بہرحال وہ اپنی جان کی قیمت پر بھی نہیں بتاسکتا تھا۔

زندگی کے اس پہلے بدترین تشدد سے گزرتے ہوئے اس کے مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ پسینا بہنے کی رفتار میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب پہلوان نے انگیٹھی جلا کر عین اس کے سر کے نیچے رکھ دی۔ انگیٹھی اور اس کے سر کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اگر آنچ تیز ہوتی تو اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے سکتی تھی لیکن فی الحال پہلوان نے آنچ دھیمی رکھی تھی اور وہ اپنے سر پر اس کی حدت محسوس کررہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا چہرہ اور سر کے بال حدت کی وجہ سے پسینے سے تر ہوگئے اور پسینے کے قطرے چھن چھن کرتے آگ پر جا کر گرنے لگے۔

''صاحب کو دھیمی آنچ پر تیار کیا روسٹ بہت پسند ہے۔'' پہلوان نے ایک اور بھیانک قہقہہ لگا کر اسے یوں اطلاع دی جیسے واقعی وہ اس کے صاحب کی پسند و ناپسند جاننے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ حالانکہ وہ تو اس اذیت کو برداشت کرنے کی جدوجہد کررہا تھا جو اس کی بصارت کو بار بار دھندلائے دے رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اذیت ایسی ہے جو اسے بے ہوش بھی نہیں ہونے دے گی اور اسے شاید اپنی آخری سانس تک رگ رگ میں اتر جانے والی اس تکلیف کو سہنا ہوگا۔

''یہ کیا کررہے ہو یار؟'' اس کی کھوپڑی کے اندر دماغ گویا ابلنے لگا تھا جب اس نے کسی کی حیرت زدہ آواز سنی اور آواز کی سمت میں دیکھنا چاہا لیکن بے تحاشا تکلیف اور مسلسل آنکھوں پر بہہ کر آتے پسینے کی وجہ سے دھندلا جانے والی بصارت کے باعث ایک ہیولے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ یہ شخص کب اندر آیا ہے۔

''صاحب کے لیے روسٹ تیار کررہا ہوں۔'' پہلوان نے نہایت سنجیدگی سے نووارد کو جواب دیا۔

''تو یہی نامولی بدھی کا ہے پہلوان۔ لنچ ٹائم ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ ابھی سے روسٹ بنا کر رکھ دے گا تو ٹھنڈا ہوجائے گا نا۔''

''ہوں۔'' انگیٹھی

شہریار کے سر کے نیچے سے ہٹا کر بجھادی۔

''چل بھئی، تو تھوڑی دیر اور جی لے۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آکر پھر اپنا کام کرتا ہوں۔ صاحب کو لنچ پر گرما گرم تازہ روسٹ ملے، یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ میرا ہی روسٹ بنا کر رکھ دیں گے۔'' انگیٹھی اور سیلنڈر ایک طرف ہٹا کر رکھتے ہوئے پہلوان نے اس سے کہا اور پھر اپنے ساتھی سمیت باہر نکل گیا۔

چھت سے الٹے لٹکے شہریار نے بے اختیار سکون کی ایک سانس لی۔ تکلیف جسم کے ہر مسام میں سے امڈ رہی تھی لیکن عین سر کے نیچے جلتی آگ کے ہٹنے سے اذیت میں کچھ کمی ہوگئی تھی۔ اس آگ نے تو اس کے جسم کا سارا پانی پسینے کی صورت میں بہا ڈالا تھا اور وہ شدید پیاس محسوس کررہا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہاں کسی سے ایک گھونٹ پانی کا سوال ان کے مظالم کو اور بڑھا دے گا۔ وہ فی الحال اسے جان سے نہیں مار سکتے تھے کہ اس کی زبان سے بہت کچھ سننے کے خواہش مند تھے لیکن ان حربوں سے اس کے اعصاب کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ اعصاب کی اس جنگ میں وہ کب تک ان کے سامنے ٹھہر سکتا تھا، اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن پہلے مرحلے سے کامیابی سے گزر جانے پر دل میں اللہ کا شکر گزار ضرور ہوا تھا۔ شکر گزار وہ اس بات پر بھی تھا کہ درپیش مہم کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی اہم چیزیں اپنے پاس نہیں رکھی تھیں اور اشوک کے قتل کے لیے نکلنے سے قبل سب کچھ امانتاً ڈاکٹر فرحان کے پاس رکھوا دیا تھا اور ڈاکٹر فرحان فی الحال بھائی جی کی پناہ میں حفاظت سے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ جو کچھ اس پر گزر رہی ہے، آگے اس سے بھی کڑے مراحل سے گزرنا ہوگا۔ ان مراحل کے لیے اللہ سے ہمت اور استقامت کی دعا مانگتے ہوئے وہ کب مدہوش ہوا، اسے خبر نہیں ہوسکی۔ جتنی تکلیف سے وہ گزرا تھا اصولاً تو اسے بہت پہلے ہی بے ہوش ہوجانا چاہیے تھا لیکن مضبوط قوتِ ارادی نے یہ عیاشی بھی مشکل سے عطا کی تھی۔ اس اذیت ناک صورتِ حال میں بے ہوش ہوجانا بھی عیاشی ہی کے زمرے میں آتا تھا۔

☆☆☆

''تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر پانڈے۔'' ڈیوڈ نے بہت تپاک سے اپنے استقبال کے لیے کھڑے پانڈے سے ہاتھ ملایا۔

''مجھے بھی...'' پانڈے نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود الجھن اور حیرت

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی تحریر ڈیوڈ بخوبی محسوس کرسکتا تھا۔ را کے اس مقامی سربراہ کے لیے یقیناً یہ پیغام حیران کن رہا ہوگا کہ موساد کا کوئی اہم ذمے دار اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ بہرحال اس نے ملاقات پر رضامندی ظاہر کر کے ملاقات کی جگہ کا تعین کردیا تھا۔ اس ملاقات میں پانڈے کی حیثیت میزبان کی تھی، چنانچہ وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے اس شاندار سوئٹ میں طے شدہ وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا اور ڈیوڈ کا سوئٹ کے دروازے پر استقبال کیا تھا۔ یہ ون ٹو ون ملاقات تھی اس لیے سوئٹ میں پانڈے کے ہمراہ اس کا کوئی ساتھی موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کے یہاں پہنچنے سے قبل دو ماہرین نے سوئٹ کا ہر طرح سے جائزہ لینے کے بعد اسے سیکیورٹی کے اعتبار سے کلیئر قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی یقین دہانی کروادی تھی کہ وہاں ہونے والی گفتگو کے لیک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اب بھی اس کے نصف درجن کے قریب ماتحت سوئٹ کے آس پاس اور ہوٹل کے داخلی و خارجی راستوں پر موجود تھے اور ہر شے پر بھرپور نظر رکھے ہوئے تھے۔

بظاہر ڈیوڈ وہاں اکیلا آیا تھا لیکن قیاس کیا جاسکتا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے بھی وہاں کچھ آدمی خفیہ طور پر موجود ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن پاکستان کو نہایت حقیر جاننے کے باوجود وہ اس کی خفیہ ایجنسیوں سے خوف زدہ تھے اور اس خوف کے سبب ہی انہوں نے اس ملاقات کے موقع پر اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر رکھا تھا۔

''آپ کی میزبانی کا آنر پا کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے میں نے اس بہت پرانی اور قیمتی وائن کا انتظام کیا ہے۔'' مصافحے کے بعد پانڈے اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا اور وہ دونوں دبیز اور بیش قیمت صوفوں پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ چکے تو پانڈے نے کرسٹل کے نازک جام میں اس کے لیے وائن نکالتے ہوئے خوشامدی لہجے میں کہا۔

اسے معلوم تھا کہ موساد جیسی تنظیم کی طرف سے ملنے والا ملاقات کا پیغام خالی از علت نہیں ہے اور وہ ملاقات کے لیے آنے والے نمائندے کو زیادہ سے زیادہ خوش کر کے شیشے میں اتار لینا چاہتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں حالات ان کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں تھے۔ پچھلے کافی عرصے سے را، پاکستان میں اپنے کسی بھی اہم مشن میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی اور الٹا انہیں ہی اپنے کئی اہم ساتھیوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ ان ساتھیوں میں ورما، سنتھیا اور ڈاکٹر ماریہ قابلِ ذکر تھے اور سنتھیا کی موت کے بعد سے تو وہ خود کو زیادہ ہی تنہا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اب ساری ذمے داری اس کے شانوں پر ہی آگئی تھی اور حالات اتنے خراب تھے کہ وہ اپنے اہم ساتھیوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم ٹھکانوں سے بھی محروم ہوگئے تھے۔ خواجہ سراؤں والا سیٹ اپ بھی بگڑ گیا تھا اور ان مشکل حالات میں انہیں یہاں اپنی کارروائیاں جاری رکھنے میں دشواری کا سامنا تھا۔

''لاجواب۔'' ڈیوڈ نے اس کی پیش کردہ وائن کا پہلا گھونٹ لیا اور بے ساختہ انداز میں تعریف کی۔ اس تعریف پر پانڈے کا چہرہ کھل اٹھا۔

''ٹائم گم ہے اس لیے کام کی بات بھی ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں۔'' ڈیوڈ بہت تیزی سے مطلب کی بات پر آگیا۔

''شیور۔'' پانڈے کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

''میں اور میری تنظیم کا ہر فرد جانتا ہے کہ آج کل را کو پاکستان میں کن مشکلات کا سامنا ہے۔ پچھلے عرصے میں تم لوگوں کو قریب قریب ہر مشن میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اپنے کئی اہم ساتھیوں کو بھی کھونا پڑا ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اس لیے صرف ایک حالیہ ناکامی کا ذکر کروں گا۔ بھارت کے اشوک اور یہاں کے چودھری افتخار کے ذریعے اسلحے اور بارود کی ایک اہم ڈیل کی گئی تھی اور ڈیلیوری ہونے ہی والی تھی کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں اس معاملے میں کود پڑیں۔ نتیجے میں بھارت کو یہ زوردار طمانچہ کھانا پڑا کہ وہ اسلحہ و بارود بھارت کی حدود میں ہی تباہ کردیا گیا اور بھارتی حکام ایسا کوئی ٹھوس ثبوت بھی حاصل کرنے میں ناکام رہے کہ الزام پاکستان کے سر رکھ سکیں۔''

ڈیوڈ کی معلومات پانڈے کو حیران کر رہی تھیں کیونکہ جس واقعے کا اس نے حوالہ دیا تھا، اس کو گزرے پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور خود ان کی اپنی تحقیقات بھی ادھوری تھیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ موساد ہمیشہ سے ڈبل گیم کھیل رہی تھی اور بظاہر جس ڈیل کا تعلق ان سے تھا، اس کی اصل ڈوریاں تو موساد کے ہاتھ میں ہی تھیں۔ اشوک اور چودھری دونوں موساد ہی کے تو مہرے تھے لیکن اشوک کے ذریعے را کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا تھا کہ اس نے عیاشی کی غرض سے بھارت آئے ہوئے پاکستانی وزیر کو اپنے جال میں پھانس کر اس ڈیل کے لیے رضامند کرلیا ہے۔

''میرا مقصد تم

میں ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور پچھلے عرصے میں ہمیں بھی یہاں کچھ ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔'' یہ اعتراف کرتے ہوئے ڈیوڈ کے دل میں ماریا اور سنتھیا کی موت کا کرب تھا۔ بظاہر را کے ساتھ کام کرنے والی یہ دونوں ماں بیٹیاں اصل میں تو ان کی مخلص ساتھی تھیں۔

''اوہ...'' پانڈے نے اس کے اعتراف پر تبصرہ کرنے کے بجائے ہونٹ سکیڑ کر محض اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

''یہ سچ ہے اور اسی لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اپنی اپنی ناکامیوں کا بدلہ لینے کے لیے اہم اکٹھے ہوکر پاکستان کو ایسا بھرپور جواب دیں کہ اس کے حکمراں اور عوام برسوں بلبلاتے رہیں۔'' ڈیوڈ کی آنکھوں میں یہ عزم ظاہر کرتے ہوئے بلا کی سفاکی اور نفرت تھی۔

''کیا میں آپ کے پلان کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟'' پانڈے الرٹ ہوکر بیٹھ گیا۔

''بالکل... کیونکہ ہم نے جو پلان تیار کیا ہے، اس میں ایک خاص سبب سے تمہارے ادارے کا ہی رول ہوگا۔''

''اچھا، وہ کیسے؟'' ڈیوڈ کی بات سن کر اس نے اشتیاق کا اظہار کیا۔

''ہماری انفارمیشن کے مطابق ایک نواحی گاؤں جمال پورہ میں تمہارا ایک مدرسہ کام کر رہا ہے اور اس مدرسے کی انتظامیہ کا جمال پورہ کے علاوہ اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں بھی اتنا اثر رسوخ ہے کہ مدرسے کے منتظم کی طرف سے کیے جانے والے کسی اعلان یا کارروائی پر کوئی شخص ذرا بھی اعتراض نہیں کرتا اور مدرسے کے عملے کے ساتھ وہاں آنے والے مہمانوں کو بھی لائقِ احترام سمجھا جاتا ہے۔'' ڈیوڈ کی زبانی یہ سب سن کر پانڈے کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ یہ ایسی معلومات نہیں تھیں جو ہر کس و ناکس کے علم میں ہوتیں۔ مرکز کے علاوہ یہاں کام کرنے والے را کے مقامی عہدے داروں میں سے بس گنتی کے چند بڑوں کو ہی اس راز کا علم تھا اور ڈیوڈ کی زبانی یہ سب سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ موساد نے ان کی تنظیم میں بہت اوپر تک جگہ بنا رکھی ہے۔ موساد کے اس کردار پر تشویش اور ناگواری محسوس کرنے کے باوجود اس نے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور کچھ خفت زدہ سا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

بہت
مارے

مدارس اور مدرس موجود ہیں لیکن جمال پورہ میں ہماری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس گاؤں سے پاکستان کا ایک اہم ائربیس بہت قریب ہے اور ہم وہاں کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔''

ڈیوڈ کا ارادہ جان کر پہلے تو پانڈے کا منہ حیرت سے کھلا لیکن اگلے ہی پل آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ائربیس پر ڈیوڈ کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ واقعی پاکستان کو ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہوجاتے۔

''اس مشن میں ہمارے اور تمہارے منتخب کمانڈوز حصہ لیں گے۔ ساری معلومات اور مشن میں کام آنے والا ساز و سامان ہماری طرف سے مہیا کیا جائے گا اور تمہارا اصل کام یہ ہوگا کہ ہمیں مدرسے کے ذریعے کور فراہم کرتے رہو۔ اس کے لیے سب سے پہلا قدم تو یہ اٹھانا ہوگا کہ مدرسے کا منتظم اعلان کرے کہ کچھ غیر حضرات کے تعاون سے مدرسے کی توسیع کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس توسیعی منصوبے کے فوری آغاز کے لیے تیمیں مع ساز و سامان کے جمال پورہ آرہی ہیں۔ اس طرح ہم اپنے مطلب کے بندے اور سامان آسانی سے وہاں پہنچا دیں گے۔'' ڈیوڈ نے اپنا منصوبہ واضح کیا تو پانڈے کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی اور وقتی طور پر وہ یہ تک فراموش کر بیٹھا کہ ڈیوڈ کی اپنے بارے میں معلومات نے اسے کتنا گہیدہ خاطر کیا تھا۔

''اس منصوبے پر کب عمل کیا جائے گا؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''فائنل ڈیٹ میں فی الحال نہیں دے سکتا۔ تم ہفتہ آٹھ دن کا عرصہ سمجھ لو لیکن اپنی تیاری ایسے کرو جیسے چار دن بعد ہی ایکشن لینا ہو۔ ہمارا ہوم ورک مکمل ہے اور میرے کمانڈوز چند گھنٹے کے نوٹس پر بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے جب تک پلان کا وہ حصہ مکمل نہیں ہو جاتا جس کا تعلق تم لوگوں سے ہے، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' ڈیوڈ نے اس پر صورتِ حال واضح کی۔

''یہ ایک اچھا منصوبہ ہے لیکن ظاہر ہے میں اوپر والوں سے ڈسکس کیے بغیر آپ کو کوئی فائنل جواب نہیں دے سکتا۔'' پانڈے جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں یہ پکا پکایا منصوبہ ان کے لیے کتنا خوش کن ہے لیکن اس موڑ پر آکر جہاں اسے اس منصوبے میں را کی کلیدی حیثیت کا احساس ہوگیا تھا، وہ ایک دم پینترا بدل گیا اور اپنی فوری رضامندی کا اظہار کرتے سے گریز کیا۔

''میرے خیال میں مسٹر پانڈے، تم اس معاملے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

صحیح طور پر سمجھے نہیں ہو۔ میں تم سے ملاقات کے لیے آیا ہوں تو صرف اس لیے کہ تم مقامی انچارج ہونے کی حیثیت سے یہاں کے معاملات میں مجھ سے کوآپریٹ کر سکتے ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اصل منظوری تو ہم تمہارے بڑوں کے ساتھ ڈسکس کر کے حاصل کر چکے ہیں۔'' ڈیوڈ نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے ایک منٹ میں اسے اس کی اوقات یاد دلادی اور پانڈے کو فوری طور پر یاد آ گیا کہ اوپر سے اسے موساد کے نمائندے سے بھرپور تعاون کی ہدایت کی گئی تھی۔

''اوکے، میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' وہ بالکل سیدھا ہو گیا۔

''ابھی اپنے کمانڈوز کو تیار کرو۔ باقی ہدایات بھی وقتاً فوقتاً تمہیں ملتی رہیں گی اور ساتھ ساتھ ہمارے درمیان منصوبے کی جزئیات بھی طے ہوتی رہیں گی۔ میں ضرورت پڑنے پر خود تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔'' ڈیوڈ یکدم ہی وہاں سے روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پانڈے نے بھی ہڑبڑا کر اس کی تقلید کی۔

''اوکے، سی یو۔'' نپے تلے انداز میں یہ الفاظ کہتے ہوئے اس نے پانڈے سے الوداعی مصافحہ کیا تو انداز میں واضح احساسِ برتری تھا۔ پانڈے کو اندازہ ہو گیا کہ اس معاملے میں بہت اچھی پوزیشن پر ہونے کے باوجود وہ اسے اپنے زیرِ اثر لانے میں ناکام رہا ہے اور اس ناکامی پر فی الحال وہ مٹھیاں بھینچے اسے جاتا ہوا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا پھر بھی وہ اپنے وجود میں سانسیں لیتی ننھی جان کے لیے ہمت کر رہی تھی۔ ذہنی، قلبی اور جسمانی تینوں اعتبار سے اسے شدید تکلیف سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے اغوا سے لے کر لیبارٹری کے پُرتعیش کمرے میں قیام اور پھر وہاں سے فرار کے مراحل میں وہ جس اعصابی دباؤ کا شکار رہی تھی، اس سے خود ہی واقف تھی۔ اسلم کے ہنری سمیت دلدل میں گرنے کا منظر رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور دل میں تکلیف کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اسلم اس کے ماں بننے کی خبر سن کر کتنا خوش ہوا تھا اور بالکل چھوٹی مونی کی طرح اس کی حفاظت کرتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ماہ بانو کو ذرا بھی تکلیف نہ اٹھانی پڑے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ دکھ اور جسمانی تکلیف دونوں سے لڑتی ماہ بانو اس وقت بالکل تن تنہا زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

اسے یہ زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ اسلم کی محبت کی نشانی بچانے کے لیے درکار تھی اور اسی لگن میں وہ اپنے پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ رہی تھی۔ پاؤں کی موچ کی وجہ سے یہ عمل اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا پھر بھی اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ جنگل میں سفر کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پیروں اور چہرے پر کئی خراشیں آئی تھیں اور کہیں کہیں سے لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے اور بالوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ رہی سہی کسر ان آنسوؤں نے پوری کر دی تھی جس کے مسلسل بہنے پر اس کا کوئی زور نہیں تھا۔ بس وہ اتنا کرتی تھی کہ جب ان آنسوؤں کے سبب آنکھیں بالکل دھندلا جاتی تھیں اور سامنے کا منظر نظر آنا بند ہو جاتا تھا تو وہ ہاتھوں کی پشت سے بیدردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالتی تھی۔

وہ اب جنگل کے قریب سے گزرتی سڑک تک پہنچ چکی تھی اور دل میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی انسانی مدد مل جائے گی لیکن بہرحال اسے ان آنسوؤں پر اب بھی کوئی قابو نہیں تھا جو اس کی بصارت کو دھندلائے دے رہے تھے۔ دھند کی اس چادر کو اپنے سامنے سے ہٹانے کے لیے اس نے ایک بار پھر ہتھیلی کی پشت سے رگڑا تو اسے سڑک کے کنارے کھڑی ایک گاڑی نظر آ گئی۔ وہ گاڑی اس سے خاصے فاصلے پر تھی لیکن جتنا سفر وہ طے کر چکی تھی اس کے مقابلے میں یہ راستہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ میکانکی انداز میں اس طرف بڑھنے لگی۔ چند قدم مزید آگے چلنے پر اسے وہ آدمی نظر آ گیا جو کار سے کچھ فاصلے پر اپنی آنکھوں سے کیمرا لگائے کھٹا کھٹ تصویریں کھینچ رہا تھا۔

آرلینڈو کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ یہاں پائے جانے والے قدرتی مناظر نئے آنے والوں کے قدم باندھ لیتے تھے۔ وہ بھی یقیناً کوئی نووارد تھا جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تصویر کشی میں مصروف تھا۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ ایک درخت کی شاخ پر بیٹھے ایسے پنچھی کی تصویر لینے کی کوشش کر رہا ہے جو اپنے سر پر موجود تاج اور قوسِ قزح کے رنگوں جیسے پروں کے باعث کسی ریاست کے شہزادے جیسی تمکنت رکھتا ہے۔ اس پرندے کی تصویر لینے کے لیے صحیح زاویہ بنانے کی خاطر اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پنجوں کے بل بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک ناگہانی سے دوچار ہو گیا۔ وہ ایک سیاہ رنگ کا لچھا [illegible] پر محوِ استراحت تھا۔

دم پر جا پڑا اور ردِعمل میں سانپ نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔ آدمی بری طرح بدکا اور سانپ کو تیزی سے جھاڑیوں میں گم ہوتا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ پورا واقعہ بہت تیزی سے پیش آیا تھا اور ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے ماہ بانو بھی پل بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کی وہ ماہ بانو جاگ اٹھی جو سارے جہاں کا درد اپنے دل میں لیے حتی المقدور دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتی تھی۔

ان لمحات میں اسے اپنے سارے دکھ اور تکلیفیں بھول گئی تھیں اور وہ اس شخص کی مدد کرنے کی خواہاں تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تکلیف اور جسم میں اٹھتی ٹیسوں کو نظر انداز کر کے تیزی سے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس شخص کے قریب جا پہنچی جس نے اس دوران فوری شاک سے نمٹنے کی خاطر اپنے متاثرہ پاؤں کا جوتا اتار لیا تھا اور پتلون کے پائنچے چڑھائے پنڈلی پر موجود سانپ کے دانتوں کا نشان دیکھ رہا تھا۔

''جلدی سے اپنی ٹائی کھولیے۔'' ماہ بانو نے چیخ کر اسے ہدایت دی تو پہلی بار وہ اس کی وہاں موجودگی سے واقف ہوا تاہم ابھی سب سے زیادہ اہم اس صورتِ حال سے نمٹنا تھا جس سے وہ دوچار ہو چکا تھا۔ ماہ بانو کی ہدایت کا مقصد سمجھ کر اس نے اپنے گلے سے ٹائی نکالی اور زخم سے تھوڑا اوپر مضبوطی سے باندھ دی۔ اسی اثنا میں ماہ بانو اپنی انگلی میں موجود بھدی سی انگوٹھی اتار چکی تھی۔ انگوٹھی اس نے عین اس جگہ رکھ دی جہاں سانپ نے کاٹا تھا۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اجنبی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''یہ زہر مہرہ پتھر کی بنی انگوٹھی ہے اور اس پتھر کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ زہر کو چوس لیتا ہے۔'' اس نے اجنبی کو وہ معلومات فراہم کیں جن سے اسے مشاہرم خان کی کزن گل مینا نے انگوٹھی تحفے میں دیتے ہوئے آگاہ کیا تھا۔ وہ بھلے سنورنے کی بہت زیادہ شوقین نہیں تھی اور پھر حالات بھی ایسے رہے تھے کہ ایسے کسی شوق کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بلتستان کے چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی پُرخلوص گل مینا کے محبت سے دیے گئے اس تحفے کو خود سے جدا نہیں کر سکی تھی۔ اس عرصے میں اس کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی تھیں لیکن انگوٹھی کبھی اس کی انگلی [illegible]

''مجھے لگتا ہے کہ میں بہتر ہوں لیکن مجھے آپ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ہم کسی اسپتال چلتے ہیں۔ وہاں مجھے اور آپ کو بہتر ٹریٹمنٹ مل سکتا ہے۔'' اجنبی جو اس دوران میں اس کی ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ لے چکا تھا، نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولا لیکن اس کی اس پیشکش نے ماہ بانو کو متوحش کر دیا۔ جو حالات اس کے سامنے آئے تھے، ان سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس قسم کی تجربہ گاہ حکومت کی سرپرستی کے بغیر قائم ہونا مشکل تھا اور اگر وہ کسی اسپتال جاتی تو تجربہ گاہ کی تباہی اور جنگل کی آگ کے سلسلے میں تحقیقات کرنے والے بہ آسانی اس تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ خود کو طبی امداد کی شدید ضرورت محسوس کرنے کے باوجود وہ اسپتال جانے سے گریزاں تھی۔

''کیا بات ہے، آپ اتنی خوف زدہ کیوں نظر آ رہی ہیں؟'' اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کر کے اجنبی نے پوچھا۔

''میں کچھ وجوہات کی بنا پر اسپتال نہیں جا سکتی البتہ اگر آپ مجھے میرے دوستوں تک پہنچا دیں اور اس بات کا کسی سے ذکر نہ کریں تو آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہو گا۔'' اس نے نہایت لجاجت سے اس سے درخواست کی تو وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ جس حالت میں نظر آ رہی تھی، یہ صاف ظاہر تھا کہ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے لیکن وہ اسپتال جانے سے گریزاں تھی۔

اس نے غور سے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا۔ عموماً کسی جرم میں ملوث افراد اسپتال جانے سے گریز کرتے ہیں کہ پولیس کے گھیرے میں نہ آ جائیں لیکن ماہ بانو کے چہرے کی ملاحت اور معصومیت اسے کسی طرح مجرم ظاہر نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی ابتر حالت اور چہرے پر موجود مسلسل گریہ کے آثار سے تو وہ اسے کوئی مصیبت زدہ معلوم ہوتی تھی۔

''اوکے، جہاں آپ چاہیں میں آپ کو وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے یکدم ہی ماہ بانو کی مدد کا فیصلہ کر لیا اور اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھایا... کیونکہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرنے والی خود کہیں زیادہ تکلیف میں ہے۔ گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد ماہ بانو نے اسے آفتاب اور کشور کے گھر کا پتا بتایا۔ مصطفیٰ خان کے گھر نہ جانے کا فیصلہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اس کی تلاش کا سلسلہ شروع ہوا تو تلاش کرنے والے سب سے پہلے وہیں کا رخ کریں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مصطفیٰ خان کے بعد پورے آرلینڈو میں آفتاب اور کشور ہی تھے جن سے وہ مدد کی توقع رکھ سکتی تھی۔ ان کے گھر کا پتا بتانے کے بعد اس نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی اور اپنے وجود میں لہریں لیتے بے پناہ درد کو برداشت کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اپنی اس کیفیت میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا تھا کہ اس کے بتائے پتے کو سن کر اجنبی کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر حیرت اتر آئی تھی۔ اپنے جسمانی اور قلبی کرب سے لڑتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہوسکا کہ فاصلہ کس طرح طے ہوا۔ ذہنی طور پر تو وہ جنگل میں ہی تھی جہاں اس نے اسلم کو ایک دلدل میں گرتا ہوا دیکھا تھا لیکن دل کو یقین دلانا مشکل تھا کہ اسے بے تحاشا چاہنے والا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا ہے۔

دل کا یہ درد آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا اور چہرے کے ساتھ اس کا گریبان بھی تر ہوگیا تھا۔ وہ بغیر آہوں اور سسکیوں کے بہت خاموشی سے اس شخص کے لیے رو رہی تھی جس کے چلے جانے سے اسے بھری دنیا میں اپنا آپ بالکل تنہا محسوس ہو رہا تھا۔

''آپ کی منزل آگئی۔'' درد کی داستان سناتے اس کے خاموش آنسوؤں سے راستے بھر بے چین ہوتے اجنبی نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روک کر دھیرے سے اسے اطلاع دی اور پھر خود نیچے اتر کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحے کے بعد گیٹ کھل گیا اور کشور کا چہرہ نظر آیا۔

''السلام علیکم لالہ۔'' وہ جو ڈور آئی سے پہلے ہی بھائی کو دیکھ چکی تھی، دروازہ کھولتے ہی بولی۔ مراد شاہ کیونکہ پہلے ہی ٹیلی فون پر اسے کسی روز اپنی آرلینڈو آمد کی اطلاع دے چکا تھا اس لیے اس کا اس وقت اپنے دروازے پر موجود ہونا کشور کے لیے زیادہ حیرت کا سبب نہیں بنا۔

''گیٹ پورا کھول دو۔ میں گاڑی اندر لاؤں گا۔'' اشارے سے بہن کے سلام کا جواب دے کر اس نے بے عجلت حکم دیا تو اسی وقت کشور کی نظر پسنجر سیٹ پر موجود ماہ بانو پر جا پڑی۔

''ارے، یہ تو ماہ بانو ہے۔ یہ آپ کو کہاں سے ملی اور اسے کیا ہوا ہے؟'' حیرت کے باعث اس کی زبان پر ایک ساتھ بہت سے سوالات آگئے لیکن مراد شاہ کسی ایک کا بھی جواب دیے بغیر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔ کشور نے جلدی سے پورا گیٹ وا کیا۔ مراد شاہ گاڑی کو گیٹ سے گزار کر گھر کے مختصر پورچ میں لے آیا۔ کشور گیٹ بند کر کے تیزی سے گاڑی کی طرف لپکی اور دروازہ کھول کر اترتی ماہ بانو کو سہارا دیا۔ اس کا سہارا پا کر ماہ بانو جواب تک خود کو نہ جانے کس طرح سنبھالے ہوئے تھی، ڈھے سی گئی۔ تنہا کشور کے لیے اس کے وجود کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ مراد شاہ جو خود بھی گاڑی سے باہر آچکا تھا، اس بات کو محسوس کر کے لپک کر ان دونوں کے قریب پہنچا اور ماہ بانو کو سنبھالنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

وہ دونوں اسے لے کر اندر داخل ہوئے تو آفتاب بھی اپنے کام کو چھوڑ کر لاؤنج میں آچکا تھا۔ کال بیل کی آواز اس نے بھی سنی تھی اور جانتا تھا کہ کشور خود ہی دیکھ لے گی لیکن جب اس نے کسی گاڑی کے اپنے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی تو معاملہ جاننے کے لیے اٹھ گیا۔ ان کی اپنی زندگی اتنے غیر یقینی حالات میں گزر رہی تھی کہ ذرا بھی غیر معمولی پن چونکا دیتا تھا۔

''انہیں اندر بیڈ روم میں لے چلو۔'' یہ ایک دوسرے سے سلام دعا یا حال احوال معلوم کرنے کا موقع نہیں تھا چنانچہ آفتاب کو دیکھ لینے کے باوجود کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر کشور سے بولا۔ چند لمحوں میں وہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ مراد شاہ نے مختصراً بتایا کہ وہ اسے کہاں ملی تھی اور وہ کیوں اسے ان کے گھر تک لایا ہے۔ اپنے سانپ سے ڈسے جانے کا قصہ البتہ وہ گول کر گیا تھا۔

''میں مصطفیٰ خان کو اطلاع دیتا ہوں۔ اس دوران میں آپ لوگ اسے تھوڑی بہت فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کیجیے۔'' اس کی زبانی سب جان کر آفتاب نے کہا اور خود تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر کا ٹیلی فون استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور کسی پبلک بوتھ سے مصطفیٰ خان سے رابطہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماہ بانو کی حالت اتنی خراب ہے کہ اسے گھر پر مکمل طبی امداد نہیں دی جا سکتی اور ان حالات میں مصطفیٰ خان جیسا اثر رسوخ والا بندہ ہی زیادہ بہتر مدد کر سکتا تھا۔

ادھر کشور اور مراد شاہ اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ پورے جسم پر موجود زخموں میں سے کوئی بھی بہت زیادہ گہرا یا تشویش ناک نہیں تھا لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ حاملہ تھی اور نہ جانے کن کن صعوبتوں سے گزر کر آرہی تھی کہ آخر میں ہمت ہار کر بے ہوش ہی ہوگئی تھی۔ مراد شاہ کی مدد سے اس کے زخموں کو صاف کر [illegible] ہوش میں لا

''میری مصطفیٰ خان سے بات ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ دیر میں یہاں ایمبولینس پہنچ جائے گی۔'' آفتاب نے ایک اچھی خبر سنائی۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے بے ساختہ اطمینان کا اظہار کیا اور بولی۔ ''ماہ بانو کی حالت بہت خراب ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اسے لیبر پین شروع ہوگئے ہیں اس لیے اس کا جلد از جلد کسی اسپتال تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''ہم انتظار اور دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ آپ جائیں اور اس کا خیال رکھیں۔'' آفتاب نے اس سے کہا تو وہ پلٹ کر دوبارہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی جبکہ آفتاب صوفے پر خاموش بیٹھے مراد شاہ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں مراد بھائی؟'' قریب بیٹھنے پر اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو ذرا تشویش سے پوچھنے لگا۔

''ہوں۔'' مراد شاہ نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔ اسی وقت آفتاب کی نظر اس کی پتلون کے الٹے ہوئے پائنچے اور پنڈلی سے ذرا اوپر بندھی ٹائی پر پڑی۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے سانپ نے ڈسا ہے۔'' مراد شاہ نے آہستہ سے اعتراف کیا اور پھر تفصیل سے بتایا کہ کس طرح سانپ نے اسے ڈسا اور ماہ بانو نے اس کی مدد کی۔

''زہر مہرہ پتھر کی اس تاثیر کے بارے میں، میں نے بھی سنا ہے... لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے جسم سے سانپ کا زہر نکل چکا ہے؟'' اس کی پنڈلی پر موجود سانپ کے ڈسنے کے نشان اور اردگرد کی ہلکی سی نیلاہٹ کو دیکھتے ہوئے اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس پتھر کی وجہ سے خاصا فائدہ ہوا ہے ورنہ اتنے عرصے میں تو زہر میرے پورے جسم میں پھیل کر اپنا اثر دکھانا شروع کر چکا ہوتا... لیکن میں خود کو بہت معمولی سا متاثر محسوس کر رہا ہوں۔'' مراد شاہ نے جواب دیا۔

''پھر بھی آپ کو فوری ٹریٹمنٹ ملنا چاہیے۔ اتنا وقت یہاں ضائع کرنے کے بجائے آپ کو سیدھے اسپتال چلے جانا چاہیے تھا۔'' وہ بدستور تشویش میں مبتلا تھا۔

''میں اس لڑکی کی وجہ سے نہیں جا سکا۔ مجھے لگا کہ میرے اسپتال جانے کی صورت میں وہ کسی بڑی مشکل میں پھنس جائے گی۔'' بیڈ روم کے دروازے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے وجہ بتائی۔

اس وقت سب سے اچھی بات یہ تھی کہ امید سورہی تھی اور کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں تھا۔

''میں باہر جاتا ہوں۔ تم کوشش کر کے اس کا لباس تبدیل کروا دو۔'' مراد شاہ نے کشور سے کہا اور خود باہر نکل گیا۔ کشور نے اپنی وارڈروب میں شلوار قمیص کا ایک ڈھیلا ڈھالا جوڑا نکالا اور سخت جدوجہد کے بعد اسے تبدیل کروانے میں کامیاب ہوگئی۔ لباس کی تبدیلی کے دوران ماہ بانو کو قدرے ہوش آگیا اور وہ بڑے درد بھرے لہجے میں اسلم کو پکارنے لگی۔ اس کی اس پکار نے کشور کا دل تڑپا دیا۔ اسے اسلم کے حالات سے واقفیت نہیں تھی اور اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ ماہ بانو کی تلاش میں نکلا ہوا ہے اور اب ادھر ماہ بانو اسے پکار رہی تھی۔ یعنی ان دونوں ہی کے دل میں ایک دوسرے کے لیے شدید تڑپ تھی۔ محبت سے آشنا کشور نے اس تڑپ کو پوری شدت سے محسوس کیا اور دل میں ان دو دیوانوں کے مل جانے کی دعا مانگتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ گلاس میں نیم گرم دودھ لے کر وہ واپس کمرے میں آئی تو ماہ بانو کی آنکھیں بدستور بند تھیں لیکن وہ مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''ماہ بانو! آنکھیں کھولو ماہ بانو۔'' اس کے رخساروں کو آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے کشور نے اسے مسلسل آوازیں دیں تو اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں۔

''آنکھیں کھولو۔ اٹھو شاباش، تھوڑی سی ہمت کرو۔'' کشور نے بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر تکیوں کی مدد سے نیم دراز کی حالت میں بٹھایا اور دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

''پلیز، تھوڑا سا دودھ پی لو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔'' اس کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر کشور نے اسے سمجھایا تو اس نے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''تھوڑا سا اور...'' کشور نے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح اسے پچکارا۔ یہ کشور کی محبت کا اثر تھا یا ماہ بانو کی ذہنی پختگی کہ اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا سا دودھ اور پی لیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ درد کی زوردار لہر سے تڑپ اٹھی۔ کشور نے اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے تشویش بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی ماہ بانو کے دن پورے نہیں ہوئے ہیں لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ درد زہ سے گزر رہی ہے۔

ل ہوئے۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فراموش کرسکتا۔ اس پر ان دنوں کو یاد کر کے ہی نشہ سا طاری ہونے لگا تھا چنانچہ لپک کر بولا۔

''اوہ لنڈا مائی ڈارلنگ! تم نے تو میرا دل ہی خوش کر دیا۔ پلیز، اپنی گاڑی ڈاؤن ٹاؤن کی طرف لے لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوٹل جمیرہ میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کہیں لے جانا چاہتی ہوں۔'' لنڈا مردوں کے خود پر اس طرح نثار ہونے کی عادی تھی۔ اسے اپنی زبردست قوتِ تسخیر کا اچھی طرح علم تھا اس لیے چودھری کی حالت دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کہیں اور کہاں...؟'' اس کی بات سن کر چودھری کے کان کھڑے ہوئے اور وہ چوکنے پن سے پوچھنے لگا۔ ویسے بھی اس کا تجربہ اسے بتاتا تھا کہ عقل کو خبط کر دینے والی لنڈا جب بھی اس سے ملاقات کرتی تھی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی خاص وجہ موجود ہوتی تھی۔

''یہ سرپرائز ہے۔'' لنڈا نے اسے خوب صورتی سے ٹال دیا اور بے حد اصرار پر بھی کچھ نہیں بتایا۔ موضوعِ گفتگو ہی اس طرح بدل ڈالا کہ چودھری کو احساس بھی نہ ہو سکا اور حسبِ معمول وہ لنڈا کی عقل کو خبط کر دینے والی قوتِ تسخیر کے تابع ہو کر وہاں جا پہنچا جہاں وہ اسے لے جانا چاہتی تھی۔ یہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی ساتویں منزل پر موجود لگژری اپارٹمنٹ تھا جس کے ایک کمرے میں چودھری کی ناپسندیدہ ہستی پہلے ہی ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہوئی مسٹر الفا!'' اس نے دانتوں کو چباتے ہوئے الفا سے مصافحہ کیا۔

''لیکن ظاہر ہے مجھے نہیں ہوئی کیونکہ تم میری ہی فرمائش پر یہاں موجود ہو۔'' صوفے پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے الفا نے دل جلانے والے انداز میں کہا تو چودھری اپنی جگہ بل کھا کر رہ گیا لیکن اظہار نہ کر سکا۔

''خیریت... تم مجھ سے ملاقات کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟'' اس نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ ہموار ہی رہے کیونکہ اسے تجربہ تھا کہ اس کی طرف سے سخت ردِعمل پر الفا کا مزاج بگڑ جاتا تھا اور وہ چونکہ اس سے بہتر پوزیشن میں تھا، اس لیے آسانی سے اسے نقصان بھی پہنچا دیتا تھا۔

چودھری اس کے مزاج کی برہمی کو ملنے والے کثیر معاوضے میں کمی کی صورت ایک بار بھگت چکا تھا اور اب ایسا کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے علاقے میں وہ کتنا ہی جابر و ظالم اور مطلق العنان حاکم سہی لیکن ایک بین الاقوامی طرز کی جرائم پیشہ تنظیم کے آگے اس کے ذاتی اثر رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اتنے طاقتور لوگ تھے کہ جب چاہتے اسے چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ سکتے تھے۔

''تم سے کچھ کاروباری معاملات طے کرنے تھے لیکن بہتر ہوگا کہ پہلے ہم ایک ایک ڈرنک لے لیں۔ تم سفر سے آئے ہو، تھکے ہوئے ہو گے۔ ڈرنک لینے سے تم پر اچھا اثر پڑے گا۔'' خلافِ معمول الفا کا لب و لہجہ نرم تھا۔ ایک اچھے میزبان کی طرح اسے ڈرنک کی پیشکش کرنے کے بعد وہ لنڈا سے مخاطب ہوا۔

''ہنی! کیا تم ہم لوگوں کے لیے ڈرنک تیار کر دو گی؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور صوفے سے اٹھ کر بل کھاتی ہوئی اس کیبنٹ تک گئی جہاں بہت سی بوتلیں سجی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہاں سے ایک بوتل منتخب کرنے کے بعد وہ جملہ لوازمات کے ساتھ چودھری کے پہلو میں آ بیٹھی۔ تین جام تیار کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلا جام چودھری کو دیا۔ دوسرا الفا کو اور تیسرا اپنے ہاتھ میں تھام کر چودھری سے مزید قریب ہو بیٹھی۔ چودھری دہرے نشے میں مبتلا ہونے لگا۔ ہاتھ میں موجود بلوریں جام اگر آتشیں سیال کو معدے میں انڈیل کر اندر آگ لگا رہا تھا تو بھری بوتل جیسا خمار آلود وجود رکھنے والی لنڈا اپنے لمس سے اس کے تن من کو دہکا رہی تھی اور اس کو خود پر قابو پائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ الفا کے نزدیک شاید یہی گفتگو کا سب سے مناسب وقت تھا چنانچہ وہ کھنکھارتے ہوئے بولنا شروع ہوا۔

''تم جانتے ہو کہ تنظیم تمہیں تمہاری شمولیت اور تعاون کے بدلے میں شروع ہی سے بہت بھاری معاوضہ ادا کرتی چلی آ رہی ہے... کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ اپنے علاقے کے ایک بارسوخ جاگیردار کی حیثیت سے تم ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو گے...''

''تو کیا ایسا نہیں ہے؟ میں نے ہر لمحے تم لوگوں کا پورا پورا ساتھ دیا اور مجھے جو بھی ذمے داری سونپی گئی، اسے اچھی طرح ادا کرنے کی کوشش کی۔'' چودھری نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ کر اپنی خدمات گنوانا شروع کر دیں۔

''کوشش اور کامیاب کوشش میں فرق ہوتا ہے مسٹر چودھری۔ تمہاری کامیابی کا تناسب بہت کم رہا ہے۔ تم نہ تو وہ کارخانہ بچا سکے لیے کثیر سرمایہ کاری

کے پھیلاؤ کے لیے کچھ خاص کارکردگی دکھائی، اس لیے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہمارے لیے تمہاری افادیت ہمارے اندازے سے بہت کم رہی ہے۔'' الفا نے بغیر لاگ لپیٹ کے اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

''چلو یونہی سہی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ جیسے ناکارہ آدمی کو ملاقات کے لیے کیوں بلایا ہے؟'' اس کا تبصرہ سن کر چودھری کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ لنڈا نے فوراً اس کا بازو اپنے نازک ہاتھ سے یوں دبایا جیسے اس کے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی رہی اور غصے کی شدت سے بے قابو ہوتی چودھری کی سانسیں قابو میں آنے لگیں۔

''مسٹر الفا کا مقصد آپ کو بے عزت کرنا نہیں ہے چودھری صاحب۔ آپ ذرا تحمل سے ان کی بات سنیں۔ ظاہر ہے یہ آپ کو ماہانہ اتنی خطیر رقم ادا کر رہے ہیں تو جواب میں آپ سے بھی تو کچھ نہ کچھ چاہیں گے نا...'' چودھری کا بازو سہلاتے ہوئے وہ اسے بڑے رسان سے سمجھانے لگی تو چودھری کو اثبات میں سر کو جنبش دینی پڑی کہ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ واقعی وہ اکثر مقامات پر ناکام ہی رہا تھا۔

''ہم جانتے ہیں کہ تم پاکستان کے خفیہ اداروں کی نظر میں آ چکے ہو اور تمہاری فیکٹریوں سمیت تمام کاروباری مراکز کی نگرانی بھی کی جا رہی ہوگی اس لیے ہم اب ان جگہوں میں سے کہیں بھی اپنا ہیروئن سازی کا کام انجام نہیں دے سکتے اور موجودہ حالات میں ہمیں ایسی کسی جگہ کی اشد ضرورت ہے جہاں ہیروئن تیار کرنے کے بعد ہم آسانی سے منتقل کر سکیں۔ ایسی جگہ دستیاب ہونے سے ہمارے وقت اور لاگت دونوں کی بچت ہوگی اور ہمیں فی الحال تم سے ایسی ہی جگہ درکار ہے۔'' چودھری کو لائن پر آتا دیکھ کر الفا نے ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

''تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ میری ذات مشکوک ہے پھر میں تمہیں ایسی کوئی جگہ کیسے مہیا کر سکتا ہوں؟'' اس بار چودھری نے بہت سادگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''ایک ایسی جگہ تمہارے پاس ہے جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم وہاں کوئی غیر قانونی کام انجام دے سکتے ہو۔'' الفا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو چودھری الجھ گیا۔

نے چودھری کو اچھلنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ اس کی کیفیت سے بے نیاز اپنی ہی بولتا چلا گیا۔ ''سنا ہے تمہاری حویلی میں ایک بہت بڑا تہ خانہ ہے۔ اس تہ خانے میں ہم اپنا ہیروئن سازی کا سیٹ اپ لگا سکتے ہیں۔ ماہرین ہمارے اپنے بندے ہوں گے، باقی کاموں کے لیے تم آدمی فراہم کر دینا۔'' وہ جیسے سب کچھ طے کر کے آیا تھا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ میں حویلی کو ایسے کسی کام کے لیے استعمال کرنا بالکل پسند نہیں کروں گا۔'' چودھری نے لرزتی ہوئی آواز میں انکار کیا۔

''اسی پوائنٹ نے تو ہمیں حویلی کے انتخاب پر مجبور کیا ہے۔ مخالفین کی بھی یہی سوچ ہوگی کہ تم حویلی کو ایسے کسی کام کے لیے استعمال نہیں کر سکتے اس لیے وہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔'' الفا کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''میں نے کہا نا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس بار چودھری نے ذرا بلند آواز میں انکار کیا جس پر لنڈا نے فوراً ہی اس کا بازو زور سے دباتے ہوئے اسے ریلیکس رہنے کی خاموش درخواست کی۔

''ہماری دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ ہم اپنے لیے کام کرنے والوں کو آرڈر دینے اور جواب میں ان کا ''یس'' سننے کے عادی ہیں۔ ''نو'' کا آپشن ہمارے کسی ورکر کے پاس نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ لفظ استعمال کر کے وہ اپنے لیے موت کا انتخاب کر رہا ہے۔'' الفا نے سرد مہری سے اسے اس کی پوزیشن سے آگاہ کیا۔

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟'' چودھری کا جاگیردارانہ لہو یکدم ہی جوش مارنے لگا۔

''یہ دھمکی نہیں ہمارا اصول ہے جس سے میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اس وقت تم جوش سے کام لے رہے ہو، بہتر ہے کہ پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو پھر مجھے جواب دینا۔'' اسی سرد سے لہجے میں کہتے ہوئے الفا نے اپنی جگہ اچانک ہی چھوڑ دی اور لنڈا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''اس خبطی آدمی کو سمجھاؤ لنڈا! ہمارے ساتھ ضد کر کے یہ اپنا نقصان کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔''

''آپ بے فکر رہیں مسٹر الفا! چودھری صاحب میری بات ضرور سمجھ جائیں گے۔'' لنڈا نے اپنی لوچ دار آواز میں الفا کو یقین دہانی کروائی اور اس کے رخصت ہونے کے بعد چودھری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈارلنگ! کیوں سوچے سمجھے بغیر اس آدمی سے بھڑ رہے تھے۔ وہ تمہارے اندازے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"

"میں اس کا مطالبہ نہیں مان سکتا۔ وہ ہمارے پرکھوں کی حویلی ہے اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ پرکھوں کی اس عزت پر کوئی آنچ آئے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی کہ حویلی کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ الفاہت ذہین آدمی ہے۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی حویلی کا انتخاب کیا ہے۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ حویلی کا کوئی راز وہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہاں کے سارے ملازمین تمہارے وفادار ہیں۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم یہ کریں گے کہ کام کو اس طرح انجام دیں کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوسکے۔ مشینری اور ماہرین کو تہ خانے تک پہنچانے کے لیے باہر سے سرنگ لگائی جاسکتی ہے۔ حویلی کے پیچھے جو تمہارا خاندانی قبرستان ہے، وہاں سے تہ خانے تک سرنگ بنانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ جس عرصے میں یہ کام ہو تم لوگوں پر یہ ظاہر کرسکتے ہو کہ تم اپنے بزرگوں کی قبروں کی مرمت وغیرہ کروا رہے ہو۔" اسے اپنی قربت سے نوازتی وہ بہت سبھاؤ سے مشورے اور تجاویز پیش کررہی تھی اور ظاہر ہے ایک سیمیں بدن کے غنچہ دہن سے نکلی باتیں چودھری کی عقل کو خبط کرکے اسے انکار سے نیم رضامندی کی طرف لے جارہی تھیں۔

"ٹھیک ہے، یہ سب ہو جائے گا لیکن بعد میں جب مال لایا لے جایا جائے گا تو کسی کی نظر پڑسکتی ہے۔" اس نے اپنے دل میں موجود ایک اور اندیشہ بیان کیا۔

"کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔ میں گاؤں کی زندگی کے معمولات سے واقف ہوں۔ وہاں لوگ رات کو بہت جلدی سو جاتے ہیں اس لیے کام کرنے والے بندوں کے سوا کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم یہ کرسکتے ہیں کہ جس رات مال سپلائی ہونا ہو، اطراف میں پہرا لگا کر اس بات کو یقینی بنالیں کہ کوئی غیر متعلقہ شخص قبرستان کے قریب نہ آسکے۔" اب اس نے اپنا سر چودھری کے سینے پر رکھ دیا تھا اور بڑی مہارت سے اس کے خدشات دور کررہی تھی۔

"اور مال کو علاقے سے باہر کیسے نکالو گے؟ تمہیں معلوم ہوگا کہ پولیس باہر جانے والی گاڑیوں کی راستے میں تلاشی لیتی ہے؟"

"اوہو چودھری صاحب! آپ تو بہت ہی زیادہ فکرمند ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ جو پچھلا اے سی شہریار عادل تھا، اس کا خوف ابھی تک آپ کے دل سے نہیں نکلا۔ اس نے آپ کو بہت زیادہ ڈرا دیا ہے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" لنڈا کے طعنے پر وہ کھسیا گیا۔

"ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کو ایسی باتیں بھی نہیں کرنی چاہئیں۔ آخر ہم وہاں سے جنگل میں کاشت کی جانے والی افیون بھی تو نکال ہی رہے ہیں نا... تو تیار شدہ ہیروئن نکالنے میں کیا مسئلہ ہوگا؟ آپ کے جو ٹرک پھل اور سبزیاں لے کر جاتے ہیں، ان میں سے دو چار پیٹیوں میں ہیروئن چھپا کر نکال دی جائے گی تو کسے خبر ہوگی۔ یہ کوئی لکڑی اور جانوروں کی کھال کی اسمگلنگ کا معاملہ تو ہے نہیں کہ ذرا سی تلاشی پر مال سامنے آجائے۔ ذہانت اور احتیاط سے کام لیا جائے گا تو معمول کی چیکنگ کرنے والوں کے فرشتوں کو بھی بھنک نہیں ملے گی۔ ویسے بھی اب وہاں شہریار عادل کے دور جیسی چیکنگ نہیں ہوتی۔"

وہ اپنی نرم و نازک انگلیوں کا جادو چودھری کے بدن میں منتقل کرتی مستقل اس کی برین واشنگ بھی کرتی جارہی تھی۔ بالآخر چودھری کو اس کی ادائوں اور دلائل کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور وہ قائل ہوگیا کہ موجودہ حالات میں ہیروئن سازی کی تیاری کے لیے حویلی سے زیادہ مناسب مقام کوئی نہیں ہے۔ اپنی اس شکست کے بدلے اس نے ایک پوری رات کے لیے لنڈا کو جیت لیا اور اس کے نزدیک یہ سودا برا نہیں تھا۔

☆☆☆

شہریار کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا۔ بس وہ تکلیف کا احساس تھا جو اسے ہوش میں لایا تھا۔ اسے یوں لگا تھا کہ اس کے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ لاشعوری طور پر اس نے ان سوئیوں کو اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کی خواہش میں بازو میں ایک جگہ محسوس ہوتی چبھن کے مقام سے سوئی نکال کر پھینکنے کی کوشش کی تو اس کی انگلیوں نے کسی نرم اور لجلجی سی شے کا لمس محسوس کیا۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر مدقوق روشنی میں اس شے کو دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا کہ وہ ایک جونک ہے جس کا لجلجا جسم اس کے خون سے بھر چکا ہے۔ اس نے ہاتھ میں موجود جونک کو دور اٹھا کر پھینکا اور پھر دیوانوں کی طرح اپنے جسم کے مختلف مقامات پر چپکی خون چوستی جونکوں کو نوچ [illegible] تعداد ایک درجن سے

یا کر اسے گھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ان جونکوں کو خود سے الگ کرنے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اچانک ہونے والی اس روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ جب وہ اس تیز روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے بھنگا گر کو اپنے سامنے پایا۔

"کیا خیال ہے مسٹر! تم اپنے اور سلو کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار ہو یا نہیں؟" بھنگا گر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔ جواب میں وہ خاموش رہا۔

"یہ خاموشی تمہیں مشکل میں ڈال دے گی۔ جو کچھ تم نے سہا ہے، وہ صرف ٹریلر تھا۔ آگے ہمارے پاس تمہیں دکھانے کے لیے بہت کچھ ہے۔" شہریار ایک بار پھر خاموش رہا۔

"اس طرح خاموش بیٹھ کر اگر تم خود کو گونگا بہرا ثابت کرنا چاہ رہے ہو تو یہ کوشش بیکار ہوگی کیونکہ اس جگہ آکر تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔"

"لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔" بھنگا گر کی دھمکی کا اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"کچھ نہیں تو یہی بتا دو کہ سلو اس پنجرے سے فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟" ظاہر ہے بھنگا گر اس کے انکار پر سوال کرنا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

"تم یقین نہیں کرو گے لیکن میں سچ سچ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔" اس سوال کا جواب سچائی سے دینے میں کوئی عار نہیں تھا چنانچہ اس نے دے دیا۔

"گندی نالی کے کیڑے... کی اولاد... تو اپنی زبان سے نہیں اگلے گا تو میں... سے سب اگلوا لوں گا۔ تیرے جیسے پاکستانی کتے کی دم سیدھی کرنے کے لیے میرے پاس بہت طریقے ہیں۔" بھنگا گر نے اچانک ہی اسے مغلظات بکنا شروع کردیں اور اس پر پل پڑا۔ وہ بیک وقت ہاتھوں اور پیروں کا استعمال کررہا تھا۔ شہریار نے چار چھ ضربیں تو اپنے جسم پر کھالیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ بندھا ہوا نہیں ہے اور بھنگا گر کو اس کی اس جسارت کا جواب دے سکتا ہے چنانچہ خود بھی اس پر جوابی حملہ کردیا۔ اس کی کھڑی ہتھیلی کا وار بھنگا گر کے شانے پر پڑا تو وہ بلبلا اٹھا لیکن فوراً ہی جواب میں اس کی ناف کے پاس اپنا گھٹنا [illegible] کی وجہ سے [illegible] ہت زوردار تھا لیکن اپنے انسٹرکٹر عمر فاروق کی تربیت نے اس کے اندر اتنی قوتِ برداشت پیدا کردی تھی کہ وہ نہ صرف اس وار کو سہہ گیا بلکہ پلٹ کر بھنگا گر کے سینے پر اپنے سر کی زوردار ٹکر ماردی۔ بھنگا گر ٹکر کھا کر ذرا پیچھے ہٹا اور لات گھما کر اس کے پہلو میں رسید کی۔ اس کے بعد فوراً ہی اس نے ایک مکا شہریار کے جبڑے پر جڑ دیا۔

شہریار نے بھی ہمت نہیں ہاری اور جواب میں اس کی پیٹھ پر ایک لات رسید کی حالانکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس مقابلے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر وہ بھنگا گر کو شکست دینے میں کامیاب بھی رہا تو اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا کیونکہ کمرے کے ہر کونے میں جدید اسلحے سے لیس بھنگا گر کے ساتھی آکھڑے ہوئے تھے۔ البتہ انہوں نے اس لڑائی میں دخل اس لیے نہیں دیا تھا کہ بھنگا گر نے انہیں خود دخل اندازی سے روک دیا تھا۔

"تو یہاں سسک سسک کر پاگل کتے کی موت مرے گا اور مرنے سے پہلے میں تیرے اندر سے سب کچھ نکال لوں گا۔" ہاتھ پیروں کے ساتھ بھنگا گر کی زبان کو بھی سکون نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اپنے الفاظ سے اسے مستقل مشتعل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں جیسی بھی موت مروں لیکن آج تو اپنے آدمیوں کے سامنے میرے ہاتھوں ذلیل ہو کر رہے گا۔"

شہریار نے اسے جواب دیا اور یکدم ہی دونوں ہاتھوں سے اس دیوار کی طرف اچھال دیا جہاں اس کا گن بردار ساتھی کھڑا ہوا تھا۔ بھنگا گر کو اس پر اچھالنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر دھکا کھاتے سے اس کے آدمی کے ہاتھوں سے گن نکل گئی اور وہ اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تو بازی پلٹ سکتی ہے۔ چنانچہ بھنگا گر کو اچھالتے ہی خود بھی اس طرف چھلانگ لگائی۔ اس کی حسب توقع گن مین دھکا لگنے سے گر گیا تھا اور اس کے ہاتھ سے گن نکل کر دور جا گری تھی لیکن اس موقع پر بھنگا گر نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا اور لیٹے لیٹے ہی اس کی راہ میں اس طرح ٹانگ اڑائی کہ وہ گن تک پہنچنے سے قبل ہی گر گیا۔ یہ بات محسوس کرکے کہ وہ گن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے، مختلف کوٹوں میں کھڑے دوسرے گن مین بھی حرکت میں آگئے تھے۔ انہوں نے اس کے سنبھل کر اٹھنے سے قبل ہی اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"فرار کا سپنا من سے نکال دو مسٹر! یہاں صرف وہ آتے ہیں جنہیں ہم لائیں اور واپس کوئی نہیں جاتا۔" اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوران میں خود کو سنبھال کر کھڑے ہو جانے والے بھنا گر نے اس کے پہلو میں ایک زوردار لات رسید کی اور نفرت زدہ لہجے میں بولا۔

''ہتھیاروں کے زور پر مجھے زیر کر کے خود پر اترانے کے بجائے ہمت ہے تو اپنے زور بازو پر مجھ سے جیت کر دکھاؤ۔'' شہریار نے اپنی سمت اٹھی گنوں کو دیکھتے ہوئے اسے چیلنج کیا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ان جدید گنوں کی موجودگی میں حرکت کرنا جذباتی حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

''یہ کوئی فائٹنگ ونگ نہیں ہے جو میں اس طرح کے چیلنجز قبول کرنے کی حماقت کروں۔ نہ ہی مجھے خود کو سورما ثابت کرنے کا شوق ہے۔ تم میرے دیش کے دشمن ہو اور میں دشمن کے ساتھ ہر طرح کا برتاؤ کرنے کو جائز سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے اپنے دشمنوں سے بہادری کا سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ اپنے سوالوں کے جواب چاہیے ہوتے ہیں۔''

اس کے چیلنج کے جواب میں بھنا گر سرد مہری سے بولا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو ان میں سے ایک نے اسے زوردار ٹھوکر لگائی اور سخت لہجے میں بولا۔ ''چل اٹھ۔''

شہریار اپنے دکھتے ہوئے جسم کو سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تاخیر کی صورت میں مزید مار کھانا پڑے گی۔ ویسے ان لوگوں کے پاس اس کے لیے اذیت رسانی کے سوا کچھ تھا بھی نہیں۔ اسے ان کی قید میں کئی گھنٹے گزر گئے تھے اور کچھ کھلانا تو دور کی بات، انہوں نے اسے پانی تک نہیں پلایا تھا۔

اب تک وہ جتنی اذیت سے گزر چکا تھا، اس کے باعث خاصی کمزوری محسوس کر رہا تھا اور اپنی زائل ہوتی توانائی کو بحال کرنے کے لیے اسے کم از کم ایک گلاس پانی پینے کی شدید خواہش تھی لیکن اپنی اس خواہش کو زبان پر لا کر وہ انہیں اپنی کمزوری کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی جس ڈگر پر چل پڑی تھی، وہ اس کی گتھائیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دشمنوں کی گرفت میں آجانے والے سیکرٹ ایجنٹ کے نصیب میں اذیتوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان اذیتوں سے یا تو موت نجات دلاتی ہے یا پھر حب الوطنی اور ضمیر کے سودے سے تھوڑی آسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔ آزادی اور رہائی کسی ایک آدھ خوش نصیب کے حصے میں ہی آتی ہے اور اسے اپنے بارے میں علم نہیں تھا کہ ایسے خوش نصیبوں میں اس کا شمار ہے یا نہیں۔ فی الحال تو وہ اپنی قوتِ برداشت کا امتحان دینے اور دیتے رہنے کے لیے تیار تھا، یہاں تک کہ اس قید خانے یا زندگی سے رہائی نصیب ہو جائے۔ سودے بازی بہر حال اسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔

''یہ چکر دیکھ رہے ہو نا؟ جب یہ چلنا شروع ہو گا تو پہلے تم اپنے شریر کو کسی تنے ہوئے تار کی طرح محسوس کرو گے اور دھیرے دھیرے یہ تناؤ اتنا بڑھے گا کہ تمہارے شریر کا جوڑ جوڑ کھلنے لگے گا۔ تمہاری ساری ہڈیاں چیخ جائیں گی اور ماس ریشہ ریشہ ہو جائے گا۔'' گن مین اسے دھکیل کر لکڑی کی ایک میز تک لے گئے تھے اور اسے میز پر لٹانے کے بعد اس کے ہاتھوں پیروں کو ایسے آہنی شکنجوں میں کس دیا گیا تھا جن کے ساتھ لوہے کی زنجیریں منسلک تھیں اور ان زنجیروں کے سرے چرخیوں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ راوالوں نے اپنے دشمنوں سے راز اگلوانے کے لیے ٹھیک ٹھاک قسم کا عقوبت خانہ بنا رکھا تھا جہاں اذیت رسانی کے جدید و قدیم ہر طرح کے آلات موجود تھے۔ اس وقت اسے ایک قدیم طرز کے اذیت رسانی کے طریقے سے گزارا جانے والا تھا۔ چرخیاں دیکھ کر وہ خود بھی کافی کچھ سمجھ گیا تھا، باقی وضاحت بھنا گر نے کر دی۔ شاید وہ جسمانی اذیت دینے سے قبل اسے اعصابی طور پر توڑ پھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مدِمقابل کو ایمان کی حرارت اور راہِ دہشت گردوں کے لیے سخت نفرت نے اتنا سخت جان بنا دیا تھا کہ وہ اس کے جسم کو تو توڑ پھوڑ سکتے تھے لیکن اس کے اعصاب پر حاوی ہونا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

''اسٹارٹ۔'' بھنا گر نے اس کے چہرے پر خوف و دہشت کا کوئی تاثر نہیں دیکھا تو دانت کچکچاتے ہوئے اپنے ماتحت کو حکم دے دیا۔ فوراً ہی دونوں جانب نصب چرخیاں حرکت کرنے لگیں، ان کی حرکت بہت دھیمی تھی۔ شاید اس لیے کہ اذیت رسانی کا شکار ہونے والا بہت ہار کر زبان کھولنے کی ہامی بھر لے تو فوراً ہی اس سلسلے کو روک کر اسے بولنے کی مہلت دے دی جائے ورنہ چرخیوں کے تیز چلنے کی صورت میں تو بہت تیزی سے بندہ اپنے انجام کو پہنچ سکتا تھا۔

''ہیلو۔'' ابھی زنجیروں کے کھنچنے کی وجہ سے شہریار کے جسم میں تناؤ پیدا ہونا شروع ہوا ہی تھا کہ بھنا گر نے اپنے موبائل پر کسی کی کال ریسیو کی۔

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اس نے ہنگلے سے بھاگنے کے بعد بھائی جی سے کانٹیکٹ نہیں کیا۔ تو مجھے کوئی نئی انفارمیشن دے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

کے بعد اس نے نہایت بدتمیزی سے اس سے کہا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد پھر بولا۔

''دیکھ ہیرا... تجھے نہیں پتا کہ وہ کیسی بلا ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اس لیے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر ہم اس کو پکڑنے میں ناکام رہے تو وہ ہمیں کتنی مشکل میں ڈال دے گا۔ چپے چپے پر اپنے آدمی پھیلا کر انہیں اس کی تلاش میں لگا دو۔ ہمارے ریکارڈ میں اس کے بہت سارے فوٹو گرافس ہیں۔ ان کے اور پرنٹس نکلواؤ اور سب میں بانٹ دو... اور کچھ چاہیے تو وہ بھی بولو لیکن اسے پکڑو۔ مجھے وہ زندہ یا مردہ ہر حال میں اپنے پاس چاہیے۔'' چیخ چیخ کر بولتا وہ خود کتنی اعصابی کشیدگی کا شکار ہے، یہ اس کے انداز سے ظاہر تھا۔ شہریار نے بھی اس گفتگو کا ہر لفظ سنا اور سمجھ گیا کہ ہنوز وہ لوگ سلو کی تلاش میں ناکام ہیں۔

''میرے آدمی اسے نہیں ڈھونڈ سکے تو تُو سالا اگلے گا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔'' فون سے فارغ ہو کر بھنا گر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے تنے ہوئے جسم پر ایک لات رسید کر دی۔ اب معلوم نہیں کہ اس نے قوت زیادہ لگائی تھی یا زخم زخم وجود کے ساتھ تنی ہوئی حالت میں شہریار کو اس کی شدت زیادہ محسوس ہوئی اور اسے اپنی چیخ کو روکنے کے لیے باقاعدہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں بھینچ کر اپنا منہ بند رکھنا پڑا۔ بھنا گر نے دوسری لات اس کے بجائے اسٹریچ تھا لکڑی کی اس میز پر ماری جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔ پاؤں میں نصب پہیوں کی وجہ سے میز فوراً ہی حرکت کرتی ہوئی اس کے نیچے سے نکل گئی اور اس کا جسم ہوا میں معلق ہو گیا۔ لمحہ لمحہ بڑھتے تناؤ کے ساتھ معلق حالت میں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے اور مساموں سے پسینا پھوٹ پڑا۔ چرخی دھیمی رفتار سے مستقل چلتی رہی اور جسم میں تناؤ کی کیفیت میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک اسے محسوس ہوا کہ اس دو طرفہ کھنچاؤ کی وجہ سے یا تو اس کے جسم کے سارے جوڑ کھل جائیں گے یا وہ دو حصوں میں منقسم ہو جائے گا۔ اذیت اس انتہا کی تھی کہ اس کی قوتِ ارادی جواب دے گئی اور حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ کتنے ہی مضبوط اعصاب کا مالک سہی لیکن بہر حال وہ تھا تو گوشت پوست کا بنا انسان جس کی برداشت کی بہر حال ایک حد ہوتی ہے۔ اس کی

گرداب

اذیت کا یہ سلسلہ رکا تو نڈھال سا شہریار ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ بھنا گر نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا تو اس نے شہریار کے منہ میں پانی کے چند قطرے ٹپکائے۔ شہریار نے پانی کے ان قطروں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اتارا۔

''تو پھر تم میرے سوالوں کے جواب دینے کو تیار ہو؟'' بھنا گر نے اس کے قریب آکر بڑے زعم سے پوچھا۔ گویا اب اس کی طرف سے انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''تم میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر سکتے ہو۔ جسم سے میری روح نکال سکتے ہو لیکن چند چھٹانک کی اس زبان سے وہ کہیں نکلوا سکتے جو تم سننا چاہتے ہو۔'' شہریار نے نہایت نفرت سے اس کی بات کا جواب دیا تو ذلت کے احساس سے بھنا گر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ چیخ کر بولا۔

''چکر چلاؤ اور اب اس وقت تک نہیں روکنا جب تک اس کی آتما اس کے شریر کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔'' اس کا حکم صادر ہوتے ہی شہریار پر قیامت ٹوٹ پڑی اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ خود بھی اپنی بھیانک چیخیں سننے سے محروم ہو گیا۔

☆☆☆

''چودھری افتخار بھارت سے دبئی پہنچ گیا ہے۔''

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر کار اسے لوٹ کر یہاں آنا ہی ہے۔'' ذیشان کی دی ہوئی اطلاع پر جاوید علی نے دانت کچکچا کر تبصرہ کیا۔

''واپس تو خیر وہ ضرور آئے گا۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کون سے ٹھوس ثبوت ہیں جو وہ ڈر کر یہاں کا رخ نہ کرے۔'' ذیشان نے حقیقت بیان کی تو جاوید سوچ میں پڑ گیا اور پوچھا۔

''طوائف کے قتل والے کیس کا کیا ہوا؟ اس میں تو چودھری چندا بائی کے ساتھ نامزد مجرم تھا نا؟''

''میری عمیر سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ اس کیس کے دونوں اہم گواہ اور مدعی چاندنی اور شاہد اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے چودھری اور چندا بائی کے خلاف کیس واپس لینے کی درخواست دائر کر دی ہے۔''

''اوہ نو...'' ذیشان کی دی ہوئی اطلاع نے اسے صدمہ پہنچایا۔ ''عمیر نے اس سلسلے میں معلومات تو کی ہوں گی۔ کیا ان دونوں کو ڈرا دھمکا کر کیس واپس لینے پر مجبور کیا گیا ہے؟''

''امکان تو یہی ہے لیکن وہ دونوں اس سلسلے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

زبان نہیں کھول رہے ہیں۔ عمیر نے جگو کے ذریعے صورتِ حال جاننے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بس دونوں میاں بیوی کی ایک ہی رٹ ہے کہ اب وہ یہ کیس نہیں لڑنا چاہتے۔'' ذیشان نے اسے بتایا تو وہ افسردہ ہوگیا۔

''یہ بہت برا ہوا۔ قتل کے کیس سے چودھری نے اتنی آسانی سے اپنی جان چھڑالی۔''

''اس جیسے جاگیرداوں کے لیے ایسے کیسز کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ ان سے اپنی جان چھڑانے کے طریقے اچھی طرح جانتے ہیں اسی لیے تو مزے سے انسانی جانوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک طوائف کی کیا حیثیت ہے۔ چودھری کے اعمال نامے میں تو نہ جانے کتنے معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خونِ ناحق لکھا ہوا ہے لیکن ہر بار وہ ثبوت اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے بچ نکلتا ہے۔ شہریار کے دور میں اس نے اساتذہ کے رہائشی مکان میں آگ لگوادی تھی جس کے نتیجے میں ایک نوجوان استاد غیب جل کر مر گیا تھا لیکن چودھری کا کچھ نہیں بگڑا۔ گاؤں والوں میں سے کسی نے چودھری یا اس کے کارندوں کے خلاف گواہی دینے کی زحمت نہیں کی۔'' ذیشان حقائق بیان کرتے ہوئے خود بھی خاصا تلخ ہوگیا۔

''ہمارا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے کہ ہم ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں رکھتے اور اپنی بزدلی سے ظالم کو مزید ظالم بناتے جاتے ہیں۔'' جاوید علی نے تبصرہ کیا اور خیال آنے پر پوچھا۔ ''آپ چودھری کی ٹیلی فون کالز بھی تو ٹیپ کرواتے والے تھے، اس کام کا کیا ہوا؟''

''کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔'' ذیشان نے شانے اچکائے۔ ''حویلی کی لینڈ لائن سمیت چودھری اور اس کے خاص ملازمین کے موبائل فونز تک کی کالز چیک کی جارہی ہیں لیکن کہیں سے کوئی کلیو نہیں مل رہا۔ ہمارے پاس کالز کی جو ریکارڈنگ پہنچ رہی ہے، ان میں چودھری کی کسی غیر قانونی سرگرمی کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ پوری طرح چوکنا ہے اور اسے اندازہ ہے کہ فون پر کی جانے والی گفتگو اس کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی ہے اس لیے وہ احتیاط کررہا ہے۔'' ذیشان کا جواب سن کر اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ایسا ہی لگتا ہے لیکن مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ پھر چودھری اپنے یہاں کے کام کیسے چلا رہا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے آدمیوں کو ہدایات تو دینی پڑتی ہوں گی۔ ملازمین بھی اسے یہاں کی اطلاعات دیتے ہوں گے لیکن جو ریکارڈنگز ہمارے پاس آتی ہیں، ان میں کوئی من گن نہیں ہے۔ تم شاہد اور چاندنی والے معاملے کو ہی لے لو۔ اگر چودھری کے کارندوں نے اپنے طور پر بھی ان کے خلاف کارروائی کی تھی تو اس کا رنامے کو چودھری کے سامنے بیان تو کرنا چاہیے تھا لیکن بالکل خاموشی ہے۔ کیا تم یقین کرسکتے ہو کہ پیرآباد سے دور ہونے کے باوجود چودھری یہاں کے معاملات سے بے خبر ہوسکتا ہے؟'' ذیشان نے ایک اہم سوال اٹھایا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چودھری کے لیے پیرآباد کی اہمیت مسلم ہے۔ وہ دنیا میں کہیں بھی آوارہ گردی کرتا پھرے لیکن لوٹ کر اسے ہر حال میں پیرآباد ہی آنا ہے۔ اس کا اصل راج پاٹ تو وہیں ہے۔'' جاوید علی نے بڑی بے ساختگی سے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

''بس مجھے یہی تشویش ہے کہ وہ رابطے کا کون سا ذریعہ استعمال کررہا ہے؟'' اس کی تائید ملتے ہی ذیشان پُرجوش ہو گیا۔ ہم نیٹ سے لے کر فیکس اور ٹیلی گرام تک رابطے کے کسی بھی ذریعے سے غافل نہیں ہیں پھر بھی اندھیرے میں ہیں تو اس کی کوئی تو وجہ ہوگی۔ بس وہ وجہ ہی معلوم نہیں ہورہی ہے، البتہ چودھری کا فشی اللہ رکھا جس موبائل کمپنی کی سم استعمال کرتا ہے، اس نے یہ عجیب وغریب بات بتائی ہے کہ بعض اوقات منشی کے موبائل فون کی گھنٹی بجتی ہے لیکن جیسے ہی ریکارڈنگ مشین کام کرنا شروع کرے، کال کٹ جاتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسی کسی کال کا کھوج بھی نہیں ملتا کہ یہ کس نمبر اور علاقے سے کی جارہی تھی۔''

''یہ تو واقعی بہت عجیب بات ہے سر۔'' ذیشان کی بات سن کر وہ بے چین ہوگیا۔ ''یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے اور چودھری جن لوگوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے چودھری کو کوئی ایسی ڈیوائس دے رکھی ہو جس کی وجہ سے ہم اس کی کالز تک نہیں پہنچ پارہے۔'' جاوید علی بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا لیکن ان کی مجبوری بھی کہ ان کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ دشمنوں کو اپنی چالیں چلنے دو۔ ایک نہ ایک دن تو ہم انہیں انجام تک پہنچا کر رہیں گے۔'' ذیشان نے اپنے عزم کا اظہار کیا تو جاوید علی فوراً ''انشاءاللہ'' کہہ اٹھا۔

''تمہیں معلوم ہے جاوید، تم میرے سب سے قابل ماتحت ہو اور کل مجھے بھ

عادل خان کی بہت فکر ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی ہے اور ڈر رہا ہوں کہ وہ کہیں پھنس نہ گیا ہو۔'' یہ ان کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن ذیشان دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس کے سامنے اپنی پریشانی بیان کر بیٹھا۔

''یہ عادل خان وہی تو نہیں ہیں سرجنہوں نے کراچی میں میرے ساتھ کام کیا تھا؟ وہ بہت ذہین اور بہادر آدمی ہیں اور میری خواہش ہے کہ مجھے پھر کبھی دوبارہ ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل سکے۔''

''ہاں، میں اسی عادل خان کی بات کررہا ہوں۔''

''تو پھر مجھے یقین ہے کہ بھارتی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ اگر ان کی گرفت میں آبھی گئے تو زیادہ دن قابو میں نہیں رہیں گے۔ ان جیسے بہادروں کو زیر کرنا بھارتی چوہوں کے بس کی بات نہیں ہے۔'' اس نے بڑے یقین سے ذیشان کو امید دلائی۔

''اللہ کرے تمہارا یہ گمان سچ ثابت ہو۔ میں بھی اس کے لیے کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں۔'' جاوید علی کو یہ مختصر جواب دے کر وہ بظاہر اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن ذہن بہت سی فکروں میں الجھا ہوا تھا۔ ان فکرات میں شہریار کی سلامتی کے علاوہ ماہ بانو کی فکر بھی شامل تھی۔ اسے مشابرم خان کے آرلینڈو پہنچنے کی خبر مل گئی تھی لیکن اس کے بعد ابھی تک ہنوز خاموشی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ مشابرم خان وہاں مصطفیٰ خان کی معاونت سے کیا کچھ کررہا ہے۔ وہ تو اس دن سے بھی خوف زدہ تھا جب شہریار سے سامنا ہوتا اور وہ اسے ماہ بانو سے متعلق کوئی اچھی خبر دینے سے معذور ہوتا۔

☆☆☆

مشابرم خان جنگل میں تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے مصطفیٰ خان نے ایک آدمی کو بھی ساتھ کردیا تھا۔ وہ دونوں تمام ضروری سامان سے لیس تھے اس لیے انہیں جنگل میں سفر کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی اور وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے جارہے تھے۔ مصطفیٰ خان نے انہیں لیب کی لوکیشن سے کافی حد تک آگاہ کردیا تھا اس لیے ان کا سفر ایک مخصوص سمت میں جاری تھا۔

''جنگل میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔'' مشابرم خان کے ساتھی نے بہت دور اٹھتے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر اسے بلند آواز میں آگاہ کیا۔

''واقعی... لیکن یہ آگ لگی کیسے؟'' مشابرم خان نے بھی [illegible] کرلی بات

نہیں ہے۔ مختلف قدرتی عوامل کی وجہ سے ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ یہ آگ لگ بھگ اسی جگہ پر لگی ہوئی ہے جہاں لیب کی موجودگی کا امکان ہے۔'' اس نے بتایا تو مشابرم خان کے چہرے پر پریشانی دوڑ گئی۔

''اب ہم کیا کریں فہد... ہمیں تو جانا ہی لیب کی طرف تھا؟''

''ہمارے پاس آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جنگل میں آگ بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ آگے بڑھنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ہمارے پاس واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' فہد نے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

''لیکن ہم اس طرح ناکام کیسے واپس لوٹ سکتے ہیں؟ مصطفیٰ صاحب کو پورا یقین تھا کہ ماہ بانو کو اس لیب میں رکھا گیا ہے۔ اگر لیب جل رہی ہے تو ماہ بانو کی زندگی کو بھی تو خطرہ ہوگا۔ ہمیں اسے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔'' مشابرم خان بے چین ہوگیا۔

''تمہارا خدشہ غلط نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال کر اس لڑکی کو بچا لینے کا امکان ہوتا تو میں کبھی انکار نہیں کرتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اگر وہ اس وقت لیب میں موجود ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔ ہم بھی اس کی زندگی کے لیے کسی معجزے کی دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔'' وہ بہت حقیقت پسندی سے کام لے رہا تھا۔ مشابرم خان کو بھی قائل ہونا پڑا کیونکہ بہت زیادہ فاصلہ ہونے کے باوجود اندازہ ہورہا تھا کہ آگ کی شدت بہت زیادہ ہے اور کسی ذی روح کے بچنے کا امکان نہیں لیکن پھر بھی اس کا دل وہاں سے واپسی کے لیے آمادہ نہیں ہورہا تھا۔

ماہ بانو کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ شہریار عادل کی ایسی محبت تھی جس کا اس نے کبھی زبان سے اعتراف یا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کے ہر ہر عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دنیا کا ہر سکھ اور خوشی دینے کا خواہش مند ہے۔ شہریار جب حادثے کا شکار ہوا اور نامعلوم مدت کے لیے کومے کی حالت میں اسپتال کے بستر پر لیٹ گیا تو اس وقت وہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے ہر وقت یہ دکھ کھائے جاتا تھا کہ اگر میں اے سی صاحب کے ساتھ ہوتا تو اپنی جان وار کر بھی انہیں بچا لیتا لیکن قسمت نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ اب اسے موقع ملا تھا کہ شہریار نہ سہی، اس کی محبت کو بچا لے تو ساری راہیں مسدود ہوگئی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو یار... واپس چلو۔ یہاں آگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بجھانے کی کوششیں شروع ہوئیں تو ہم کسی کی نظروں میں آجائیں گے اور جواب دہی کرنی پڑے گی کہ ہم بغیر پرمٹ کے جنگل میں کیا کررہے ہیں۔'' اسے سوچوں میں گھرا دیکھ کر فہد نے اسے ٹوکا۔

''تم واپس چلے جاؤ فہد... میں ماہ بانو کو لیے بغیر واپس نہیں جاسکتا۔'' آخرکار اس نے اپنا فیصلہ سنادیا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ اس وقت تم اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ میرے ساتھ واپس چلو۔ ہمیں واپس جاکر سر سے حالات کے مطابق نئی ہدایات لینی ہوں گی۔'' فہد نے جھنجلاتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ فہد نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر وہ دونوں ہی چونک گئے۔ بلاشبہ وہ فائر کی ہی آواز تھی جو انہیں سنائی دی تھی۔ وہ دونوں ہی اسلحہ شناس تھے اس لیے آواز سن کر بھی اندازہ لگاسکتے تھے کہ فائر رائفل یا شارٹ گن کے بجائے پسٹل سے کیا گیا ہے اور ظاہر ہے شکاری حضرات پسٹل کا استعمال نہیں کرتے۔

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' مشابرم خان فوراً ہی آواز کی سمت دوڑا۔ فہد نے بھی اس کی پیروی کی۔ ایک فائر کے بعد انہیں کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بس وہ اندازے سے ہی ایک سمت بڑھتے جارہے تھے۔ بھاگتے ہوئے انہیں اس بات کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا کہ ان کے قدموں تلے سوکھے پتے آکر نہ چرمرائیں کیونکہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا صورتِ حال ہے اور انہیں دوست دشمن یا غیر جانب دار میں سے کس کا سامنا کرنا ہے۔

''وہ دیکھو، وہ کیا ہے؟'' اچانک ہی فہد نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا تو مشابرم خان نے بھی اس طرف نظر ڈالی۔ وہ ایک موٹر سائیکل تھی جو بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ موٹر سائیکل سے کچھ فاصلے پر انہیں آڑی ترچھی حالت میں پڑی ایک آدمی کی لاش بھی دکھائی دے گئی۔ لاش کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی تھی جس سے بھیجا باہر آگیا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی اندازہ قائم کرلیا کہ گولی کا نشانہ بننے والا شخص یہی ہے لیکن گولی چلانے والے کا کچھ اتا پتا نہیں تھا اسی لیے وہ سامنے آتے ہوئے بھی احتیاط کررہے تھے کہ کہیں وہ چھپا ہوا آدمی انہیں ہی نشانہ نہ بنالے۔ درختوں کی آڑ سے چپکے چپکے جائزہ لیتے ہوئے پہلے مشابرم خان کی نظر ایڈی پر پڑی۔

''وہ دیکھو، وہاں ایک بچہ پڑا ہوا ہے۔ وہ شدید زخمی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس کا سینہ حرکت کررہا ہے۔'' زخمی ایڈی کو دیکھ کر وہ پُرجوش ہوگیا۔

''میں جاکر اسے دیکھتا ہوں۔ تم یہیں رک کر مجھے کور دو اور ارد گرد پر نظر رکھو۔'' اب اس کے لیے اپنی جگہ پر رکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ ایک سات آٹھ سالہ بچے کو جنگل میں زخمی حالت میں بے یارومددگار پڑا دیکھتے رہنا کسی بھی انسان دوست کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ فہد کی طرف سے کوئی جواب ملنے سے قبل ہی وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر بچے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اس کی نبض چیک کی۔ نبض بہت آہستہ چل رہی تھی اور اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اگر اسے فوری طبی امداد نہیں ملی تو وہ زندہ نہیں بچ پائے گا لیکن اس جنگل سے اسپتال تک پہنچنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ پیدل تھے اور انہیں جنگل کے قریب ڈراپ کرکے جانے والا ان کا ساتھی واپس لوٹ چکا تھا۔ ایڈی کا سر ذرا سا اوپر اٹھا کر اس نے پہلے اپنے پاس موجود پانی کی بوتل سے اس کے چہرے پر چھینٹے دیے پھر بوتل اس کے ہونٹوں سے لگادی۔ بہت تھوڑا سا پانی اس کے منہ کے اندر گیا اور زیادہ تر باچھوں سے بہہ گیا پھر بھی مشابرم خان نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے سہلا کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرتا رہا۔ اس عمل کے دوران اسے احساس ہوا کہ بچہ اس کے اندازے سے زیادہ زخمی ہے۔ اس کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور کچھ بعید نہ تھا کہ اندرونی اعضا کو بھی نقصان پہنچا ہو پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کرلینا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقتاً اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے کس طرح فرسٹ ایڈ دے۔ اس کا جسم بری طرح لہولہان ہورہا تھا اور لباس کی رنگت پر خون کی سرخی غالب آگئی تھی۔ اس حالت میں یہ سمجھنا ہی مشکل تھا کہ اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی ہیں۔ بس ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کا سر خاصی حد تک محفوظ تھا اور سر اور چہرے پر چند معمولی سی خراشوں کے علاوہ کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

''آہ... آہ...'' آخرکار اس کی کوششیں رنگ لائیں اور بچے کے منہ سے کراہیں نکلیں لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور پپوٹے یوں حرکت کررہے تھے جیسے وہ انہیں کھولنے کی کوشش کررہا ہو۔

''اے بچے اٹھو... آنکھیں کھولو اور بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' مشابرم [illegible] آنکھیں کھولنے میں

شدید نقاہت تھی۔ حقیقتاً اس کا اتنا زیادہ خون بہہ چکا تھا کہ آنکھیں کھول لینا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔ وہ صرف حالیہ حادثے میں ہی زخمی نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے قبل اسے ٹانگ میں گولی بھی لگ چکی تھی۔ گولی کا وہ زخم بھی اس حالیہ بھاگ دوڑ میں کھل گیا تھا اور خون کا بہاؤ دوگنا ہوگیا تھا۔

''بیٹا! تم کون ہو اور یہاں اس جنگل میں کیسے پہنچے؟'' مشابرم خان نے محبت اور ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ایک گائیڈ اور پھر افسران کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنے کی وجہ سے اس کی انگریزی کی استعداد اچھی تھی اس لیے وہ اس معاملے میں کسی دشواری کا شکار نہیں تھا۔

''میں تو پیدا ہی اس جنگل میں ہوا ہوں۔'' مشابرم خان کے سوال کے جواب میں یہ جملہ کہہ کر ایڈی نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف کے باعث بس ہونٹ بھنچ کررہ گئے۔

''کیا مطلب؟'' مشابرم خان حیران ہوا۔

''تم پتا نہیں کون ہو لیکن میری زندگی ختم ہونے والی ہے، اس لیے میں تمہیں سب کچھ بتادیتا ہوں، اس امید پر کہ شاید تمہارے ذریعے یہ داستان باہر کی دنیا تک پہنچ جائے۔'' اس کا انداز گفتگو مشابرم خان کو حیران کررہا تھا۔ اس نے آج تک کسی بچے کو اس انداز میں بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تو ایڈی تھا۔ پروفیسر ہنری کی تحقیق اور تجربات کا نتیجہ جو اپنے آٹھ سالہ وجود میں جوان آدمی کا دماغ اور جذبات رکھتا تھا۔

''اس جنگل میں زیرزمین ایک تجربہ گاہ ہے جہاں نوزائیدہ بچوں اور حاملہ خواتین کو تجربات سے گزارا جاتا تھا۔ اس لیب کا انچارج پروفیسر ہنری تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا بچہ ''ایجاد'' کرسکے جو دیکھنے میں تو بچہ ہی لگے لیکن اس کی کھوپڑی میں بڑے آدمی کا دماغ ہو۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے کیا مقصد تھا یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس چکر میں اس نے بڑا ظلم کیا اور انسان کے بچوں کو گنی پگ کی طرح اپنے تجربات کی نذر کردیا۔ اس کے ظلم و ستم کا یہ سلسلہ پتا نہیں کب تک جاری رہتا لیکن خدا کی قدرت سے وہ ماہ بانو نامی ایک ایسی حاملہ عورت کو اپنی تجربہ گاہ میں لانے کی غلطی کر بیٹھا جس کا شوہر اس سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔'' ماہ بانو کا نام سن کر مشابرم خان بری طرح [illegible] اسے اس نے اسے

بتادیا کہ کیسے اسلم ان لوگوں کو لے کر لیب سے نکلا اور پھر پروفیسر سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے ساتھ ہی ایک دلدل میں جا گرا۔ اس نے ماہ بانو کو یہاں سے نکالتے اور پھر طارق کو گولی مار دینے تک کے سارے ضروری واقعات بیان کر دیے لیکن اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ مشابرم خان کو باقاعدہ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے نزدیک لے جانا پڑا تھا۔

ایڈی کی زبانی اسلم کی موت اور ماہ بانو کے زندہ بچ نکلنے کی اطلاع نے اسے بیک وقت افسوس اور خوشی کے جذبات سے ہمکنار کردیا تھا اور وہ پہاڑوں کا بیٹا ہونے کے باوجود آنکھوں سے آنسو بہا رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے آنسو ایڈی سے اظہارِ عقیدت کے لیے بھی تھے جس نے اپنے نحیف و نزار وجود کے ساتھ ماہ بانو کو طارق جیسے شیطان کے چنگل سے نکال دیا تھا۔

''ہم تمہیں اسپتال لے جاتے ہیں۔ وہاں تمہیں بہتر ٹریٹمنٹ ملے گا تو تم بچ جاؤ گے۔'' اسے احساس ہورہا تھا کہ ایڈی کی نبض پہلے کے مقابلے میں مزید سست ہوچکی ہے پھر بھی اسے امید دلانے لگا۔

''نہیں، مجھے مزید گنی پگ بن کر زندہ رہنا منظور نہیں۔ ویسے بھی اب میرا وقت پورا ہوگیا ہے۔ تم ہمت کرسکو تو یہ داستان دنیا کے سامنے لے آنا۔'' ایڈی نے اپنی آنکھوں کی بجھتی روشنی میں امید کا دیا جلاتے ہوئے اس سے کہا تو اسے یقین دلانے کے لیے مشابرم خان نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں دوست کہ ایک دن یہ راز دنیا کے سامنے لاکر دنیا کی سب سے مہذب قوم ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی اخلاقی پستی اور مجرمانہ ذہنیت کو ضرور عریاں کروں گا کیونکہ تم میرے محسن ہو اور تم نے جس لڑکی کی جان بچائی ہے، وہ مجھے اپنی سگی بہن کی طرح عزیز ہے۔'' ایڈی سے وعدہ کرتے ہوئے مشابرم خان جذباتی ہوگیا۔

''اب مجھے اطمینان ہوگیا لیکن یاد رکھنا کہ سب سے پہلے اپنی بہن کی حفاظت کا بندوبست کرنا ہے تمہیں۔ وہ اس جنگل سے نکل جانے کے باوجود پوری طرح محفوظ نہیں ہے۔ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ لوگ ضرور اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔'' اس نے کسی سمجھ دار آدمی کی طرح مشابرم خان کو نصیحت کی پھر اس سے تھوڑا سا پانی پلانے کی درخواست کر بیٹھا۔

مشابرم خان نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کے ہونٹوں سے لگائی۔ ایڈی نے ایک گھونٹ حلق سے نیچے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتارا اور پھر ایک زوردار ہچکی لے کر آنکھیں موند لیں۔ باقی کا پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ مشابرم خان بوتل رکھ کر اسے دیوانہ وار ٹٹولنے لگا لیکن اس کے چھوٹے سے وجود میں کہیں زندگی کی کوئی رمق موجود نہیں تھی۔

''ہمیں یہاں سے چلنا ہوگا خان۔'' فہد جونہ جانے کب اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو وہ ہوش میں آیا اور ایڈی کا سر آہستگی سے واپس زمین پر رکھ دیا۔ اس معصوم و مظلوم وجود کو یوں چھوڑ کر جانا اس پر گراں گزر رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ ایڈی کی وصیت پر عمل کرنے اور ماہ بانو کی سلامتی کا انتظام کرنے کے لیے ان کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا ورنہ تاخیر کی صورت میں وہ خود بھی پھنس سکتے تھے۔ وہ فہد کے ساتھ واپسی کی راہ پر گامزن ہوا تو دل بری طرح بوجھل تھا۔

☆☆☆

''کیا خبر ہے ڈاکٹر؟'' کلینک کی انتظار گاہ میں بیٹھی کشور نے ڈاکٹر کی شکل دیکھتے ہی سوال کیا تو ڈاکٹر تسلی آمیز انداز میں دھیرے سے مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کے دونوں مریض خطرے سے باہر ہیں۔ خاتون سے ملاقات میں تو فی الحال کچھ وقت لگے گا لیکن آپ چاہیں تو مسٹر شاہ سے مل سکتی ہیں۔''

''مسٹر شاہ...'' کشور جو مراد شاہ کے سانپ سے ڈسے جانے کے واقعے سے لاعلم تھی، حیران ہوئی۔ ''انہیں کیا ہوا ہے؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟ انہیں نہایت خطرناک سانپ نے ڈسا تھا لیکن یہاں آنے سے پہلے اچھی فرسٹ ایڈ مل گئی تھی اس لیے زہر زیادہ پھیل نہیں سکا۔'' ڈاکٹر کے انکشاف پر کشور کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یہاں آتے وقت اس کی پوری توجہ ماہ بانو کو سنبھالنے پر مرکوز رہی تھی اس لیے اسے مراد شاہ کی حالت کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور اسے ایمبولینس میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ ان کے تنہا ہونے کے خیال سے ساتھ جا رہا ہے کیونکہ آفتاب تو امید کی وجہ سے گھر پر رہنے پر مجبور تھا لیکن اب اسے یاد آ رہا تھا کہ ان کے ایمبولینس میں سوار ہوتے وقت آفتاب نے ایمبولینس کے ڈرائیور سے کچھ گفتگو کی تھی جو یقیناً مراد شاہ کے متعلق ہی ہوگی۔

''میں مسٹر شاہ سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر سے فرمائش کی۔

''کیوں نہیں۔ وہ روم نمبر تین میں موجود ہیں۔''

ڈاکٹر نے اسے بتایا تو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر کلینک کے اس حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں مریضوں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا جسے انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والا ایک ڈاکٹر اپنے معاونین کی مدد سے چلا رہا تھا۔ مصطفیٰ کے اس ڈاکٹر سے گہرے مراسم کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی تھی کہ مذہبی طور پر ڈاکٹر بھی مسلمان ہی تھا البتہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس ایک ظاہری وجہ کے علاوہ بھی کوئی ایسی وجہ ہوگی کہ مصطفیٰ خان نے ان حالات میں اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ماہ بانو کو یہاں بھجوایا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی لالہ؟ آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ آپ کو سانپ نے ڈسا ہے؟'' بیڈ پر نیم دراز مراد شاہ کو دیکھتے ہی اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی زبانی سنی خبر اس کے لیے تو ایک صدمہ ہی ثابت ہوئی تھی ورنہ تو اسے یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کلینک پہنچ کر مراد شاہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔

''ریلیکس بہنا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اسی لیے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا کہ خوامخواہ تمہاری پریشانی میں اضافہ ہو جائے گا۔'' مراد شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

''لیکن یہ ہوا کیسے؟ یہاں ایسے واقعات اتنے عام تو نہیں ہیں۔'' وہ ساری تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ جواب میں مراد شاہ نے اپنے سانپ سے ڈسے جانے اور ماہ بانو کی مدد سے لے کر ان کے گھر تک پہنچنے کی ساری کتھا سنا ڈالی جسے سن کر کشور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اگر آج ابا جی میرے سامنے ہوتے تو انہیں ضرور احساس دلاتی کہ وہ لڑکی جس کی زندگی برباد کرنے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، آج آپ کے بیٹے کی زندگی بچانے کا وسیلہ بن گئی۔''

''کیا مطلب؟'' اس بار حیران ہونے کی باری مراد شاہ کی تھی۔

''یہ ابا جی کے ظلم کی بڑی شرمناک داستان ہے جسے آپ کے سامنے بیان کرتے ہوئے مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔''

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔'' کشور کے گریز نے مراد شاہ کے تجسس میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے اصرار پر کشور نے مختصراً مناسب الفاظ

''یہ تو واقعی

شفاف لڑکی ہے وہ۔ اسے تو ایک نظر دیکھ کر اس کا احترام کرنے کو دل چاہتا ہے اور ابا جی نہ جانے کیسے تین تین بیٹیوں کے باپ ہوتے ہوئے بھی اتنی معصوم اور کم سن لڑکی کے لیے ناپاک عزائم رکھتے تھے۔'' اپنے باپ کے کردار سے آگاہ ہوتے کے باوجود اسے دلی رنج ہوا۔

''لالہ! اللہ کے بعد آپ پر ماہ بانو کا احسان ہے کہ اس وقت آپ صحیح سلامت بیٹھے ہوئے ہیں اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ اس کے لیے ضرور کچھ کیجیے گا۔ ابا جی کی اولاد میں سے واحد آپ ہی ہیں جو ان کے مقابل کھڑے ہو سکتے ہیں اور وارث کی حیثیت سے آپ کا فرض بھی بنتا ہے کہ ان کے کیے کی تلافی کریں۔'' کشور نے اس سے درخواست کی۔

''بالکل... مجھ سے جو ہو سکا اس کے لیے ضرور کروں گا لیکن تم یہ بتاؤ کہ اس کا ابھی کیا حال ہے؟'' مراد شاہ نے اسے یقین دہانی کرواتے ہوئے ماہ بانو کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔'' مراد شاہ کو جواب دیتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی معلومات ادھوری ہیں۔ دراصل بھائی کے بارے میں خبر سن کر فطری طور پر وہ اس کے لیے اتنی فکرمند ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر سے ماہ بانو کے بارے میں تفصیلات جاننے کا خیال ہی نہیں رہا تھا اور اب اپنے اس رویے پر شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ اور اس کی خیر خبر لو۔'' مراد شاہ نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے رسان سے کہا تو وہ کمرے سے نکل گئی اور انکوائری سے ماہ بانو کا کمرا معلوم کر کے وہاں پہنچ گئی۔ ماہ بانو تکیے پر سر رکھے گہری نیند سو رہی تھی اور ایک نرس اس کی دیکھ بھال کے لیے مستعد بیٹھی ہوئی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟'' اس نے نرس سے ہی دریافت کیا۔

''پہلے سے بہت بہتر ہیں لیکن ابھی بہت دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ کیس خاصا مشکل تھا اور ان کی حالت کو مزید مشکل بنا دیا تھا۔ میرے خدا... میں نے اپنے آٹھ سال کے کیریئر میں کسی حاملہ خاتون کو اتنی بری حالت میں نہیں دیکھا۔ حقیقتاً ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے ان کے زخموں کی مرہم پٹی کریں یا پے بی کو ڈیلیور کروائیں۔ بس سمجھیں کہ

ندگی بچ گئی ورنہ

یا کانوں کو ہاتھ

لگا لیے۔

''ان کے ہاں کیا ہوا ہے، بیٹا یا بیٹی؟'' کشور نے تجسس سے پوچھا۔

''بیٹا ہے لیکن ابھی اسے ہم نے انڈر آبزرویشن رکھا ہوا ہے۔'' نرس نے اسے اطلاع دی۔

''اس کی جان کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا؟ اصل میں، میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ پری میچور بچے عام طور پر بہت کمزور ہوتے ہیں اور ان کا سروائیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' سوال کرنے کے ساتھ ہی اس نے وضاحت بھی پیش کی۔ ماہ بانو ان کی گفتگو سے بے نیاز بے خبر سوئی ہوئی تھی اور یقیناً ایسا مسکن دواؤں کے استعمال کی وجہ سے تھا۔

''ارے نہیں، صحت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عمومی پری میچور بچوں کے مقابلے میں اس کی صحت بہت اچھی ہے اور وزن کے اعتبار سے وہ بالکل نارمل بچوں جیسا ہے۔ لیکن اس کا بایاں ہاتھ نارمل سائز کا نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے اس ہاتھ کو استعمال کرنے سے قاصر رہے گا۔ ڈاکٹرز جائزہ لے رہے ہیں کہ اس میں کوئی اور کمی یا پیچیدگی تو نہیں ہے۔'' نرس نے پروفیشنل انداز میں آگاہ کیا تو کشور افسردہ ہو گئی اور اسے دکھ ہونے لگا کہ اتنی تکلیفوں کے بعد ماہ بانو کو ملنے والی یہ خوشی بھی ادھوری سی ہے۔ اسی وقت دروازہ ناک کر کے بلقیس اندر داخل ہوئیں۔

''کیسی ہے مہرین؟'' انہوں نے ماہ بانو کا وہ نام لے کر پوچھا جو اس کے پاسپورٹ پر درج تھا۔ چونکہ ان کی مخاطب کشور تھی، اس لیے اس نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

''اوہ مائی گاڈ! میرے پاس بھی اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' انہوں نے افسوس سے کہا اور بتانے لگیں۔ ''مصطفیٰ کو اطلاع ملی ہے کہ اسلم کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ وہ ایک دلدل میں گر گیا تھا جہاں سے اسے نکالا نہیں جا سکا۔'' ان کی دی اس اطلاع نے کشور کو لرزا کر رکھ دیا۔

''میرے اللہ...! یہ لڑکی آخر اتنے صدمے ایک ساتھ کیسے برداشت کرے گی؟'' وہ سخت متفکر تھی۔

''ہمیں اسے حوصلہ دینا ہوگا۔ یوں بھی یہ بہت باہمت لڑکی ہے، جلد یا بدیر اللہ کی رضا میں راضی ہو جائے گی۔ وہ مالک اپنے بندوں کو آزمائش میں ضرور ڈالتا ہے لیکن ان پر ظلم نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس اتنی پیاری لڑکی کے لیے ان دکھوں کے بعد کوئی بہت اچھا صلہ رکھا ہوگا اس نے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسز بلقیس مصطفیٰ زیادہ بردبار خاتون تھیں اس لیے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور مثبت انداز میں سوچنے لگیں۔ ان کی سوچ سے کشور کو بھی ڈھارس ملی اور ساتھ ہی یہ تسلی بھی ہو گئی کہ وہ بلقیس کے ساتھ مل کر اس صورتِ حال سے زیادہ اچھی طرح نمٹ سکے گی۔ کسی کو حوصلہ دینے کے لیے انسان کے اپنے پاس بھی حوصلہ ہونا ضروری ہوتا ہے اور اس وقت بلقیس اس کا حوصلہ بن گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ بے لباسی کی حالت میں ٹھنڈے فرش پر پڑا ہوا تھا اور جوڑ جوڑ دکھتے جسم میں فرش کی ٹھنڈک اتر کر درد کے احساس کو مزید سوا کر رہی تھی۔ بھوک، پیاس اور تشدد نے جسم کو اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ کروٹ بدلنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا اور ہوش میں ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو حلقوں میں حرکت کر رہی تھیں لیکن ان کے سامنے بھی دھندسی چھائی ہوئی تھی اور کوئی منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ یکدم ہی اسے دھند کے اس پار حرکت کا احساس ہوا۔ کوئی تھا جو دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

وہ بصارت پر زور دے کر آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی نظروں نے سب سے پہلے سیاہ رنگ کی اس چادر کو فوکس کیا جس پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ وہ چونک گیا۔ اس قید خانے میں بھلا عورت کا کیا کام تھا؟ حیرت زدہ سا وہ چادر میں لپٹے اس ہیولے کو اپنی طرف بڑھتا دیکھتا رہا جس کے نقش و نگار واضح نہیں تھے لیکن یہ چادر اس کے لیے ضرور آشنا تھی۔ میں نے اس چادر کو کہاں دیکھا ہے؟ اس نے اپنی یادداشت پر زور دیا اور پھر یکایک ذہن میں جھماکا ہوا۔ یہ چادر تو اس نے بلتستان کے سفر کے دوران بشام ہوٹل میں قیام کرنے پر ایک ویٹر سے خرید کر ماہ بانو کو دی تھی۔ وہ ویٹر اپنے گھر کی عورتوں کے ہاتھوں تیار کردہ دستکاری کے نمونے گاہکوں کو فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل کرتا تھا۔ اسے یہ چادر ماہ بانو کے لیے اتنی پسند آئی کہ فوراً ہی خرید لی اور واقعی چادر ماہ بانو پر سج گئی تھی لیکن یہاں کون تھا جو وہ چادر پہنے اس کے سامنے چلا آیا تھا۔ وہ اپنی پوری جان آنکھوں میں سمو کر دھند سے ابھرتی اس شبیہہ کو دیکھنے لگا اور جب اس کے نقش و نگار واضح ہوئے تو گویا شادیِ مرگ میں مبتلا ہو گیا۔

"ماہ بانو... تم... تم یہاں کیسے؟" اس نے استعجاب و خوشی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"میں آپ کے لیے آئی ہوں۔ آپ اتنی تکلیف میں تھے کہ میں آپ سے دور رہ ہی نہیں سکی اور سب چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس چلی آئی۔" وہ اس کے قریب دوزانو بیٹھتی ہوئی اپنی شیریں آواز میں بولی تو وہ خوش ہو گیا۔ کسی کے لیے آپ اتنے اہم ہوں کہ وہ آپ کے لیے سب چھوڑ دے، یہ احساس ہوتا ہی بہت خوش کن ہے لیکن اس کی خوشی پل بھر کی ہی تھی کیونکہ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ماہ بانو! تم اب اسلم کی ہو۔ تم پر بس اس کا حق ہے۔" دل پر جبر کر کے اس نے ماہ بانو کو ٹوکا۔

"نہیں، مجھ پر سب سے پہلے آپ کا حق ہے کیونکہ میرا آپ سے دل کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ سب رشتوں پر بھاری ہوتا ہے۔" وہ جو اس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیا کرتی تھی، ضدی لہجے میں بولی۔

"دنیا ان باتوں کو نہیں مانتی۔" اس نے کمزور سے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور میں دنیا کو نہیں مانتی۔" وہ مزید ضدی ہوئی۔

"اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔ حلق بالکل خشک ہو رہا ہے۔" اس نے بحث ٹالنے کے لیے فرمائش کی۔ یوں بھی اسے بہت شدید پیاس لگ رہی تھی۔ اس کے فرمائش کرتے ہی ماہ بانو نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے بہت بے چینی سے گلاس سے گھونٹ بھرنے کی کوشش کی لیکن جانے کیا ہوا کہ گلاس ماہ بانو کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور سارا پانی بہہ گیا۔

"نہیں..." وہ زور سے چیخا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے عقوبت خانے کے منظر میں ماہ بانو تھی اور نہ ہی زندگی کو رواں رکھنے والا پانی۔ وہ محض ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسا خواب جو اس کے دل کے چور خانوں میں چھپی تصویر کو سامنے لے آیا تھا۔ عام حالات میں اسے اپنے اعصاب پر اتنا قابو رہتا تھا کہ وہ کبھی ماہ بانو کے خیال کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے لیے زندگی کو سہل بنانے کی کوششیں اپنی جگہ لیکن اس کی پاکیزہ محبت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اسلم کی منکوحہ کو اپنے تصور میں لانے کی جسارت کر سکے۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ انسان انتہائی خوشی اور تکلیف میں اسے یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہو... سو وہ بھی لاشعوری طور پر ماہ بانو کو اپنے تصور میں [illegible] تصور بھی ذرا دیر کا تھا اور حقیقت

پڑا تھا کہ جوڑ جوڑ دکھتے جسم کو اپنی مرضی سے حرکت دینے کا بھی اہل نہیں تھا۔

اسے اس حال کو پہنچا دینے والے سور ماؤں کو اس کی اتنی خراب حالت کے باوجود ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر ڈالے چنانچہ انہوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ کر ڈالا ہوا تھا۔ ہر بار غیر انسانی تشدد سے گزارنے کے بعد وہ اسے یونہی تھوڑا سا دوقفہ دیا کرتے تھے کہ شاید وہ اپنی شکست تسلیم کر لے لیکن وہ اپنی شکستہ حالت کے باوجود ذہنی طور پر ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہاں، جان وہ ضرور لے سکتے تھے اور اس کے جانے کا اسے غم نہ ہوتا کہ وہ سر سے کفن باندھ کر ہی گھر سے نکلا تھا۔

مکمل ہوش میں آنے کے بعد اپنے عزائم کو دل میں دہراتا وہ یونہی وقت کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر فوراً ہی اس کے نتھنوں سے ایک اشتہا انگیز خوشبو ٹکرائی۔ اس خوشبو کو سونگھ کر خالی معدے میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور اس نے فوراً دروازے کی سمت دیکھا۔ ایک آدمی کھانے کی ٹرالی لیے اندر آ رہا تھا۔ ٹرالی اندر لا کر اس نے اس کرسی کے سامنے رکھ دی جس پر بیٹھ کر بھٹنا گر اس سے مذاکرات کرتا تھا۔ ٹرالی لانے جانے کے چند لمحوں کے بعد بھٹنا گر خود بھی اندر آ گیا اور کرسی پر بچھ کر بیٹھ گیا۔

"واہ... کیا شاندار مہک ہے۔ سواد بھی لازمی اچھا ہوگا۔" ٹرالی کے قریب چہرہ کر کے اس نے ایک گہری سانس کے ساتھ کھانے کی خوشبو اپنے اندر اتاری اور جھوم کر بولا۔ شہریار سمجھ گیا کہ وہ اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے چنانچہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔

"چکن تکے سے اسٹارٹ کرتا ہوں۔ ایسا سنہری اور خستہ چکن تکا میں نے اپنے جیون میں پہلے نہیں دیکھا۔" اس کے بے نیازی برتنے کے باوجود وہ باز نہ آیا اور بلند آواز میں بول کر کھانا شروع کر دیا۔ اس کے کھانے کی آوازیں شہریار کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کتا ہڈیاں بھنبھوڑ رہا ہو۔

"ارے بھئی، ہمارے مہمان کو تو کچھ دو۔ کہتے ہیں مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے اور بھگوان کی سیوا کرنا تو ضروری ہے نا... چلو پھر شروع ہو جاؤ۔" اس کا یہ خطاب یقیناً را

ہوا۔ کھٹر پٹر کی چند آوازوں کے بعد قدموں کی چاپ اس کے قریب آ کر بند ہو گئی اور وہ اس کے بال سختی سے مٹھی میں جکڑ کر چلایا۔

"چل اوئے مہمان کے بچے، تیری خوراک کا سمے ہو گیا ہے۔" اس نے زنجیروں میں جکڑے شہریار کے سر پر زبردستی ایک آہنی خود پہنا دیا۔ شہریار جو آنکھیں کھول چکا تھا، یہ دیکھ کر چونک گیا کہ آہنی خود کے ساتھ بجلی کے تار جڑے ہیں اور اسے خود پہنانے والا تاروں کے ساتھ موجود ساکٹ میں پلگ لے کر سوئچ پینل میں موجود ساکٹ میں لگا رہا ہے۔ وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے۔

"اپنے سارے حربے آزما کر دیکھ لو بھٹنا گر لیکن تمہیں حاصل کچھ نہیں ہونے والا۔" اس نے بھٹنا گر کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے چیلنج کیا۔

"تم کچھ بھی کہو ہمیں تو اپنی پرم پرا پوری کرنی ہے۔ ہم تمہاری پوری خاطر کریں گے تاکہ مرتے سے یہ شکایت نہ کرو کہ ہم سے تمہاری سیوا میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔" اس نے جواب دیا اور پھر اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ادھر شہریار پر قیامت ٹوٹ گئی۔ بجلی کے وہ جھٹکے کتنی دیر تک اسے دیے گئے، وہ صحیح حساب تو نہیں لگا سکا لیکن حقیقتاً اس پر سے ایک قیامت گزر گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اوّل اوّل اس نے ضبط سے کام لینے کی کوشش کی اور چیخوں کو حلق میں ہی گھونٹتا رہا لیکن پھر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی اور حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ فوراً ہی برقی رو منقطع کر دی گئی اور وہ ہانپتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کی حالت بری ہو گئی تھی اور اب پورا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

"اپنی ہار مان کر سب کچھ بتانے کا وعدہ کرو تو میرے ساتھ اس کھانے میں شریک ہو سکتے ہو ورنہ ہمیں تمہاری کچھ نہ کچھ خاطر تو کرنی ہی ہے۔" بھٹنا گر جو اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے اس کی حالت کا بغور جائزہ لے رہا تھا، بیک وقت ترغیب اور دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

"تجھ جیسے حرام کے پلے کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے مقابلے میں مجھے اپنی جان سے جانا منظور ہے۔" شہریار نے نفرت سے جواب دیا جسے سن کر بھٹنا گر کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

"اس کے دماغ کا علاج کرو۔" اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا اور ایک بار پھر شہریار کو اس قیامت سے گزرنا پڑا۔ اس بار دورانیہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رکھے ہوئے تھے جبکہ اس کی گن اس کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی۔ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ پہرے دار کا ساتھی تھا جو چائے لینے گیا ہوا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں یہاں بازی پلٹ گئی تھی۔ پورے اطمینان سے واپس آتے ہوئے وہ اس منظر کا گمان بھی نہیں کرسکتا تھا جو اس کے سامنے تھا۔ چنانچہ پہلے ردِعمل کے طور پر اس نے یوں منہ کھولا جیسے اپنے سامنے بھوت دیکھ لیا ہو پھر چائے کی ٹرے ہاتھ سے چھوڑ کر گن سنبھالنی چاہی لیکن اس سے قبل ہی سلو حرکت میں آچکا تھا۔ اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی سے جست لگائی اور آنے والے کے گن سنبھالنے سے پہلے اس پر جا پڑا۔

اگلے لمحے وہ اس کے نیچے تھا اور سلو ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبوچے دوسرے سے اسے تابڑ توڑ مکے مار رہا تھا۔ اس دوران میں شہریار بھی حرکت میں آیا اور دروازے کے قریب جاکر باہر جھانکا۔ کہیں کسی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کرلیا اور پلٹ کر سلو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے شکار کی اچھی خاصی درگت بنا چکا تھا اور اس طرح اس پر چھا گیا تھا کہ اسے جوابی ردِعمل ظاہر کرنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

''عمارت میں کتنے لوگ ہیں؟'' اسے سیکنڈوں میں اچھا خاصا ادھ موا کردینے کے بعد اس نے سوال کیا جس کے جواب میں اس آدمی نے زور سے نفی میں گردن ہلائی جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے راضی نہیں ہے۔

''اس سے سوال جواب میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے آف کردو۔ ہم باہر نکل کر خود ہی سب سے نمٹ لیں گے۔'' شہریار کا اندازہ تھا کہ راکے کسی گرگے سے معلومات اگلوانا اتنا آسان نہیں ہوگا اس لیے اس نے سلو کو مشورہ دیا

''تم ابھی دیکھنا کہ یہ کیسے طوطے کی طرح فرفر بولے گا۔'' سلو یکدم ہی کھڑا ہوگیا اور اپنا ایک پیر اس آدمی کے سینے پر رکھنے کے بعد دوسرے کو کچھ اس انداز میں اس کی گردن پر رکھا کہ اس کا چہرہ بائیں رخ پر مڑ گیا اور جسم نے ایک زور کا جھٹکا کھایا لیکن منہ آزاد ہونے کے باوجود اس کے حلق سے ہلکی سی خرخراہٹ کے سوا کوئی آواز برآمد نہیں ہوسکی۔

''اب بولو کہ یہاں کتنے آدمی موجود ہیں؟'' سلو کے لہجے میں درندے کی سی غراہٹ تھی۔ سوال کرنے کے بعد اس نے اس شخص کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ تھوڑا کم کیا۔ وہ فوراً ہی کسی کتے کی طرح ہانپ ہانپ کر سانس لینے لگا۔

''میرے سوال کا جواب دو۔'' سلو نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

''بتاتا ہوں...'' وہ رحم طلب لہجے میں بولا اور پھر فرفر بتانا شروع کردیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق عمارت میں کل سات افراد موجود تھے جن میں سے دو کو تو وہ یہاں ڈھیر کرہی چکے تھے جبکہ باقی پانچ میں سے دو آپریشن روم میں ڈیوٹی دے رہے تھے اور تین نے ریٹائرنگ روم میں تاش کی محفل جمائی ہوئی تھی جس کے ساتھ شراب کا دور بھی جاری تھا۔ بھٹناگر کے بارے میں معلوم ہوا کہ فی الحال وہ وہاں موجود نہیں ہے اور کسی کام سے نکلا ہوا ہے۔

عمارت کے بارے میں اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہاں سے نکلنے کے لیے مین گیٹ کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اور مین گیٹ کو صرف آپریشن روم سے ہی کھولا اور بند کیا جاسکتا تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار موجود نہیں تھا۔ ان معلومات کے حصول کے دوران سلو کو بار بار اس کی گردن پر دباؤ بڑھانا پڑتا تھا جب وہ رواں ہوتا تھا ورنہ بار بار اٹک جاتا تھا۔ سلو کو جب یہ اندازہ ہوگیا کہ اب اس کے پاس کچھ بتانے کو باقی نہیں بچا ہے تو اس نے اس کی گردن پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈال دیا۔ دباؤ پڑنے پر وہ شخص بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔

''ہمارے سامنے دو ٹارگٹ ہیں... ایک آپریشن روم اور دوسرا ریٹائرنگ روم۔ دونوں جگہ ایک سے زائد افراد ہیں اس لیے ہم وہاں گوریلا ایکشن کے بجائے ڈائریکٹ ایکشن پر مجبور ہوں گے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں جگہ بیک وقت ایکشن لیا جائے۔ لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری کیا پوزیشن ہے؟ میرے اندازے کے مطابق تم پر جتنا ٹارچر ہوا ہے تمہارے لیے فی الوقت تیزی سے حرکت کرنا بھی مشکل ہوگا۔'' اس آدمی کو اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد وہ شہریار سے مخاطب ہوا۔

وہ لوگ جس جگہ موجود تھے، وہ اس اعتبار سے بڑی اچھی تھی کہ یہاں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا اور انہوں نے اطمینان سے ساری کارروائی نمٹائی تھی۔ شاید اس حصے کو وہ صرف بطور ٹارچر سیل استعمال کرتے تھے اس لیے وہاں دو محافظوں کے علاوہ کسی کی مستقل آمدورفت نہیں تھی اور دوسرے افراد صرف اسی وقت یہاں رخ کرتے تھے جب کسی قیدی سے پوچھ گچھ کرنا مقصود ہو۔

''میں میسج

کی حالت اگرچہ واقعی خاصی خراب تھی لیکن خود پر اتنا اعتبار تھا کہ ہاتھ پیر بے شک زیادہ نہ چلا پائے لیکن اسلحے کے زور پر کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ اسی خیال کے تحت اس نے محافظ کی گن بھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور پسٹل جیب میں ڈال لیا تھا۔

''اوکے... پھر تم آپریشن روم کی طرف جاؤ، میں ریٹائرنگ روم والوں سے نمٹتا ہوں۔''

سلو نے فیصلہ کرتے ہوئے یقیناً اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ شہریار کے حصے میں کم افراد آئیں کیونکہ مردہ حالت میں پڑے محافظ کی اطلاع کے مطابق آپریشن روم میں صرف دو افراد تھے۔ دونوں کمروں کی لوکیشن وہ معلوم کرچکے تھے اس لیے وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اطراف کا دھیان رکھتے ہوئے وہ دبے قدموں آگے بڑھتے رہے۔ شہریار کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے کیونکہ جس محافظ کا لباس اس نے پہنا تھا، اس کے جوتے اس کے پاؤں میں نہیں آسکے تھے اور دوسرے کے جوتے چیک کرنے کا اسے خیال نہیں آیا تھا۔

''جب تمہاری طرف سے فائر کی آواز آئے گی، تب میں ایکشن لوں گا۔'' انگریزی حرف ایل کی شکل والے برآمدے میں ریٹائرنگ روم پہلے پڑتا تھا جبکہ آپریشن روم برآمدے کے مڑنے کے بعد دوسرے حصے میں تھا اس لیے اسے سرگوشی میں آگاہ کرکے سلو وہیں رک گیا جبکہ وہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر آپریشن روم کے سامنے جاکر ہی رکا۔ کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے ابھی اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے ساختہ ہی رک گیا۔

''یس سر!'' کال ریسیو کرنے والے کے مؤدبانہ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی اہم آدمی سے بات کررہا ہے۔

''سبھاش صاحب اور باقی لوگ ابھی ڈنر سے فارغ ہوئے ہیں۔ میں انہیں آپ کا میسج پہنچا دیتا ہوں۔'' شہریار کو دوسری طرف کی بات سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ آرہا تھا کہ کوئی ایسا پیغام دیا گیا ہے جو ریٹائرنگ روم میں موجود افراد تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے اعصاب اپنی جگہ تن گئے کیونکہ امکان یہی تھا کہ وہ شخص پیغام پہنچانے کے لیے کمرے سے باہر نکلے گا اور اس کی مجبوری یہ تھی کہ جب تک وہ فون پر مصروف تھا، ایکشن لینے کی غلطی نہیں کر [illegible] کسی بھی گڑبڑ [illegible] اس نے

انتظار کرلینا ہی مناسب سمجھا حالانکہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی طرف سے کارروائی کے آغاز میں تاخیر سلو کو تشویش میں مبتلا کررہی ہوگی۔

''اپنے بھٹناگر صاحب کو جانے کیا ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے انہیں کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا۔ ایک طرف وہ اس سلو کی تلاش میں دیوانے ہورہے ہیں تو دوسری طرف اس قیدی کے لیے فکرمند ہیں۔ وہ کوئی بھوت تو ہے نہیں کہ اتنی موٹی موٹی زنجیریں توڑ کر قید خانے سے نکل بھاگے گا۔ آنند اور ونود کی تہ خانے کے باہر ڈیوٹی لگا کر بھی انہیں چین نہیں مل رہا ہے۔ ابھی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کسی نے جاکر قیدی کی خبر لی یا نہیں؟ میرا جواب سن کر بگڑنے لگے کہ اتنے خطرناک قیدی کی چنتا کرنے کے بجائے یہاں لوگ ڈنر کرتے پھر رہے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ وہ بھوکا پیاس بندہ جس کا جوڑ جوڑ انہوں نے ہلا ڈالا ہے، آخر کرے گا تو کیا کرے گا؟'' فون کال ریسیو کرنے والے نے کال ختم ہونے کے بعد اپنے ساتھی کے سامنے اظہارِ خیال شروع کردیا۔

''تو ان ساری پنچایتوں میں کیوں پڑ رہا ہے یار! تجھے بھٹناگر صاحب نے جتنا کہا ہے اتنا کر۔ وہ ایسے بیکار میں پریشان ہونے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ خاص بات ہے جبھی تو وہ اتنی چنتا کررہے ہیں۔ تو نے اس بندے کا پکا پن نہیں دیکھا کیا؟ اتنے ٹارچر کے بعد سب ''چیں'' بول دیتے ہیں لیکن اس نے ابھی تک ایک بات بھی نہیں اگلی ہے۔ میرے حساب سے تو بھٹناگر صاحب کی پریشانی ٹھیک ہے۔''

دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے بھٹناگر کے حق میں دلائل دیے۔ شہریار کو وہ موقع بالکل مناسب لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر والوں کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر فائرنگ شروع کردی۔ ردِعمل میں فوراً ہی اسے ایک چیخ سنائی دی لیکن دوسرا شخص خاصا پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے ایک بڑی میز کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے فوراً ہی اس کی طرف ایک فائر داغا۔ شہریار کو بائیں بازو میں کہنی سے ذرا اوپر شدید جلن کا احساس ہوا۔ گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کی آڑ میں رہتے ہوئے اندر برسٹ مارا۔ جواب میں اندر سے بھی فائرنگ کی گئی۔ حقیقتاً وہ دونوں اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بھی دوسرے کو نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور کامیابی کا امکان بس اسی صورت میں تھا کہ کوئی ایک اتفاقیہ طور پر زد میں آجائے۔ دوسری طرف سلو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچی تھی توانائی بھی اس ہنگامے میں خرچ کر لینے کے بعد اس کے دماغ پر کمزوری سے دھندلی چھانے لگی تھی اور وہ بھرپور کوشش نہیں کر پا رہا تھا۔ سلو نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی اور دودھ کے ٹیٹرا پیک تھے۔

''یہ لو، جلدی سے یہ کھا لو تاکہ کچھ کرنے کے لیے توانائی بحال ہو سکے۔'' اس نے ڈبل روٹی کے سلائس کے ساتھ ٹیٹرا پیک اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بلاتکلف دونوں چیزیں تھام لیں۔ شکستہ جسم کو اس وقت توانائی کی اتنی شدید ضرورت تھی کہ وہ فی الحال دشمن کے اس ٹھکانے سے نکلنے کی فکر بھی بھول گیا تھا۔

سلو دونوں چیزیں یقیناً فریج سے نکال کر لایا تھا اس لیے بے حد ٹھنڈی ہو رہی تھیں، اس کے باوجود وہ جلدی جلدی سلائس کو چباتا دودھ کی مدد سے حلق سے نیچے اتارتا چلا گیا۔ دوسری میز پر چڑھ کر بیٹھا سلو بھی اسی عمل میں مصروف تھا اور اس کے انداز سے بھی ظاہر تھا کہ اسے بھی کافی طویل وقفے کے بعد کچھ کھانے کو ملا ہے۔ ڈبل روٹی اور دودھ کے پیکٹوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس دیے۔

''چلو چل کر یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ تلاش کرتے ہیں۔'' یہ تجویز سلو نے پیش کی جس سے اتفاق کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اگلے چند منٹوں میں انہوں نے پوری عمارت میں گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ عجیب قلعہ نما عمارت تھی جس سے باہر نکلنے کا مین گیٹ کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی اتنی مضبوط سلاخیں لگی تھیں کہ انہیں توڑنے یا کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان دونوں نے پھر بھی اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھ لی لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ عمارت کی بناوٹ کچھ ایسے طرز کی تھی کہ چھت پر جانے تک کا راستہ نہیں دکھا گیا تھا ورنہ وہ وہاں سے ہی نکلنے کی کوشش کرتے۔ دیواریں توڑ کر نکلنا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ اوّل تو دیواریں بہت مضبوط تھیں، دوسرے ان کے پاس ایسا ساز و سامان بھی نہیں تھا جس کی مدد سے ایسی کوئی کوشش کی جا سکتی۔ شہریار کو اپنے مقابل کے آخری الفاظ یاد آئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''میرا دشواس کرو، یہ بلڈنگ تمہارے لیے چوہے دان ثابت ہوگی۔ تم اس کی دیواروں سے سر پٹختے رہ جاؤ گے لیکن اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکو گے۔''

اس کا دعویٰ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ واقعی وہ دیواروں سے سر پٹختے پھر رہے تھے لیکن باہر نکلنے کا راستہ تلاش نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ عمارت ان کے لیے چوہے دان بن گئی تھی جہاں وہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا، مین گیٹ اور وہ اس راستے کو کھولنے والے جادوئی ''کھل جا سم سم'' سے آگاہ نہیں تھے۔

ہر طرف سر پھوڑ لینے کے بعد وہ ایک بار پھر سیاہ رنگ کے گیٹ کے سامنے جا پہنچے لیکن وہ قسمت کے بند تالے کی طرح کھلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کچھ دیر اسے کھولنے کی لاحاصل سعی کرنے کے بعد وہ پلٹنے ہی لگے تھے کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گاڑی گیٹ کے سامنے ہی آ کر رکی تھی لیکن دروازے میں کوئی درز نہ ہونے کے سبب وہ اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔ شہریار کچھ سوچ کر سرپٹ آپریشن روم کی طرف بھاگا کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً مسلسل کوشش کرتا رہا تھا اس لیے کمپیوٹر کی اسکرین پر اس وقت بھی مین گیٹ کا منظر ہی نظر آ رہا تھا۔ اس نے کچھ بٹنوں کو پش کیا تو منظر وسیع ہو گیا اور گیٹ کے باہر موجود گاڑی نظر آنے لگی۔ جس وقت اس نے گاڑی کو دیکھا وہ دیوار سر ہی تھی پھر بھی اسے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود بھٹا گر کا چہرہ نظر آ گیا جس پر اس وقت شدید الجھن اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی اسکرین سے غائب ہو گئی اور سامنے سپاٹ زمین نظر آنے لگی۔

''کیا ہوا؟ کون تھا باہر؟'' اس کے پیچھے آپریشن روم میں آنے والے سلو نے پوچھا تو وہ آہستہ سے اس کی طرف پلٹا۔

''بھٹا گر۔'' اس یک لفظی جواب میں سب کچھ تھا۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ بھٹا گر کا یہاں تک آ کر واپس پلٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ گیٹ نہ کھلنے پر وہ سمجھ گیا ہوگا کہ اندر کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے اور ظاہر ہے یہ اس کی جگہ تھی اس لیے یہاں ہونے والی گڑبڑ سے نمٹنے کے لیے وہ مؤثر اقدامات کرنے کی پوزیشن میں تھا جبکہ وہ دونوں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ بالکل عالم برزخ میں ٹھہرائی گئی روحوں کا سا انتظار تھا کہ دیکھیں پردۂ غیب سے ان کے لیے جنت کے در کھلنے کا اعلان ہوتا ہے یا وہ جہنم میں دھکیلے جانے والے ہیں...!

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات

ایک تیر دو شکار

سلیم انور

سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے... یہ مشہور مثل آپ نے بھی سنی ہوگی... سانپ اور لاٹھی کی خاصیت پر پورا اترنے والے دوست اور دشمن کی ملی جلی جدوجہد... ہر جگہ... ہر دم ایک نیا رخ اختیار کرتی تیز رفتار کہانی کے اتار چڑھاؤ۔

جانے اور انجانے شخص کی شخصیت کے روپ در روپ..... جرم کی دنیا کا ڈرامائی ڈراپ سین.....

اس سہ پہر جب وہ باہر نکلا ہوا تھا تو سوٹ میں ملبوس دو افراد اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے کراؤن ان آئے تھے۔ یہ بات اسے کراؤن ان کے دربان نے ان لوگوں فرینکی ڈیوائن یہ من کر ہنس دیا۔ گاہے بگاہے دربان کی مٹھی گرم کرنا اس وقت اس کے کام آ گیا تھا۔ وہ آتے جاتے دربان کی لالچی مٹھی میں کچھ نہ کچھ رکھ دیا کرتا تھا۔

سوٹ میں ملبوس ان دو افراد نے اپنا تعارف بطور

WWW.PAKSOCIETY.COM

انشورنس کلیز مین کرایا تھا لیکن فرینکی کو علم تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنا کیریئر ہمہ وقت چوکس رہنے سے ہی بنایا تھا۔ ساتھ ہی وہ خود کو ہمیشہ غیر نمایاں رکھتا تھا اور اپنے حواس بھی تیز اور قائم رکھتا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ پولیس کو اس کے ٹھکانے کا علم کیونکر ہو گیا تھا؟

اب یہ بات بے معنی تھی۔ اس کا ماضی اسے پھنسا سکتا تھا اور یہاں سے غائب ہونے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ فرینکی کی خوش قسمتی تھی کہ ٹورنٹو شہر کے اس گنجان علاقے میں صبح کے چار بجے ٹیکسی ملنا دشوار نہیں تھا۔ خود اس کی طرح یہ شہر بھی شاذ و نادر ہی سوتا تھا۔

"پیٹرسن ائرپورٹ!" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ پھر اس سرد رات کے سائے میں ٹیکسی کی نشست پر اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اسے احساس تھا کہ اب اسے اپنی پرانی طرزِ زندگی کی ہیجان خیزی اور ولولہ انگیزی سے محروم ہونا پڑے گا۔ جیسے کہ اس کی آخری واردات جو خاصی سنسنی خیز رہی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

اسے نئے ماڈل کی پورشے بیکسٹر کار چرانی تھی اور اسٹاک ایکسچینج ٹاور کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ لاٹ سے اسے چرانا نہایت ہی آسان کام تھا لیکن برا یہ ہوا کہ کار کا مالک کچھ جلدی ہی واپس آ گیا۔ تب فرینکی کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اس سادہ لوح کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔

اپنا اوور نائٹ بیگ ہاتھ میں تھامے فرینکی صبح منہ اندھیرے جانے والے ان مسافروں کی اس بھیڑ میں آسانی سے شامل ہو گیا جو ائرپورٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ اس نے ایک الیکٹرانک مشین سے اپنے لیے جہاز کا ٹکٹ خریدا اور پھر ٹہلتا ہوا انٹرنیشنل ڈیپارچرز کے چیک اِن کاؤنٹر کی جانب روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک اوپن ائر کافی شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اندر موجود اوور ہیڈ ٹی وی پر ڈالی۔ وہ یہ قطعی توقع نہیں کر رہا تھا کہ اس کا چہرہ مقامی خبروں میں دیکھنے کو ملے اور نیچے یہ پٹی چل رہی ہو جس پر لکھا ہو: "پولیس کو مشتبہ قاتل کی تلاش۔"

اس نے اپنی جیب سے سیاہ فریم والی ایک عینک نکالی اور اسے پہننے کے بعد دیگر مسافروں کے ہم قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران اس کی چوکس نگاہیں مسلسل ان سیکیورٹی گارڈز پر جمی ہوئی تھیں جو ائرپورٹ کی عمارت کے اندر پٹرولنگ کر رہے تھے۔ فرینکی کو علم تھا کہ زیادہ دیر نہیں جب پولیس اپنی تلاش کا دائرہ ائرپورٹ تک بڑھا دے گی۔

چیک اِن کاؤنٹر پر ایک بیزار سے اٹینڈنٹ نے فرینکی کے پاسپورٹ کے صفحات الٹ پلٹ کر چیک کیے اور اس کے بزنس ٹرپ کے بارے میں معمول کے چند سوال پوچھے۔

فرینکی نے نہایت سکون کے ساتھ ان سوالات کے مختصر سے جوابات دیے۔ دس منٹ بعد اس کی اپنی فلائٹ میں بورڈنگ بھی ہو گئی۔

جب جہاز ہوا میں بلند ہو گیا تو فرینکی پیورٹو پلاٹا میں اپنی نئی مگر آسائش طرزِ زندگی کے تصور میں کھو گیا۔ ایک ملازمہ اور ایک باورچی سے لیس ایمبر کوسٹ کا وہ متمول گھر ایک پرائیویٹ آؤٹ ڈور پول اور کشادہ انٹرکنڈیشنڈ کمروں کا حامل تھا جہاں سے بحر کا چاروں طرف سے مسلسل نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

اور یہ سب نیویارک میں اس کے باس ماریو کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ تاہم ایسا نہ ہوتا تب بھی ماریو کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ وہ فرینکی کے بچ نکلنے کے لیے کوئی بھی زبردست پلان کی تدبیر کر لیتا لیکن جب ماریو نے اسے ایک بہترین کاسمیٹک سرجن، ایک ٹرو پیکل ولا اور ایک نہایت آسان نیا معروف نام فراہم کرنے کی پیشکش کی... تو بھلا فرینکی کیونکر انکار کر سکتا تھا۔

ہاں، ماریو ایک نہایت کھلے دل کا آدمی تھا۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ کس طرح فرینکی گزشتہ گرمیوں میں صرف دو ملاقاتوں کے بعد اس کی بدصورت بہن سے جان چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اس معاملے میں کون اسے قصوروار ٹھہرا سکتا تھا؟ گو ماریو کی بہن تیس سالہ ایک غیر شادی شدہ عورت تھی لیکن وقت سے پہلے عمر رسیدگی کی تباہ کاریوں ..... کے زیرِ اثر آ چکی تھی۔ پھر چوپنج دار ناک اور سست آنکھیں بھی کسی کام کی نہیں تھیں۔ فرینکی نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو پکا سودا مسترد کر دینے کا خیال کیا تھا۔ لیکن اپنے ان خیالات کو ماریو کے روبرو زبان پر لانے سے مکمل احتیاط برتی تھی۔

اُس کی مناسب وجہ بھی تھی۔ جس کسی نے بھی کبھی ماریو کے ساتھ کام کیا تھا، وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اپنی بہن کے خلاف معمولی سی بھی ہتکِ کو ماریو اپنی ذاتی توہین سمجھتا تھا۔ وہ ان

سبب

غریب باپ کا نکما بیٹا میٹرک کے امتحان میں فیل ہوا تو اسے بیٹے پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا کیونکہ اسی محلے کی ایک لڑکی اسی امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی۔

"اس لڑکی کو دیکھو... اس نے اپنے گھر اور خاندان کا نام روشن کر دیا... اور ایک تم ہو، نکمے، آوارہ اور جاہل۔" باپ غصے میں آ کر بیٹے کو بار بار یہی طعنے دے رہا تھا۔

اسی لعنت ملامت میں دو روز گزر گئے۔ تیسرے دن بیٹے نے باپ کی زبان سے یہی سب سنا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے جل کر کہا۔ "ابا! میں اس لڑکی کو اور کتنا دیکھوں۔ سال بھر اسی کو دیکھتے رہنے کے چکر میں پڑ کر میں امتحان میں فیل ہوا ہوں۔"

(کوئٹہ سے حسن سردار کی بے بسی)

تھا جو اس کے جذبات کو مجروح کرتے تھے۔ وہ انہیں اپنے محفوظ حلقے کے اثرات سے پرے دربدر کر دیتا تھا جہاں پولیس بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ماریو کی بہن کو دھتکارنے کے شدید ردِعمل کے خوف نے فرینکی کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی لیے فرینکی اگلے ہی روز وضاحت کے لیے ماریو کے پاس جا پہنچا۔ "سوری ماریو! میرے خیال سے تمہاری بہن ایک بہترین بیوی بن سکتی ہے لیکن میں شادی کرنے والے ٹائپ کے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔" اس نے ماریو سے رازدارانہ انداز میں کہا جیسے وہ آپس میں بے حد بے تکلف دوست رہے ہوں۔

"ارے فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اس کا کسی اور کے ساتھ رشتہ جوڑ دوں گا۔" ماریو نے جواب دیا تھا۔

تب فرینکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

لیکن یہ سب ماضی کا قصہ تھا۔

☆☆☆

اپنی حالیہ خوش قسمتی کے باوجود پیورٹو پلاٹا میں کاسمیٹک سرجن کے ساتھ اپنا اپائنٹمنٹ فرینکی کو اتنا بھاری محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی گردن میں چکی کا پاٹ لٹکا ہوا ہو۔ بلاشبہ وہ اس سے قبل بڑے شہروں کی عقبی سڑکوں پر اس سے زیادہ ہولناک سخت آزمائشوں کو جھیل چکا تھا لیکن واضح خطرات کو ٹالنا ایک الگ بات تھی اور خود کو ایک پلاسٹک سرجن کے ہاتھوں میں دے دینا اور اپنا وجود اس کے سپرد کر دینا ایک بالکل الگ معاملہ تھا۔

اور اس بارے میں سوچتے پر اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا سرجن کون ہے؟

"ایک دوسرے کو اپنا نام نہیں بتانا۔" ماریو نے فرینکی کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔ "یہ بات تمہارے اپنے تحفظ کے حق میں ہے۔"

جب فرینکی لا یونین ائرپورٹ سے سیدھا پلاسٹک سرجن کے پرائیویٹ کلینک جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہوا تو سورج کی زرد کرنیں پیورٹو پلاٹا کے ساحل سے منعکس ہو رہی تھیں۔ ماریو نے اسے یہی ہدایات دی تھیں۔

اس دلکش منظر سے لطف اندوز ہونے کے بجائے فرینکی اس خطرناک تجربے کے سوا اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا جس سے وہ پلاسٹک سرجن کے پرائیویٹ کلینک میں دوچار ہونے جا رہا تھا۔

[illegible] دیتے نی ہی

جلد ہی اسے ایک نئی شناخت مل جائے گی۔ تب اسے اپنے ماضی کے کیے کسی بھی جرم کی پروا نہیں رہے گی جو اس کے اعصاب پر ایک بوجھ کی طرح سوار تھے۔

جب ٹیکسی فوروایا کونڈور پر واقع سفید رنگ کی دو منزلہ عمارت کے سامنے پہنچی تو فرینکی نے عمارت کے داخلی دروازے پر ایک دلکش نوجوان نرس کو کھڑے ہوئے پایا۔ وہ فرینکی کو دیکھ کر مسکرا دی جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ فرینکی کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

لیکن جب فرینکی نے نرس سے سرجن کے بارے میں پوچھا تو وہ گاڑھے اسپینش لہجے میں بولی۔ "تو اسپیک انگلش۔"

پھر وہ ریسپشنسٹ کی ڈیسک کے سامنے سے تیزی سے گزرتے ہوئے ایک مختصر سی راہداری میں داخل ہو گئی اور اسے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچانے کے بعد کمرے سے نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

جب وہ انتظار کر رہا تھا تو دیگر خیالات اسے مسلسل آزار دینے لگے۔ گو کہ وہ ماریو پر ایک بھائی کی طرح اعتماد کرتا تھا لیکن اسے اپنی جلد کے اوپر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ اس اعصابی بے چینی سے چھٹکارا پانے سے قاصر تھا۔ پھر سونے پر سہاگا یہ کہ دواؤں کی چبھنے والی بو جو کمرے میں رچی ہوئی تھی، اس کا جی بری طرح متلا رہی تھی اور وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی توجہ کارخ دفتر کی آرائش کی جانب موڑ دیا۔ کمرے میں لکڑی کی ایک رائٹنگ میز اور اس سے میچ کرتی ہوئی ایک ہتھے والی آرام دہ کرسی کے علاوہ بائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شخصیت میں بھی نکھار آ گیا تھا۔ اس کی نو دریافت کشش کے باعث علاقے کے لوگ بھی اسے اپنی پارٹیوں میں مدعو کرنے لگے تھے۔

ایسے ہی دو مواقع پر وہ پیڈرو نامی ایک ریٹائرڈ اسپینش سراغ رساں کی توجہ کا مرکز بن گیا جو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بیوی کے ہمراہ اس کے ایک قریبی ولا میں رہائش پذیر تھا۔

''یہ عجیب سی بات ہے... لیکن تم مجھے اب بھی کچھ جانے پہچانے سے لگتے ہو، کارلوس۔'' یہ بات پیڈرو نے فرینکی سے اپنی تیسری ملاقات کے موقع پر کہی جب وہ پڑوس کی ایک پول پارٹی میں مدعو تھے۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم کبھی اسپین میں نہیں رہے؟''

''میرا جواب اب بھی وہی ہے جو پہلے میں نے دیا تھا، پیڈرو۔ میرا جنم اور میری پرورش امریکا میں ہوئی ہے۔'' فرینکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ البتہ پیڈرو کی چھان بین پر مسلسل اصرار نے اس کے اعصاب پر جھنجھناہٹ پیدا کرنا شروع کر دی تھی۔

پھر پہلے کی طرح پیڈرو نے اس کے جواب پر شانے اچکا دیے اور گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا۔

لیکن اس مرتبہ فرینکی کی اضطراری کیفیت نے اس کے لیے ایک الارم سا بجا دیا تھا۔ اس نے کارلوس مولینا کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر اس کاسمیٹک سرجن کے پاس جانے کا فیصلہ کیا جس نے سرجری سے اسے کارلوس کا چہرہ اور شناخت عطا کی تھی۔

اگلے روز صبح وہ ٹیکسی میں سوار ہو کر وایا کونڈور پہنچا تو اسے وہ کلینک کہیں دکھائی نہیں دیا جہاں اس کی کاسمیٹک سرجری ہوئی تھی۔ اس نے ٹیکسی میں اس بلاک کے تین چکر لگائے اور سڑک کے دونوں جانب واقع عمارتوں کا بغور جائزہ لیا لیکن اسے فور نمبر کی وہ دو منزلہ سفید رنگ کی عمارت کہیں نظر نہیں آئی۔ وہاں ایک پلاٹ تھا جو خالی پڑا تھا۔

فرینکی بوکھلا گیا اور اس پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ اس نے نیویارک ماریو کو فون کیا تو ریسپشنسٹ نے اسے بتایا کہ ماریو اپنے کاروباری دورے پر کہیں دور گیا ہوا ہے اور اس سے رابطہ نہیں ہو سکتا۔

اسی روز شام کو فرینکی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو لائٹ ویٹ سوٹ میں ملبوس دو ہٹے کٹے آدمیوں کو اپنے سامنے پایا۔

''سینور کارلوس مولینا؟'' ان میں سے ایک نے جس کی داہنی آنکھ کے نیچے زخم کا نشان تھا، اپنا پولیس بیج لہراتے ہوئے کہا۔

''یس؟''

''میں ڈیٹیکٹیو گارسیا ہوں اور یہ میرے پارٹنر ڈیٹیکٹیو الفانسو ہیں۔ ہم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' فرینکی ان دونوں کو گیسٹ روم میں لے آیا۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے جاننا چاہا۔

ڈیٹیکٹیو الفانسو کی نظریں اس کی گھنی ابروؤں کے نیچے سے فرینکی کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ ''آپ کی حراست کے لیے ایک انٹرنیشنل وارنٹ جاری ہوا ہے۔''

''کس بنیاد پر؟'' فرینکی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ وہ اس بارے میں پُریقین تھا کہ اس کا ماضی اب اسے کسی قسم کی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

''اسپین میں ماریہ فیوئیس کے قتل کے الزام میں۔''

''لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔'' فرینکی نے برجستہ جواب دیا۔ ''سنو، میں حقیقت میں کارلوس مولینا نہیں ہوں۔ میں نے کاسمیٹک سرجری کرائی تھی تاکہ میں کارلوس مولینا کی طرح دکھائی دوں۔ لیکن میرا اصل نام... میں...''

☆☆☆

''ہیلو، ماریو؟''

''ہاں ڈاکٹر؟''

''کام ہو گیا۔ پولیس چند لمحے قبل اسے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔''

''تم نے اپنے بھتیجے کی روانگی کے لیے فلائٹ بک کرا دی ہے، ڈاکٹر؟'' ماریو نے پوچھا۔

''ہاں، کارلوس آج پرائیویٹ جیٹ سے اسپین سے روانہ ہو جائے گا۔ ماریو! تمہارا ایک بار پھر شکریہ کہ تم نے اس کے ٹورنٹو فرار ہونے اور وہاں پر اس کی کاسمیٹک سرجری کے انتظامات کرنے میں اس کی مدد کی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں۔'' ماریو نے کہا۔

''بائی دی وے، میرے بھتیجے کا وہاں ٹورنٹو میں نیا نام اور نئی شناخت کیا ہو گی؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

ماریو نے قدرے توقف کیا پھر بولا۔ ''فرینکی ڈیوائن!''

بینی کو سراغ رساں کا عہدہ سنبھالے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ چیف پونڈر نے اسے اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔ وہ اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ کی پہلی خاتون افسر تھی جسے اس عہدے پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ جب وہ چیف کے دفتر پہنچی تو لینی لیڈفورڈ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کر تھوڑی سی پریشان ہو گئی کیونکہ وہ انتہائی خود پسند اور شیخی خور تھا اور اس وقت بھی اس انداز میں بیٹھا ہوا تھا جیسے وہی چیف ہو۔ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال اڑ چکے تھے اور وہ دس سال سے مصنوعی وگ استعمال کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ پٹرول آفیسر تھا جہاں اس کی کارکردگی تسلی بخش نہیں تھی لیکن اپنے چچا کی مہربانی سے جو چیف کے عہدے سے ریٹائر ہونے والا تھا، اس کی نوکری پر کوئی آنچ نہیں آئی بلکہ جاتے جاتے وہ اسے سراغ رساں کے عہدے پر ترقی دے گیا۔ یہ اقربا پروری کی بدترین مثال

دورانِ ملازمت ایک دوسرے کے درمیان باہمی چپقلش کا حیرت انگیز نتیجہ

جعل ساز

تنویر ریاض

کامیابی، خوش قسمتی سے ملتی ہے... اور خوش قسمتی کا ادراک... کامیابی کی ضمانت دیتا ہے... کوشش اور محنت کے امتزاج سے کامیابی کے نت نئے انداز منتخب کرتی کہانی کے رموز... ایک نہ تجربہ کار سراغ رساں کا احوال... پہلے ہی کیس نے اسے تنہا مشکل سے دوچار کر دیا تھا...

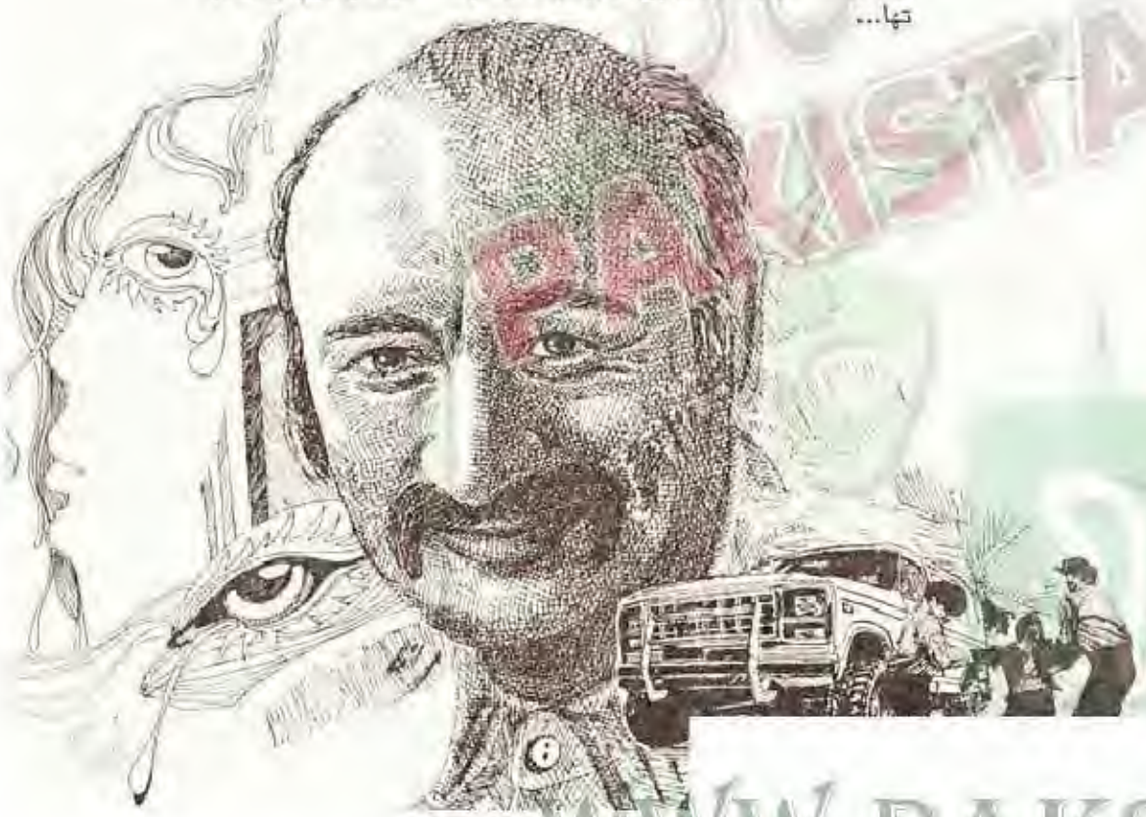

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی لیکن وہاں کون تھا جو اسے چیلنج کرتا۔

جب وہ چیف پونڈر کے دفتر میں داخل ہوئی تو اس نے بڑی مشکل سے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے اور پُرسکون رہنے کی کوشش کی تاہم لینی کی وہاں موجودگی اسے کچھ سوچنے پر مجبور کررہی تھی کیونکہ کئی سالوں سے بجٹ میں کمی ہوجانے کے سبب سراغ رساں ٹیمیں تشکیل نہیں دی جارہی تھیں اور اب سراغ رساں انفرادی طور پر ہی کام کیا کرتے تھے۔ بینی کو بھی تنہا اپنے فرائض انجام دینا اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھتی تھی اور ویسے بھی اس کی موجودگی میں مرد آفیسر اپنے کام پر پوری طرح توجہ نہیں دے پاتے تھے۔

لینی لیڈفورڈ اس معاملے میں خاصا غیر ذمے دار تھا۔ جب وہ پٹرول آفیسر تھی تب بھی اس پر غیر ضروری تنقید کرتا اس کا معمول تھا البتہ اس نے بینی پر جملے کستے ہوئے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ اس پر کسی عورت کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام نہ لگ جائے۔ بینی تنہا عورت تھی اور ان مسائل کو سمجھتی تھی جو مردوں کے معاشرے میں ایک عورت کو پیش آسکتے ہیں۔ وہ اس قسم کے رویّوں کی عادی ہوچکی تھی اور اپنی خود اعتمادی کے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ابھی اسے سراغ رساں کے طور پر ایک سال کا آزمائشی عرصہ گزارنا تھا۔ لینی اس سے سینئر تھا اور اگر بینی کو اس کے ساتھ کام کرنا پڑتا تو اس کی رپورٹ پر ہی اس کی ملازمت کے مستقل ہونے یا نہ ہونے کا انحصار ہوتا۔ اس لیے وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ ایک سال کی آزمائشی مدت ختم ہونے سے پہلے وہ لینی کے ساتھ کام کرے۔

لینی کی خمار آلود آنکھوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کی جاذبِ نظر شخصیت کے پیشِ نظر کوئی بھی مرد اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں وہ اس کاؤنٹی کی سب سے زیادہ خوب صورت اور پُرکشش عورت تھی۔ نو سال پہلے کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی تھی تاکہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے قریب رہے۔ وہ اس عزم کے ساتھ اس محکمے میں آئی تھی کہ اسے ایک دن قصبے کی پہلی خاتون پولیس چیف بننا ہے لیکن اس نے کسی کے سامنے اپنے اس مقصد کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ لینی کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لینی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور ایسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا جیسے کوئی احسان کررہا ہو۔ بینی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنی کرسی پر سیدھی بیٹھی رہی۔ اس کی نظریں پولیس چیف کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس نے ان دونوں سراغ رساں کو مطلع کیا کہ انہیں مل کر کام کرنا ہے اور ایک عادی مجرم ایڈی پر نظر رکھنی ہے جو دس سال جیل میں رہنے کے بعد پیرول پر رہا ہوکر شہر میں واپس آگیا ہے۔ بارہ سال پہلے وہ خود ایک سراغ رساں تھا اور اس نے ایڈی کو ایک جرم کے سلسلے میں جیل بھجوادیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایڈی واپس آنے کے بعد اپنی مجرمانہ سرگرمیاں دوبارہ شروع کردے۔

"یہ تم دونوں کے لیے پہلی ترجیح ہے۔" چیف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس پر گہری نظر رکھو۔ اگر وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہے تو اس کا پتا لگاؤ تاکہ ہم اس پر ہاتھ ڈال سکیں۔"

"مجھے سراغ رساں بینی کے ساتھ کام کرکے خوشی ہوگی۔" لینی نے اس کے خوب صورت متناسب جسم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں شروع سے ہی اس کی صلاحیت کا معترف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے وسیع تجربے..."

"مختصر بات کرو۔" چیف نے اسے ایک فائل دیتے ہوئے کہا جس میں ایڈی کی سابقہ مجرمانہ سرگرمیوں کی تفصیل تھی۔ "اس وقت تم ہی واحد تجربہ کار سراغ رساں ہو جسے یہ کام سونپا جاسکتا ہے۔ دوسرا سراغ رساں جمی جونز آنے والے جتھے کو ریٹائر ہورہا ہے اور اس سے پہلے اسے اپنے تمام معاملات کلیئر کرنا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لے کر ایڈی کی گردن پر ہاتھ ڈال سکو گے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں کوئی بڑا نقصان پہنچائے۔"

لینی نے ایڈی کی تصویر اور کاغذات پر ایک سرسری نظر ڈالی اور فائل بینی کی طرف بڑھادی۔ اس سے پہلے کہ اس کی انگلیاں بینی کے ہاتھ سے ٹکراتیں، اس نے پھرتی سے وہ فائل پکڑ لی۔ اس نے ایڈی کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا جس کا شیو بڑھا ہوا اور سر تقریباً گنجا ہوچکا تھا۔ شرارتی آنکھوں اور عیار مسکراہٹ سے اس کی مکاری ظاہر ہورہی تھی۔ بینی نے اس کی فائل پڑھنے میں زیادہ وقت لگایا۔ اسے بیس سال کے دوران ..... نو مختلف سنگین جرائم کے سلسلے میں سزا ہوچکی تھی۔ پیرول پر رہا ہونے کے بعد اس نے اوک ڈیل میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ وہ بے روزگار تھا لیکن اس نے نقد ادائیگی کرکے ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا جس سے پولیس کے شبے کو تقویت ملی جو اس حقیقت

سے تعلق رکھنے والے ہم پیشہ افراد ابھی تک گردونواح کے قصبات میں رہائش پذیر تھے۔ گوکہ اس کے ریکارڈ میں کسی پُرتشدد کارروائی کا ذکر نہیں تھا لیکن بینی جانتی تھی کہ اس کے جرائم کے نتیجے میں کتنے لوگ متاثر ہوئے ہوں گے جن کی خدمت اور حفاظت کا اس نے حلف اٹھا رکھا تھا۔

"میں تمہیں اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ دو ہفتے دے سکتا ہوں۔" چیف نے کہا۔ "کوئی سوال؟"

لینی گھگیاتے ہوئے بولا۔ "لیکن چیف! اگلے ہفتے میری چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔"

"تب تو تمہیں ایک ہفتے میں یہ کام نمٹانا ہوگا۔" چیف نے بے رخی سے کہا۔

انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر اپنے کام کا آغاز کردیا۔ ان کا ارادہ پہلے ایڈی کے گھر کی طرف جانے کا تھا جو اوک ڈیل کے مشرق میں واقع تھا۔ اس کے لیے انہوں نے گیراج سے بغیر نشان والی پولیس کار نکالی۔ لینی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس نے بینی سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ کیا وہ ڈرائیونگ کرنا چاہے گی۔

جیسے ہی ان کی کار ہائی وے پر آئی تو لینی نے کہا۔ "ہمیں پہلے لنچ کرلینا چاہیے ورنہ میرا شوگر لیول کم ہوجائے گا۔"

"ابھی تو دوپہر بھی نہیں ہوئی۔" بینی نے کہا۔

"مال پر ایک نیا چائنیز کھلا ہے۔ وہاں جوڑوں کے لیے کیبن بھی بنے ہوئے ہیں۔"

"میں نے اپنے لیے سینڈوچ خرید لیا تھا۔" بینی نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ وہ اس کی گستاخ نظروں کو محسوس کررہی تھی جو اس کے جسم کے مختلف حصوں میں تیر کی طرح پیوست ہورہی تھیں۔

"اگر تم باقاعدگی سے ورزش کرو تو تمہارا جسم مزید خوب صورت ہوسکتا ہے۔" اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی دوبارہ ورزش شروع کردینی چاہیے تاکہ میرا جسم پرانی حالت میں واپس آجائے اور میں ہر قسم کے ایکشن کے لیے تیار رہوں۔ گوکہ تم مجھ سے چھوٹی ہو لیکن یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں کوئی مشورہ ضرور دوگی۔"

بینی نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ فی الحال ہمیں اپنی پوری توجہ ایڈی پر مرکوز رکھنی چاہیے۔"

ماجا گنگ

کرلیں۔ صرف میں اور تم۔" ایک بار پھر اس کی نظریں بینی کے جسم پر پھسلنے لگیں۔

"بہتر ہوگا کہ تم اپنی نظریں سڑک پر رکھو۔ اس سے پہلے کہ ہماری گاڑی کی ٹکر ہوجائے۔"

کچھ دور جانے کے بعد وہ ہائی وے سے اتر کر مشرق کو جانے والے اولڈ فارم روڈ پر مڑ گئے۔

بینی کو اوک ڈیل کے چپے چپے سے واقفیت تھی۔ وہ پٹرول آفیسر رہ چکی تھی اس لیے اسے تمام مقامات اور سڑکوں کے نام معلوم تھے۔ لینی نے اس کی ہدایات کو نظر انداز کیا اور آدھ گھنٹے تک بھٹکتا رہا۔ بہرحال وہ اس مکان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جس کی انہیں تلاش تھی۔

یہ مکان سڑک کے آخری کنارے پر واقع تھا جو کہ جانوروں کے ایک باڑے پر جاکر ختم ہوتی تھی۔ اس جگہ کو دیکھ کر لینی کو یاد آگیا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ کئی مرتبہ یہاں سے گزر چکا ہے۔ قریب ترین پڑوسی کا گھر اس کے عقب میں سو گز کے فاصلے پر تھا اور دونوں مکانوں کے درمیان گھنے درختوں کی قطار تھی۔ لینی نے گاڑی واپس گھمائی تاکہ ایڈی کے گھر کو قریب سے دیکھ سکے۔

"بالکل الگ تھلگ اور پرائیویٹ جگہ ہے۔" بینی نے کہا۔ "یہاں کسی قسم کا ٹریفک بھی نہیں ہے اور اگر ایڈی پولیس آفس میں رپورٹ نہ کرتا تو کسی کو اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں علم نہ ہوتا۔"

وہ پیر کا دن تھا اور اس روز مشرقی علاقے سے کچرا اکٹھا کیا جاتا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک ہی سائز کے نیلے، سبز اور سیاہ ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ اس ایک منزلہ مکان کی ہر کھڑکی پر پردے لٹکے ہوئے تھے جن کی وجہ سے اندر کا منظر دیکھنا ممکن نہ تھا۔ پتھریلے راستے پر ایک فورڈ پک اپ کھڑی تھی اور اس کا رخ سڑک کی جانب تھا۔ وہ پرانے ماڈل کی گاڑی تھی لیکن دیکھنے میں صاف ستھری اور قابلِ اعتبار دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر کوئی ڈینٹ تھا اور نہ ہی انجن کے نیچے تیل کا کوئی دھبا نظر آرہا تھا۔

بینی نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس میں پک اپ کا نمبر اور دیگر تفصیلات درج کرنے لگی۔

"یہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔" لینی نے کہا۔

"وہ بہت زیادہ منظم اور سلیقہ مند معلوم ہوتا ہے۔" بینی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "وہ اپنے آپ کو لوگوں کی توجہ سے دور رکھتے ہوئے جزئیات پر نظر رکھتا ہے اور مقامی آبادی میں گھل مل گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ نامی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گرامی مجرم ہے۔''

''یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا؟'' لینی نے پوچھا۔

''اس کا ٹرک امریکن ساخت اور مقبول ماڈل کا ہے جسے اس نے بڑی اچھی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے گھر کی کھڑکیوں کے پردے برابر ہیں اور ان کے بیچ کوئی خلا نہیں۔ دروازے کے باہر رکھے ہوئے تین ڈرم ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کچرے کی مختلف اقسام کو علیحدہ کر کے ان میں ڈالتا ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہ وہ کتنا محتاط ہے۔''

لینی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہمیں اس کے گھر کے اتنے نزدیک گاڑی نہیں کھڑی کرنی چاہیے۔ وہ ہمیں دیکھ سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں سے چوتھائی میل کے فاصلے پر کھڑے ہوں جہاں سے ہمیں یہ جگہ صاف نظر آسکے۔''

''اس کے لیے ہمیں ایک طاقتور دوربین کی ضرورت ہوگی۔'' لینی نے کہا لیکن اس سے پہلے ہی بینی اپنے ہینڈ بیگ سے ایک دوربین نکال چکی تھی۔

''سنو۔'' لینی نے ایک بار پھر کہا۔ ''کیوں نہ ہم پہلے لنچ کرلیں۔ کچھ دیر کے لیے کام کو بھول جاؤ۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم ایک گھنٹے تک اس مکان کی نگرانی کریں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ اگر تمہارا شوگر لیول کم ہونے لگے تو میں تمہیں آدھا سینڈوچ دے دوں گی۔''

بیس منٹ کے انتظار کے بعد ایڈی گھر سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے بازو میں ایک بھاری تھیلا دبا ہوا تھا۔ اس وقت وہ کلین شیو تھا اور اس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا۔ البتہ وہ اپنی آخری تصویر کے مقابلے میں چند برس زیادہ عمر کا لگ رہا تھا اور اس کے رہے سہے بال بھی غائب ہو چکے تھے۔ بینی نے دوربین لینی کی طرف بڑھائی۔ اس نے سرسری انداز میں ایڈی کو دیکھا اور دوربین واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''کم بخت کا سر بلیئرڈ کی طرح لگتا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ وہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوگا۔''

بینی نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگالی اور ایڈی کو دیکھنے لگی جو پک اپ میں سوار ہو رہا تھا۔ اس نے وہ تھیلا سیٹ کے پیچھے فرش پر رکھ دیا تھا۔

''میں اس بارے میں نہیں جانتی۔'' بینی نے نظریں ہٹائے بغیر لینی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عورتیں ایسے مردوں کو پسند کرتی ہیں یا ان کے بارے میں بالکل نہیں سوچتیں۔''

''اب یہاں سے چلنے کی کرو۔'' لینی نے کہا۔

بینی نے دوربین کا رخ گھر کی جانب کرلیا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید کوئی کھڑکی یا دروازے میں نظر آجائے لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''میں کسی ایسے شخص میں کشش محسوس کروں گی جس کا مستقبل محفوظ ہو۔'' بینی نے دوبارہ ٹرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور میں نہیں سمجھتی کہ ایسے مردوں کی کوئی کمی ہے۔''

''تم بہت فلسفیانہ گفتگو کرتی ہو۔'' لینی نے کہا۔ ''میں خود بھی خاصا فلسفی ہوں۔ ہمیں کسی وقت اس موضوع پر بات کرنی چاہیے۔ کیوں نہ کسی روز ایک ساتھ ڈنر کیا جائے۔''

''میرے پاس اس سے بھی اچھا آئیڈیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے کیونکہ ایڈی ابھی ابھی روانہ ہوا ہے۔''

انہوں نے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایڈی کا رخ اس راستے پر تھا جو قصبے سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک میل بعد وہ شہر کی حدود سے باہر نکل چکے تھے لیکن ایڈی وہاں نہیں رکا بلکہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ البتہ لینی نے اپنی کار روک دی اور بولا۔ ''ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ آج کے دن کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس میں لکھا ہو کہ ہم اپنی حدود سے باہر اس کا تعاقب نہیں کر سکتے۔'' بینی نے کہا۔ ''ہم اس کی جتنی زیادہ نگرانی کریں گے، اس کے بارے میں اتنا ہی زیادہ جان پائیں گے۔''

لینی نے ایک طویل سانس لے کر کار کی رفتار بڑھا دی۔ اب تک اس نے بینی کو رجھانے کی جتنی کوششیں کیں، وہ سب ناکام رہیں لیکن وہ ناامید نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ بینی کو اپنے ساتھ لنچ یا ڈنر پر لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دوسری جانب بینی اس کی سوچوں سے بے خبر ایڈی کی پک اپ پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو شہر کی حدود سے نکلنے کے چند میل بعد دائیں جانب مڑ کر ایک ٹرک اسٹینڈ پر کھڑی ہوگئی تھی پھر وہ تھیلا بغل میں دباتے ہوئے پک اپ سے باہر آیا اور ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ والا کیبن منتخب کیا۔ اس دوران میں بینی نے مسلسل اس پر نظریں جمائے رکھیں اور لینی کو لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دیتی رہی

ایک منٹ بعد ایک اور شخص بوتھ میں داخل ہوا اور ایڈی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ویٹریس ان دونوں کے لیے کافی لے کر آئی۔ وہ کافی پینے کے دوران میں باتیں کر رہے تھے پھر ایڈی اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے ایک خالی پلیٹ میں کچھ نوٹ رکھے اور اپنا تھیلا وہیں چھوڑ کر باہر چلا آیا۔ ایک منٹ بعد دوسرا شخص بھی وہی تھیلا بغل میں دبائے ریسٹورنٹ سے باہر نکلا۔ بینی نے اپنی دوربین کا رخ اس کی جانب کرلیا اور جب وہ پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی تک پہنچا تو بینی نے فوراً ہی اس کا نمبر اپنی نوٹ بک میں درج کرلیا۔

''منشیات۔'' لینی نے کہا۔ ''اس کے علاوہ اس تھیلے میں اور کیا ہوسکتا ہے؟''

''لیکن میں نے کوئی لین دین ہوتے نہیں دیکھا اور مجھے منشیات یا پیسوں کا کوئی تبادلہ ہوتا نظر نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ ایڈی نے کافی کے بل کی ادائیگی کی تھی۔''

لینی نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگایا اور مایوس ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے اپنا لنچ چھوڑا، چالیس میل کا سفر طے کیا، پوری دوپہر ضائع کی اور صرف یہ جان سکے کہ ایڈی ایک اچھا ڈرائیور ہے اور اپنے پیسے ادھر اُدھر پھینکتا پھرتا ہے۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اوک ڈیل سے باہر محفوظ فاصلے پر مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہو۔'' بینی نے کہا۔ ''جہاں پولیس اسے نہیں جانتی لیکن اب بھی اس کا پرانے ساتھیوں سے رابطہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے خطیر رقم ہے جبکہ اس کے کام کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے پاس یہ شک کرنے کی گنجائش ہے کہ اس نے مال تو دیا لیکن رقم نہیں لی۔ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایڈی کو دوسرے آدمی پر بھروسا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کا قریبی ساتھی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں کسی بڑے نیٹ ورک کا حصہ ہوں۔ میں نے دوسرے آدمی کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں اس کا نام اور پتا معلوم ہوسکتا ہے۔''

لینی نے ونڈ شیلڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی بات کہنے والا تھا۔''

☆☆☆

کار رجسٹریشن آفس سے اس گاڑی کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کے مطابق کسی نے اس کار [illegible] کبھی کوئی [illegible] رکا مالک

کسی سنگین جرم میں ملوث نہیں تھا اور وہ محض اس بنیاد پر اس اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایڈی سے ملنے اس ریستوران میں کیوں گیا اور اس نے اسے جو تھیلا دیا' اس میں کیا تھا۔ مجبوراً انہیں اپنی ساری توجہ ایڈی پر مرکوز کرنا پڑی۔ اگلے چند روز تک اس کا یہی معمول رہا۔ وہ اپنے قصبے سے نکل کر خاصا فاصلہ طے کر کے اپنی منزل پر جاتا۔ ہر بار اس کے پاس ویسا ہی تھیلا ہوتا جسے وہ اپنے کسی پہچان والے کے حوالے کر دیتا۔ اس مقصد کے لیے کسی ریستوران یا عوامی جگہ کا انتخاب کیا جاتا جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ لینی کی مایوسی بڑھتی گئی اور جمعے کی سہ پہر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔

''میں کہتا ہوں کہ ہمیں یہ تعاقب ختم کر دینا چاہیے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ اس وقت ان کی گاڑی پبلک اسکوائر کے قریب کھڑی تھی۔ اس بار بینی نے ایڈی کی حالیہ میٹنگ کی تصویریں ٹیلی فوٹو لینس سے بنائی تھیں۔ لینی بیزاری سے بولا۔ ''ان تصویروں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگلی بار جب وہ گھر سے روانہ ہو تو اسے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کے الزام میں روکو۔ اس کے مشتبہ رویے کو وجہ بنا کر اس کی کار کی تلاشی لو اور

Personality Development Dr. Online

۱۔ مضبوط قوت ارادی کے ساتھ پراعتماد اور کامیاب زندگی گزارنا آپ کا حق ہے
۲۔ آپ ہماری رہنمائی میں اپنی شخصیت کی خامیاں دور کر کے اپنا یہ حق حاصل کر سکتے ہیں۔
۳۔ Suggesion کی مشقوں کے ذریعہ احساس کمتری دور کر کے خود اعتمادی حاصل کریں۔ کامیاب زندگی گزاریں۔
۴۔ مسمریزم کی مشقوں کے ذریعے (صرف 27 دن میں) بے پناہ قوت ارادی حاصل کریں۔ ارادے کی قوت سے آپ جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔
۵۔ ہم النفس کی مشقوں کے ذریعے دل دماغ کو پرسکون کر سکتے ہیں۔ مراقبہ کر سکتے ہیں اور ماورائی قوت حاصل کر سکتے ہیں۔
۶۔ مثبت انداز زندگی سیکھ کر آپ بہتر ازدواجی اور معاشرتی زندگی گزار سکتے ہیں خاندان اور معاشرے کے ہر دل عزیز فرد بن سکتے ہیں۔
۷۔ اپنے Depression اور Anxiety کو (Medicine & Psychotherapy) کے ذریعے دور کر کے اپنے اندر کی اداسی مایوسی ناامیدی بے چینی بے خوابی غصہ چڑچڑا پن ذاتی اور ازدواجی زندگی میں ناکامی پر قابو پا کر ایک پرسکون اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔
۸۔ اپنے روحانی مسائل کے حل اور وظائف کے حصول کے لئے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ہر طرح کی نفسیاتی اور جسمانی کمزوری کے لئے Alternative Medicines بذریعہ ٹیلی فون ای میل ایس ایم ایس منگوائی جا سکتی ہیں

ڈاکٹر محمد لطیف جمائیں
ایم بی بی ایس (فی ایس سی آنرز)
0321652800
email: dr.muhammadianshaheen@gmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

معلوم کرو کہ ان تھیلوں میں کیا ہے۔"

"وہ ایک اچھا ڈرائیور ہے اور اس کا رویہ کبھی مشکوک نہیں ہوتا۔ اسے روکنے کے لیے کوئی معقول جواز ہونا چاہیے۔"

"معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ تمہیں ابھی بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔"

"کچھ بھی ہو، میں ایسی حماقت نہیں کرسکتی۔" بینی نے کہا۔

لینی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے، تم کار میں بیٹھ کر اپنا میک اپ درست کرو۔ اس دوران میں ذرا ایڈی سے دو دو ہاتھ کرلوں۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اس کی نگرانی کررہے ہیں اور ہمیں اوک ڈیل میں اس کی سرگرمیوں پر شک ہے۔ تم آزادیِ اظہار کا مطلب سمجھتی ہو جس کا مطلب ہے کہ ایک شہری دوسرے کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے۔"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ چیف کے ذہن میں ایسی کوئی بات ہوگی۔" بینی نے کہا۔

"تم ایک بات بھول رہی ہو۔" لینی نے کہا۔ "ہمیں آج سہ پہر تک چیف کو اب تک کی کارروائی سے آگاہ کرنا ہے۔ ہم اسے کیا بتائیں گے؟"

"یہی کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ہمیں مزید وقت چاہیے۔"

لینی نے اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اب وقت نہیں ہے کیونکہ مجھے اتوار کی سہ پہر تھائی لینڈ کے لیے روانہ ہونا ہے اور یہ ٹکٹ ناقابلِ واپسی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ہفتے کو بھی کام کرنا ہوگا۔" بینی نے کہا۔

اتفاق سے چیف کسی ضروری معاملے میں الجھا ہوا تھا اس لیے اس نے دونوں سراغ رسانوں کے ساتھ جمعے کی میٹنگ منسوخ کردی۔ اس طرح انہیں اپنی کارروائی کے لیے مزید وقت مل گیا۔ دوسرے دن صبح وہ پولیس گیراج میں ملے اور اس مرتبہ انہوں نے ایک مختلف ماڈل اور میک کی کار نکلوائی۔ بینی نے تجویز پیش کی کہ کار وہ چلائے گی۔ لینی نے کچھ کہے بنا چابیاں اس کے حوالے کردیں۔ دس منٹ بعد وہ اسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے انہیں ایڈی کا گھر صاف نظر آتا تھا۔

"تم مجھے اپنی دوربین دے دو۔" لینی نے کہا۔

دو گھنٹے تک وہ اپنی کار میں بیٹھے اس مکان کی نگرانی کرتے رہے۔ وقفے وقفے سے لینی سر درد کی شکایت کرتا اور اپنی قسمت کو کوستا رہا کہ اسے ایک ناتجربہ کار سراغ رساں کے ساتھ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ بالآخر وہ اونگھنے لگا۔ اس نے اپنا سر کھڑکی سے ٹکا دیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دوپہر ہوچکی تھی۔

"وہ دو مرتبہ گیراج میں رکھے ڈسٹ بن تک آچکا ہے۔" بینی نے کہا۔ اس کی آنکھیں اب بھی مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ "اس کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں جو میں تمہیں بتاسکوں۔ وہ اس گھر میں تنہا ہی رہتا ہے۔"

لینی کمزور آواز میں بولا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"رات کیا دیر تک جاگتے رہے؟"

اس نے اپنے کندھے اچکائے اور بولا۔ "میں اس طرح کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"شاید آج ہم جدا ہوجائیں۔" بینی نے کہا۔

"پہلی بار تم نے عقل کی بات کی ہے۔"

"البتہ کل ہمیں دوبارہ کام شروع کرنا ہوگا۔"

"کل..... کیا تم اتوار کے دن بھی کام کروگی؟ پاگل ہوگئی ہو۔"

"میں کبھی چرچ جانا نہیں چھوڑتی لیکن چیف نے سختی سے کہا تھا کہ ہمیں ایڈی پر کڑی نظر رکھنی ہے۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اتوار کو بھی کام کریں۔"

لینی بولا۔

"ٹھیک ہے پھر میں ہی سنبھال لیتی ہوں۔ تم اپنی رپورٹ میں لکھ دینا کہ میں نے اس معاملے میں غیر معمولی اقدامات کیے۔"

دوسری صبح وہ پولیس اسٹیشن کے باہر ملے۔ قریبی گرجا گھر سے گھنٹیوں کی آواز آرہی تھی۔ لینی بیس منٹ دیر سے آیا۔ اس سے پہلے ہی بینی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو چکی تھی۔ لینی کے ہاتھ میں کافی کا تھرماس اور ایک بیگ تھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" بینی نے پوچھا تو لینی نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔

وہ اپنے مقررہ مقام تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایڈی اپنے کچرے کے ڈرم لڑھکاتا ہوا باہر لا رہا ہے پھر اس نے تینوں ڈرم بڑے سلیقے سے سڑک کے کنارے رکھ دیے اور واپس گھر میں چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس بار اس کی بغل میں وہی تھیلا تھا۔ وہ معمول کے مطابق پک اپ میں سوار ہوا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

"ہمیشہ کی طرح آج بھی [illegible] کہیں چلا گیا۔" لینی

پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی مجھے گھر جا کر پیکنگ بھی کرنی ہے۔"

"کیوں نہ ہم اس کے کچرے کی تلاشی لیں۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔" بینی نے کہا۔

لینی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "اب تم اس کے کوڑے میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہو۔"

"میں یہ موقع ضائع کرنا نہیں چاہتی۔"

لینی ایک لمحے کے لیے ساکت بیٹھا رہا پھر اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر اس کے سامنے کردیا تاکہ وہ بھی وقت دیکھ لے پھر بولا۔ "صرف آدھا گھنٹا۔ اس سے زیادہ ایک منٹ نہیں۔ جہاز جانے میں صرف چھ گھنٹے ہیں اور ابھی مجھے تیاری بھی کرنی ہے۔"

بینی نے دستانے پہنے اور سڑک پار کر کے ایڈی کے گھر کی جانب چل دی۔ انہوں نے پہلے سبز رنگ کا ڈرم دیکھا۔ اس میں کٹی ہوئی گھاس اور پتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سیاہ ڈرم میں ایسا کچرا اور فالتو سامان تھا جو ری سائیکل نہیں ہوسکتا تھا۔ نیلا ڈرم ڈبوں، بوتلوں اور کاغذ کے تھیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ بینی نے اسے پوری طرح کھنگال ڈالا۔ لینی نے بھی اس میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔ "اس میں کوئی کام کی چیز نہیں ہے۔"

بینی نے ایک ایک کر کے سب چیزیں باہر نکال لیں۔ ان میں دو جن کے قریب خالی بوتلیں، نصف درجن پانی کے ڈبے، دو پیزا کے خالی باکس، ایک کتاب اور ہارڈ ویئر اسٹور کی رسید تھی جس کے مطابق ایک فلیش والو اور بال کاک اسمبلی کی خریداری کی گئی تھی۔ بینی نے وہ کتاب اور رسید اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لی اور باقی چیزیں واپس ڈرم میں ڈال دیں۔

"چابیاں۔" لینی نے اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں کار کی چابیاں مانگ رہا ہوں۔ ہمارا کام ختم ہوگیا ہے اور اب میں کار چلاؤں گا۔"

"میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔"

"لیکن میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ شاید میں نے اس کیس کے سلسلے میں تمہیں ضرورت سے زیادہ چھوٹ دے دی تاکہ تمہارے اندر اعتماد پیدا ہو۔ یہ میری غلطی تھی۔"

"التجا آمیز

"تم چابیاں دو۔" وہ سختی سے بولا۔

بینی کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ جوشیلے انداز میں بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ صرف چیف ہی نہیں بلکہ قصبے کے لوگ بھی ہماری بہترین کوششوں کو سراہیں گے۔"

"میں چھٹیوں سے واپس آنے کے بعد چیف سے بات کروں گا اور کہوں گا کہ میں کسی ناتجربہ کار سراغ رساں کے بغیر ہی تنہا اس کیس پر کام کرسکتا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنا ہی وقت کیوں نہ دینا پڑے۔"

"تم ایک موقع اور دو۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اس معاملے کو بہت جلد نمٹا لیں گے۔"

"تم اپنے سارے مواقع استعمال کرچکی ہو۔"

"میں واقعی سوچ رہی ہوں....."

"تم سوچتی بہت ہو۔" یہ کہہ کر لینی نے اس سے کار کی چابیاں چھین لیں اور بولا۔ "کار میں جا کر بیٹھو۔"

بینی کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ایک لفظ کہے بغیر کار کی طرف چل دی۔ لینی نے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم تیزی سے اپنے جسم کو متناسب بنالو ورنہ دوسری صورت میں تمہیں دوبارہ پیٹرول آفیسر بنا دیا جائے گا۔"

بینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سارے راستے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ پولیس گیراج پہنچ کر انہوں نے سرکاری کار واپس کی اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ کسی نے بھی ایک دوسرے کو خدا حافظ نہیں کہا۔ لینی گھر جا کر اپنی تیاریوں میں لگ گیا۔ چند گھنٹوں بعد اس کی فلائٹ تھی۔ اسے رہ رہ کر بینی پر غصہ آرہا تھا جس نے اس کا اتوار کا دن برباد کردیا پھر وہ تھائی لینڈ کے ساحلوں کے تصور میں کھو گیا جہاں خوب صورت حسیناؤں کی قربت میں وہ دنیا جہاں کے تفکرات سے نجات حاصل کرلیتا جبکہ بینی نے دوبارہ ایڈی کے گھر کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر ایک بار پھر نیلے رنگ کے ڈرم کو کھنگالنے لگی۔

☆☆☆

جب لینی چھٹیاں گزار کر کام پر واپس آیا تو اس نے لابی میں افسروں کے ایک گروپ اور سویلین ملازمین کو دیکھا۔ اس جگہ عام طور پر چیف، لوگوں کی ترقیوں اور اسٹاف سے متعلق دیگر خبروں کے بارے میں نوٹس آویزاں کیا کرتا تھا۔ وہ سب نوٹس بورڈ کی جانب اتنے انہماک سے دیکھ رہے تھے کہ کسی نے بھی لینی کی واپسی کا نوٹس نہیں لیا جو بینگاک میں ایک بڑی رقم خرچ کر کے نئی وگ لگوا کر آیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ مجمع میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا تاکہ دیکھ سکے کہ نوٹس بورڈ پر ایسی کیا خاص بات ہے جسے یہ لوگ اتنے انہماک سے پڑھ رہے ہیں۔ یہ مقامی اخبار کے صفحۂ اول پر شائع ہوا تھا جس کے ساتھ بینی کی چار کالمی تصویر بھی تھی جس میں وہ ایڈی کو ہتھکڑیاں لگائے اس کے گھر سے باہر لا رہی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا۔ ''اوک ڈیل کی زیرِ تربیت سراغ رساں نے جعلی کرنسی پھیلانے والے گروہ کا پتا لگا لیا۔''

مضمون کے متن میں بتایا گیا تھا کہ اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ کی تحقیقات کی بدولت وفاقی ادارے امریکی تاریخ کے سب سے بڑے جعلساز گروہ کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ملک میں بڑے پیمانے پر جعلی کرنسی پھیلا رہا تھا۔ اس گروہ کا سرغنہ چوالیس سالہ ایڈی گزشتہ روز اپنے کرائے کے مکان سے اوک ڈیل پولیس ڈپارٹمنٹ اور امریکی اٹارنی کے دفتر کی مشترکہ کوشش سے گرفتار ہوا۔ بعد ازاں چھ دیگر مشتبہ افراد کو بھی تین دوسرے ملحقہ قصبوں سے گرفتار کیا گیا جبکہ مزید گرفتاریاں متوقع ہیں۔

امریکی اٹارنی کے دفتر کے مطابق گرفتار ہونے والے پانچ افراد کو جعلی کرنسی کا کاروبار کرنے کے الزام میں آج مقامی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ سیکرٹ سروس ایجنٹ اسکاٹ کیمبل جس نے اس چھاپے کے دوران پولیس کی مدد کی تھی، اس کا کہنا ہے کہ بینی ٹیلر کی ماہرانہ تفتیش کے بغیر یہ کارروائی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی جسے صرف تین ہفتے قبل ترقی دے کر پٹرول آفیسر سے سراغ رساں بنایا گیا تھا۔ ترقی ملنے کے ایک ہفتے بعد ہی اسے ایک اور سراغ رساں کے ساتھ مل کر ایڈی کی نگرانی کرنے کے لیے کہا گیا۔ اوک ڈیل پولیس چیف بڈی پونڈر کے کہنے کے مطابق دوسرا سراغ رساں ایک ہفتے بعد ہی تعطیلات گزارنے تھائی لینڈ چلا گیا، اس وقت تک اس معاملے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

پونڈر نے سراغ رساں بینی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے لینی کے چھٹیوں پر چلے جانے کے بعد بھی اپنے طور پر تفتیش جاری رکھی اور ایسے ثبوت تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی جس کے نتیجے میں اسے یقین ہو گیا کہ ایڈی اپنے گھر میں جعلی کرنسی چھاپنے کے ساتھ ساتھ اسے قصبے سے باہر دوسرے علاقوں میں پھیلا رہا ہے۔

بینی نے اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ اسے سب سے اہم سراغ ایکوا نیٹ ہیئر اسپرے کے چھ خالی ڈبوں کی صورت میں ملا جو اس نے ایڈی کے گھر کے باہر رکھے کچرے کے ڈرم سے اٹھائے تھے۔ ماہرین کے مطابق یہ ہیئر اسپرے [illegible] پر ایک تہ جمانے کے کام آتا ہے [illegible] اس کے نقلی ہونے کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

''میں [illegible] اتنی بڑی مقدار دیکھ کر حیران رہ گئی۔'' بینی نے کہا۔ ''[illegible] ایڈی ڈرومنڈ گنجا ہے اور اسے ہیئر اسپرے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ نگرانی کے دوران میرے ساتھی اور میں نے اس کے گھر میں کسی عورت کی موجودگی کے آثار نہیں دیکھے۔ وہ بے روزگار تھا لیکن اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔ کرائے کے گھر میں رہنے کے باوجود وہ مرمت کا کام خود کیا کرتا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باہر کا کوئی فرد اس کے گھر میں آئے تاکہ کسی اور کو اس کی خفیہ سرگرمیوں کا علم نہ ہو۔''

ہیئر اسپرے کے ڈبے بطور ثبوت حاصل کرنے کے بعد بینی نے دوسرے روز بھی ایڈی کا تعاقب کیا۔ وہ چند میل جانے کے بعد ایک ڈرائیو ان ریستوران کے باہر رک گیا۔ جب وہ قطار میں کھڑا ہوا تھا تو بینی اپنا شناختی کارڈ دکھا کر اندر گئی اور اس کھڑکی کے قریب چھپ گئی جہاں سے گاہکوں کو سامان دیا جاتا تھا۔ جیسے ہی ایڈی نے اپنا بل ادا کیا جو بیس ڈالر کے نوٹ کی شکل میں تھا، بینی نے سب سے آنکھ بچا کر وہ نوٹ اٹھا لیا اور اس کی جگہ اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اس کی جگہ رکھ دیا۔

جب اس نوٹ کا بغور معائنہ کیا گیا تو وہ جعلی نکلا لیکن وہ اتنی مہارت سے تیار کیا گیا تھا کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا تھا اور کوئی بھی پہلی نظر میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس انکشاف کے بعد اس نے یہ معاملہ نزدیک ترین اٹارنی آفس کے سپرد کر دیا۔

بینی کے پاس ثبوت کے طور پر ایسی کئی تصاویر تھیں جن میں ایڈی کو دوسرے مشتبہ افراد کو جعلی کرنسی کے تھیلے فراہم کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان کی بنیاد پر سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے اس کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کر کے اس کے گھر پر چھاپا مارا۔ ایڈی کے گھر سے ایک بڑی نوٹ چھاپنے کی مشین کے علاوہ بیس لاکھ ڈالر کی جعلی کرنسی بھی برآمد ہوئی۔ ایڈی کے پاس فرار ہونے کی گنجائش نہ تھی چنانچہ اس نے موقع پر ہی اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے نو[illegible] کے دوران سیکھی تھی

دولت کمانے کا یہی محفوظ ترین راستہ نظر آیا۔ اس کی نشاندہی پر چند مزید مقامات پر چھاپے مارے گئے جہاں سے دس لاکھ ڈالرز مالیت کی مزید جعلی کرنسی برآمد ہوئی۔

''اس کارنامے کا تمام تر سہرا سراغ رساں بینی ٹیلر کے سر ہے۔ اس نے انتہائی ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جعلساز گروہ کا پتا لگایا۔'' سیکرٹ ایجنٹ اسکاٹ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

اس موقع پر پولیس چیف نے بینی کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اس کی آزمائشی مدت ختم کرنے اور اسے اگلے درجے میں ترقی دینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آنے والے برسوں میں اسے مزید ترقی کرتے دیکھ رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا کیونکہ کامیابی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔''

لینی حیرت اور تعجب کے ساتھ نوٹس بورڈ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کا ذہن یہ حقیقت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ بینی ایک ہی جست میں اس کے برابر آ کھڑی ہوئی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ کل وہ اس سے آگے نکل جائے جبکہ ایک ہفتے پہلے تک وہ اس کی ماتحت تھی اور وہ اس پر حکم چلا رہا تھا۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اس کی طبیعت مکدر ہونے لگی۔

''چھٹیاں کیسی گزریں..... مجھے امید ہے کہ تم نے خوب آرام کیا ہوگا؟''

اس آواز پر اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے عمدہ سلا ہوا سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہونٹوں پر نئے شیڈ کی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی جس سے اس کے حسن میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ لینی نے گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔

''میں نے یہاں سے دور رہ کر بہت کچھ سوچا اور اب میں نے اپنے آپ کو بالکل بدلنے کا تہیہ کر لیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' بینی نے کہا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ باقاعدگی سے جم جاؤں گا، شراب نوشی کم کر دوں گا۔ بہتر غذا لوں گا اور اپنی نیند پوری کروں گا اور پہلے والی حالت پر واپس آ جاؤں گا۔ شاید تمہیں اس بارے میں معلوم نہیں۔''

''یہ بڑی مثبت سوچ ہے۔'' بینی نے کہا۔

''[illegible] اسکول کے

''ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہم نئے سرے سے اپنے تعلقات کا آغاز کریں گے تاکہ تم مجھے اچھی طرح جان سکو۔ آج رات میں فارغ ہوں۔ تم کیا کہتی ہو؟''

''مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے۔ ہماری ملاقات گزشتہ ہفتے ہی ہوئی تھی اور میں پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھی۔ وہ آج رات میرے والدین سے ملنے آ رہا ہے۔''

''اگر تم مذاق نہیں کر رہی ہو تو یہ بہت اچھی خبر ہے۔'' لینی نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اس خوش نصیب کا نام جان سکتا ہوں؟''

بینی نے اخبار میں چھپی ہوئی سیکرٹ ایجنٹ اسکاٹ کیمبل کی تصویر کی طرف اشارہ کیا جس نے بینی سے کہا تھا کہ وہی ایڈی ڈرومنڈ کو ہتھکڑی پہنائے کیونکہ درحقیقت یہ کارنامہ اسی نے سرانجام دیا ہے۔

لینی نے غور سے تصویر کو دیکھا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیمبل میں ایسی کیا خاص بات ہے جو بینی جیسی لڑکی اس سے متاثر ہو گئی۔ لینی نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ نظر آ رہی تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک نمایاں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کی حد تک پُراعتماد ہوتے ہیں اور انہیں کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لینی بھی ایسا ہی آدمی بننا چاہ رہا تھا اور اپنی زندگی میں بڑی تبدیلیاں لانے کا خواہش مند تھا۔ اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تب بھی اس کے اور اسکاٹ کیمبل کے درمیان ایک فرق باقی رہتا اور وہ یہ کہ اسکاٹ کے بال اصلی تھے اور وہ وگ نہیں لگاتا تھا۔

''کیسا لگا؟'' بینی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''تمہاری پسند میری پسند ہے۔'' لینی نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''آخر دوست ہوں تمہارا۔ اب تو تمہیں میرے ساتھ ڈنر پر جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''آج نہیں... پھر کبھی۔'' بینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ اسے ایک ساتھ دو خوشیاں ملی تھیں۔ ایک جانب اس کی ترقی ہوئی تھی تو دوسری طرف اسکاٹ جیسا اسمارٹ شخص اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر لینی کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر اس کے سر پر بال ہوتے تو کیا وہ اسے قبول کر لیتی؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

جواری

احمد اقبال

ساتویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

"شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... عام اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خوشیات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر بنتی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... اپنی بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ لیے ہوئے جادو اثر تحریر...

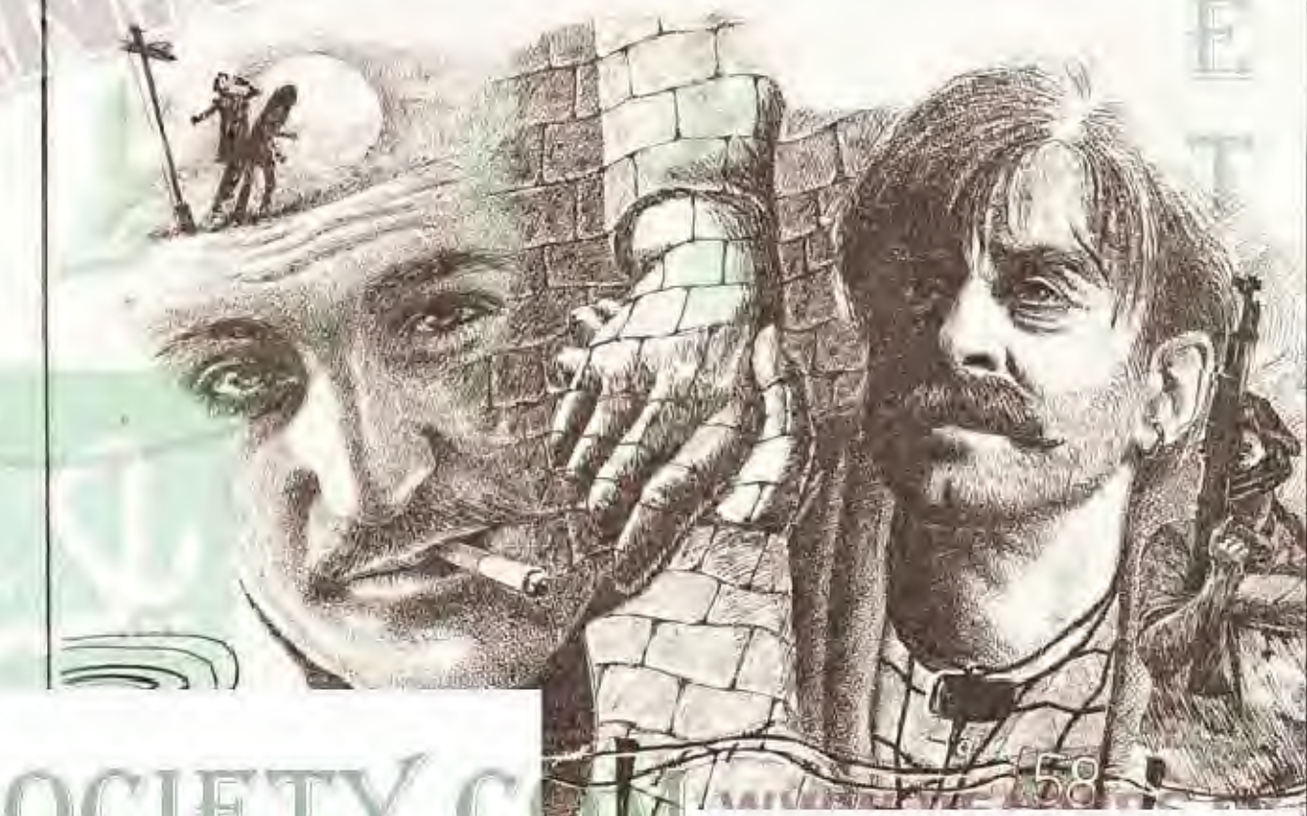

WWW.PAKSOCIETY.COM

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گامارستم بھی پھانسی کا منتظر تھا... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کمپلٹ میں نورین ملی جو لباس عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا... نورین یہاں سلیمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فریدالدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ براہ راست پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور اور نورین کوئٹے کراچلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودتے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو نورین کی لگتی تھی مگر وہ نازی کی بہن تھی۔ اسے کسی دشمن کے بیٹے نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانپور کے ویٹنگ روم میں رات گزارنے کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور رشیم اور خاور کو چودھری کے گرگے اغوا کر لے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ رشیم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کر دیا گیا۔ حویلی میں انور نے اپنے مہمان ڈی آئی جی ملک احسان سے خاور کو ملوایا۔ اس نے بتایا کہ آپ کے دوست کا ہم شکل ایک مجرم جیل سے فرار ہے۔ تاہم بظاہر اس نے کسی شک کا اظہار نہیں کیا۔ ادھر بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا لیکن اس نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام کام گھر پر ہی کیے جائیں۔ خاور اور انور نے اسپتالوں کو ایکو پمنٹ سپلائی کرنے والی کمپنی سے رابطہ کیا اور ان سے ایکو پمنٹ کی خریداری کی بات کی۔ وہیں ایک شخص نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے شناخت کیا تاہم خاور نے انکار کر دیا۔ انور نے لے کر شناختی کارڈ آفس گیا تاکہ اسے نئی شناخت دے سکے مگر شناختی کارڈ بنانے والے نے فنگر پرنٹس دیکھ کر انکار کر دیا۔

.....اب آپ آگے پڑھیے.....

انور کے سکون اور اعتماد میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔ ”دیکھو... ہم جو تمہیں اتنی بڑی رشوت دے رہے ہیں... اس لیے نہیں کہ ہم بے وقوف ہیں... یہ جائز اور قانونی شناختی کارڈ بنوانے کی قیمت نہیں ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن... خطرہ مول لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“

انور مسکرایا۔ ”میاں جی... ڈر کس کا ہے؟“

”پکڑے جانے کا۔“ وہ عیاری سے بولا۔

انور نے کہا۔ ”دنیا میں یا آخرت میں؟ یہاں ہر غیر قانونی کام ہر آدمی اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ یہ ڈر ہوتا تو نہ تم یہ کام کرتے نہ ہم... اور آج تم یہ کام پہلی بار کر رہے ہو نہ ہم... اس طرح تم اپنا ریٹ نہیں بڑھا سکتے۔ ایسے کام کرنے والے بہت ہیں... ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں۔“

اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ کام ہو جائے گا، آپ کرتے کیا ہو؟“

انور نے کہا۔ ”میں غیر قانونی طور پر لوگوں کو باہر بھجواتا ہوں۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ دونوں کسی اور کے نام پر ہوتے ہیں۔“

شہباز خان نے سر ہلایا جیسے سب سمجھ گیا ہو۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ اس کا شناختی کارڈ پہلے جاری ہوا تھا۔ فریدالدین ولد چودھری رشیدالد

اس کی تصویر بھی ہے۔

میں نے کہا۔ ”اب مجھے دوسرے نام سے چاہیے۔ تم یہ کام کر سکتے ہو تو بتاؤ ورنہ چھوڑو۔“

”کارڈ بن جائے گا لیکن تمہیں انگوٹھے کا نشان دوسرے ہاتھ کا لگانا پڑے گا۔“

”مجھے اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”بات تکلیف کی نہیں... تمہیں آئندہ یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تمہارے انگوٹھے کا نشان کس ہاتھ کا ہے ورنہ صحیح فنگر پرنٹ تمہارا پچھلا پورا ریکارڈ سامنے لے آئے گا کہ پہلے تم ملک سلیم اختر نہیں تھے۔ پہلے تم پکڑے جاؤ گے... میری یاری بعد میں آئے گی۔ جب دوسرے کارڈ کے اجرا کے معاملے کی تفتیش ہوگی اور تاریخ اجرا پر دیکھا جائے گا کہ ذمے دار کون لوگ تھے۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔

”برا نہ مانو تو ایک مفت مشورہ دوں... جو تمہارے مفاد میں بھی ہے اور میرے بھی۔“

”بولو۔“ انور نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

”جس انگوٹھے کا نشان ریکارڈ پر ہے... وہ کٹوا دو... شناختی علامت بھی یہی لکھ دو۔“

میں چونک پڑا۔ ”کٹوا دوں؟“

”ہاں کیا حرج ہے؟ آگے کا تھوڑا سا حصہ نہ ہو تو کیا فرق پڑتا ہے... کہاں کام آتا ہے؟“

میں نے انور کی طرف دیکھا۔ ”ہم سوچیں گے اس بارے میں... تم اپنا کام کرو۔“

اس نے امید بھری نظروں سے انور کی طرف دیکھا۔ ”یہ کام سمجھو ہو گیا تمہارا... لگاؤ یہاں انگوٹھا... یہ نہیں یار یہ والا۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے انگوٹھا اسٹیمپ پیڈ پر دبایا اور اسکینر پر رکھ دیا۔

انور نے چیک نکالا۔ ”ہم پھر کب آئیں... تم ملو گے نا؟“

وہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ ”یار! ہم اپنی دکان چھوڑ کے کدھر جائے گا؟“

”یہ دکان نہیں... سونے کی کان ہے۔“ انور نے چیک اسے دے دیا۔

اس نے چیک کو غور سے دیکھا۔ ”یہ بینک تو لاہور میں ہی ہے۔ تم کیش کرا کے لا دو تو اچھا ہے۔“

انور نے چیک واپس لے لیا۔ ”او کے... پھر ہم

۔“ میں نے کہا

اور اسے گن کر پچیس ہزار دے دیے۔ اس نے کہا کہ ہم کل شام کارڈ لے جائیں۔

ہم باہر آئے اور ایک بار پھر ٹیکسی میں نیلا گنبد پہنچے جہاں انور کا ڈرائیور گاڑی میں سو رہا تھا۔ انور نے اسے سونے دیا اور اگلے دو گھنٹے ہم نے انارکلی میں شاپنگ کرتے گزارے۔ انور نے اپنے لیے کچھ کپڑے بنوائے اور اس کے اصرار پر میں نے بھی بنوائے تاہم میرا ذہن شناختی کارڈ آفس کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں شکوک اور اندیشے سر اٹھاتے جا رہے تھے۔ انور نے یقیناً یہ بات نوٹ کی ہوگی لیکن بازار میں چلتے چلتے اس نے مجھ سے بات کرنے سے گریز کیا۔ ہم واپس آئے تو ڈرائیور جاگ رہا تھا۔ ایک بار پھر ہم میونسپل ایکو پمنٹ سپلائی کمپنی میں گئے۔ انہوں نے ہمیں شام تک قطعی جواب دینے کا وعدہ کیا تھا۔

گاڑی کچھ فاصلے پر رکی تو میں نے دوبارہ اندر جانے کا رسک نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مجھے سکھر جیل کے قیدی کی حیثیت سے پہچاننے والا اب مجھ سے اپنے اطمینان کے لیے مزید سوالات کرے۔ ایسا لگتا تھا کہ میری وضاحت سے اس کا شک دور نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ خود جیل میں نہ ہوتا تو مجھے شناخت کیسے کرتا لیکن مجھے اس کے جرم کی تفصیلات جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

انور آدھ گھنٹے بعد آیا تو بہت خوش تھا۔ ”یار! کام بن گیا۔ انہوں نے جو تخمینہ دیا تھا، اس کا نصف میں نے ادا کر دیا۔ یہ کل سے ایکو پمنٹ کی تنصیب شروع کر دیں گے۔ ابا جی کے کمرے کو آئی سی یو بنانے میں ایک ہفتہ لگے گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ابا جی خوش ہوں گے۔“

”بس یار... دنیا گھوم کے ہم نے یہی دیکھا کہ کوشش سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔“

”اب مرحلہ رہ گیا ڈاکٹر اور نرس کا۔“ میں نے کہا۔

”نرس کو منانے کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ بس منہ مانگی تنخواہ اور سہولت دینی ہو گی۔ منانا پڑے گا اس ریٹائرڈ کارڈیالوجسٹ کو... پہلے کہیں چائے پیتے ہیں پھر چلتے ہیں اس کی طرف۔“

مال پر کرپا رام کمپاؤنڈ میں دوسرا شیزان اور پنٹل تھا۔ اس کا ماحول بیڈن روڈ کے کانٹی نینٹل سے یکسر مختلف تھا۔ یہاں کا طرز آرائش سو فیصد مشرقی اور کسی حد تک مغلئی تھا۔ دیواروں کی پینٹنگ سے لے کر ڈیکوریشن پیس، لائٹس اور فرنیچر میں کچھ درباری ماحول نظر آتا تھا۔ ہم شمع دان سے روشن ایک گوشے میں جا بیٹھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انور نے کہا۔ ''اب بتا مجھے... تُو اتنا پریشان کیوں ہے؟''

''حد کرتے ہو تم یار... شناختی کارڈ کے دفتر میں جو کچھ ہوا...''

''کچھ بھی نہیں ہوا وہاں... اور نہ ہوگا۔ اپنے ماضی کو بھول جا... اب تو ملک سلیم اختر ہے... گواہی میری۔''

''اور شناخت میری... اس کا میں کیا کروں؟''

''وہ بھی بدل جائے گی وقت کے ساتھ دوست... حوصلہ رکھ۔''

''یار! میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''کیا؟''

''جو اس ایجنٹ نے کہا تھا، وہ قابلِ عمل ہے... مجھے انگوٹھا کٹوا دینا چاہیے۔''

''او مائی گاڈ... یار اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حلیہ بدلنے کے آسان اور بہتر طریقے بھی ہیں۔ تو داڑھی بڑھا سکتا ہے... مونچھیں پال سکتا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مائی ڈیئر انور! آئی ایم سوری... مگر تم میری طرح وہ شخص نہیں ہو جو زندگی کے لیے بھاگ رہا ہو۔ امید اور نا امیدی کے درمیان صرف ایک نظر نہ آنے والا لمحہ حائل ہوتا ہے۔ میں اس سے سوتے جاگتے خائف رہتا ہوں کیونکہ وہ لمحہ مجھے پھر پھانسی کے تختے پر نظر آتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں خدا نے میرے جیسے گناہ گار کو یہ ایک زندگی گزارنے کی مہلت پھر عطا کر دی... ایسا دوسری بار نہیں ہوگا۔''

اس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ''یہ گزشتہ دو تین دن کے اتفاقات سے پیدا ہونے والا ڈپریشن ہے۔ میں ذرا پریکٹیکل آدمی ہوں۔ سر درد لیے پھرنے کے بجائے ایک گولی سے اس کا علاج کر لیتا ہوں۔ کیا حرج ہے اگر تُو بھی کوئی اینٹی ڈپریشن میڈیسن استعمال کر لے کیونکہ ڈپریشن کے اسباب تو رہیں گے۔''

''پھر میں دوا کی بیساکھی کا محتاج ہو جاؤں گا... نو سر! میں اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا... میرا خیال ہے کہ ایک نئی اور مختلف شناخت کے ساتھ نئی اور مختلف زندگی اپنانے کے لیے شارٹ کٹ کوئی نہیں، اس میں کچھ وقت لگے گا۔''

''او کے... جیسی تیری مرضی بھائی... ابھی تو اٹھ... ایک آخری کام ہے، وہ بھی نمٹا لیں۔''

ہم ریسٹورنٹ سے نکلے تو رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی۔ مال پر روشنیاں جاگ اٹھی تھیں۔ سڑک پر ایک قطار میں نظر آنے والی اسٹریٹ لائٹس... ایک سیلاب کی صورت بہتی کاروں کی ہیڈ لائٹس... بڑی بڑی فیشن شاپس کے سائن بورڈز اور شوکیسوں کی آرائشی لائٹس اور تاریک افق کے پس منظر میں رنگین روشنی کے حروف والی اشتہاری نیون لائٹس... کاروباری مصروفیت والا ایک دن گزرتے ہی لاہور کے مال پر حسن و نور کے جلووں سے سجی رات جوان ہو جاتی ہے۔ ہم اس متحرک ہجوم میں شامل ہو کے چیرنگ کراس سے ایبٹ روڈ کی طرف مڑ گئے۔ بڑے چودھری صاحب کے پرانے پسندیدہ اور خاندانی ڈاکٹر کا کلینک لکشمی چوک سے آگے بسنت روڈ پر تھا۔ کلینک کے ویٹنگ روم میں اس وقت بھی مریض اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انور نے دروازے سے اندر جھانکا۔

ڈاکٹر کسی خاتون مریض کا نسخہ لکھ کے فارغ ہوا ہی تھا۔ ''چودھری انور... آیئے۔'' وہ کچھ حیران ہوا۔

''ہم آپ کا وقت ضائع نہیں کریں گے... ہمیں اس کارڈیالوجسٹ کا پتا چاہیے۔'' انور نے کہا۔ ''پھر ہم چلتے ہیں۔''

اس نے ایک کاغذ پر پتا لکھا۔ ''دن میں آتے تو میں آپ کے ساتھ چلتا... چائے تو پی کر جائیں۔''

''تکلف کی کوئی بات نہیں۔ یہ وقت مریضوں کا ہے... خدا حافظ۔'' انور نے کاغذ کا پرزہ لے لیا اور باہر آ کے ڈرائیور کو دے دیا۔ ''اس پتے پر جانا ہے... چلو۔''

ڈرائیور پرانا اور لاہور کی سڑکوں ہی نہیں، گلیوں کے جغرافیے سے بھی واقف تھا۔ اس نے تقریباً پون گھنٹے بعد ہمیں جیل روڈ کی ایک کوٹھی کے سامنے اتار دیا۔ اس کی گیٹ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں باہر دو نیم پلیٹیں پڑھی جا سکتی تھیں۔ ایک ڈاکٹر محمود جلالی کی اور دوسری کرنل عامر محمود کی۔ روشنی صرف اوپر والی منزل کے ایک حصے میں نظر آتی تھی۔ کال بیل بھی صرف ایک تھی۔ گھنٹی نہ جانے کہاں بجی۔ انور دوبارہ بٹن دبانے ہی والا تھا کہ ایک کھڑکی روشن ہوئی۔ شیشے کے پٹ کھول کے کسی نے جھانکا اور پوچھا۔ ''کون ہے؟''

انور نے کہا۔ ''جی... مجھے ڈاکٹر جلالی سے ملنا ہے۔ میں چودھری انور علی ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں اوپر آنا پڑے گا یا مجھے نیچے... ورنہ بولو کیا کام ہے'' میں بھی جلال تھا۔

انور نے کہا۔ ''بات ایسی ہے کہ ہمیں اوپر آنا پڑے گا۔''

''اچھا... ایک منٹ ٹھہرو۔'' اس کا چہرہ کھڑکی سے غائب ہوا اور پھر دو منٹ بعد نمودار ہوا۔ اس نے ایک چابی اوپر سے پھینکی۔ ''یہ لو... گیٹ کا تالا کھول کے اندر آؤ... پھر گیٹ لاک کر دو... بائیں جانب پورچ کے بعد گیلری ہے۔ اس کے آخر میں زینہ ہے۔ دوسری چابی اس کے گیٹ کی ہے۔ اندر آنے کے بعد اسے بھی لاک کر دینا۔''

چودھری انور نے چابی کیچ کر لی تھی۔ اس نے گیٹ میں نصب لاک کو کھولا۔ ''اس سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا دوست۔''

میں نے کہا۔ ''بہت کڑک چیز ہے۔ مشکل ہے کہ مانے۔''

''میرے پاس ہے ایسے بوڑھوں سے نمٹنے کا ایک نسخہ۔'' انور نے گیٹ کو اندر سے لاک کیا۔ ''سعادت مندی... ان کو بولنے دو... اپنی بالکل نہ کہو... ہر بات سے اتفاق کرو... پھر اپنی منوا لو۔''

''دیکھتے ہیں آج یہ نسخہ کتنا کارگر ثابت ہوتا ہے۔''

''شرط لگا لو۔ میں جیت جاؤں گا۔ یورپ میں ایسے تنہا بوڑھوں کو ایکسپلائٹ کر کے بہت فائدہ اٹھایا تھا میں نے جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا۔ بیوی بچے سب چھوڑ جاتے ہیں تو وہ بات کرنے والے کو ترستے ہیں۔'' انور نے اوپر جانے کا راستہ کھولا اور پھر بند کر دیا۔ زینے کے آخر میں سب سے اوپر پھر ایک دروازہ تھا۔ ہمارے آخری زینے پر قدم رکھتے ہی وہ جیسے خود بخود کھل گیا۔ روشنی کے فریم میں ہمیں دراز قد اور درمیانے جسم والا ڈاکٹر جلالی نظر آیا جو اپنے گھنے برف جیسے سفید بالوں کے ساتھ بے حد گریس فل لگتا تھا۔

اس نے باری باری ہم سے پُرجوش مضبوط ہاتھوں کی گرفت کے ساتھ مصافحہ کیا۔ ایک واجبی انداز میں آراستہ ڈرائنگ روم اور پھر لاؤنج یا کھانے کے کمرے سے گزر کے ہم جس بیڈ روم میں پہنچے، وہ خاصا کشادہ اور روشن تھا۔ اس کی آرائش میں نفاست اور سادگی کا حسن تھا۔

ہمارے سامنے بیٹھ کے اس نے پوچھا۔ ''یس... اب بتاؤ دل کے روگ کا مسئلہ کس کا ہے؟ ایک جوانی میں راہ چلتے بھی لگ جاتا ہے، اٹھتے بیٹھتے بھی... اس کا شافی علاج تو ب ہی ملتی
۔ ہم اس عمر سے گزر آئے جس سے تم گزر رہے ہو۔''

انور نے مسکرا کے کہا۔ ''لاعلاج عشق کا کوئی تجربہ نہیں ہوا آپ کو؟''

وہ ہنسا۔ ''آخری ایسا ہی تھا۔ صدمے اٹھا اٹھا کے دل کی قوتِ مدافعت اتنی کم ہو گئی تھی کہ خودکشی کرنا پڑی۔ بقول منیر نیازی... کچھ سانوں مرن دا شوق وی سی... اس کی سزا بن گئی ہے اب یہ زندگی۔''

''خودکشی کیسے کی تھی آپ نے سر؟''

''یار ایک مولوی کے سامنے دو لفظ بول کر... کہ قبول ہے... ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے... انجام سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ تم بھی یہی کرو گے بالآخر... پھر ایک دن اچانک تنہا رہ جاؤ گے میری طرح... ایک پیسے والی گاڑی...'' اس نے دیوار پر لگی ایک تصویر کو دیکھا۔ ''وہ خود... رفاقت کے تیس برس اور چھ بچے کہاں گئے... خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا۔ خیر... پہلے بتاؤ چائے پیو گے کافی... پھر بتانا اپنی آمد کا مقصد۔''

انور کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ دیوار پر جس خوب صورت عورت کی تصویر تھی، وہ یقیناً اس کی مرحومہ بیوی تھی۔ چھ فریم ان بچوں کی تصویروں کے تھے جو خود اپنے بچوں کے ساتھ کھڑے تھے لیکن صرف تصویر کی صورت میں یا عکس رہ گئے تھے... اس گھر کی وسعت میں وہ اپنے ماضی کے ساتھ تنہا تھا۔ ہم اسے کافی بناتا دیکھتے رہے۔ ایک کامیاب زندگی کا یہ ناکام انجام یقیناً افسردہ کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس سنانے کے لیے اپنے ماضی کی کتاب میں قابلِ رشک داستان اور قابلِ فخر فتوحات کی کہانیاں تھیں لیکن آج اپنے اکیلے پن کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا شخص باتیں نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔

ہم اس کی داستان صبر سے سن رہے تھے۔ انور نے بڑی شائستگی اور سعادت مندی سے اس کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ جب اس کے سینے میں بھرا ہوا غبار نکل گیا تو اس نے خود ہی پوچھا۔ ''یار ایک خبطی بوڑھے کو معاف کر دینا... اپنی باتوں میں بھول گیا کہ تم پہلی بار آئے ہو تو کسی کام سے آئے ہو گے... کچھ پرانے مریض بھی آتے ہیں تو مفت مشورے کے لیے... بے غرض ملنے والا اب کوئی نہیں رہا۔''

انور نے کہا۔ ''میں آپ کی شہرت کا سن کے آیا تھا۔''

''کون ہو تم؟ کسی چٹھڑا اخبار کے رپورٹر جسے کوئی شوبزنس کی تھرڈ ریٹ ایکٹریس... کوئی دو کوڑی کا پاپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سنگر... کوئی تانگا پارٹی کا سیاسی ورکر بھی انٹرویو نہیں دیتا۔"
وہ برہم ہوگیا۔
انور نے فوراً کہا۔ "جی نہیں سر... آپ بڑے نامور کارڈیالوجسٹ تھے اور طویل تجربہ رکھتے ہیں۔"
"سب سمجھتے ہیں میں ناکارہ، آؤٹ آف ڈیٹ ہوں... لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں سب دیکھتا رہتا ہوں... میڈیکل سائنس میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے۔ میں سرجن تھا۔ سیکڑوں کامیاب آپریشن کیے میں نے اور میرے ہاتھوں کے اعجاز مسیحائی نے انہیں حیاتِ نو دی جو ہر طرف سے مایوس لوٹ آئے تھے۔ اب میرے ہاتھ کانپتے ہیں، نہ میری بصارت میں فرق آیا ہے لیکن دنیا بدل گئی ہے۔ خیر، میں پھر اپنی کہنے لگا، تم اپنا مسئلہ بتاؤ۔"
جب انور نے اپنی بات شروع کی تو حیرت انگیز طور پر اس نے پوری توجہ سے سنی اور کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ انور نے بھی گھما پھرا کے بات نہیں کی۔ بڑے چودھری صاحب کا مسئلہ اور مرض کی پوری تفصیل ڈاکٹر کے سامنے رکھ دی۔ آخر میں اس نے یہ بتایا کہ اب ان کی ضد پر علاج معالجے کی تمام سہولت گھر میں بھی فراہم کر دی گئی ہے۔ کمی ہے تو صرف ایک اچھے معالج کی جو ان کی دیکھ بھال کر سکے... مسئلہ نہ معاوضے کا ہوگا اور نہ سہولت کا... اگر وہ ساتھ رہیں تو ان کی ہر شرط اور ہر مطالبہ پورا کرنے کی مکمل ضمانت دی جائے گی۔
جب انور خاموش ہوا تو ڈاکٹر جلالی کچھ دیر موچتا رہا پھر اس نے اپنا مختصر فیصلہ سنا دیا۔ "میں چلوں گا۔"
انور کے چہرے پر سکون اور مسرت کے جذبات روشن ہوگئے۔ "میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"
"اس کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے کب جانا ہوگا؟"
"جب آپ کہیں گے، گاڑی بھیج دی جائے گی۔ اچھا ہوگا کہ تمام ایکوپمنٹ آپ کی نگرانی میں لگایا جائے۔"
"پھر کل صبح دس بجے میں تیار رہوں گا... شرط میری صرف ایک ہے۔"
"فرمائیے۔" انور کا جوش و خروش جیسے کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا۔
"تم یہ کمرا دیکھ رہے ہو؟ یہ تمہیں یوں کا یوں یہاں سے اپنی حویلی میں منتقل کرنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح... اس کی ہر چیز جائے گی اور وہاں کسی کمرے میں اسی ترتیب کے ساتھ رکھ دی جائے گی۔ ایک مریض کی نگرانی اور علاج میری ذمے داری ہے لیکن اس کے بعد میری زندگی اپنی ہے... یہ ڈسٹرب نہ ہو تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں لاہور میں رہوں یا کسی اور جگہ۔"
"مجھے بالکل منظور ہے... آپ کو کسی فرق یا کمی کا احساس ہو تو ذمے دار میں..." انور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے اجازت دیں۔ گاڑی صبح ٹھیک دس بجے آپ کے دروازے پر ہوگی۔"
یہ انتہائی غیر متوقع کامیابی تھی۔ اس میں ہمارا وقت تو صرف ہوا لیکن محنت نہیں۔ جو وقت لگا، وہ بھی ڈاکٹر جلالی کی باتیں سننے میں لگا۔ انور کا صبر اور حوصلہ کام آیا۔ سعادت مندی کی جس حکمتِ عملی سے اس نے اپنے باپ کی مواقفت حاصل کر لی تھی، اسی سے وہ ڈاکٹر کا دل جیتنے میں بھی کامیاب رہا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم نے واپسی اختیار کی اور امید تھی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد حویلی میں ہوں گے۔ ہم گاؤں کی طرف جانے والی سڑک سے بیس یا تیس کلو میٹر دور تھے اور دونوں طرف خاصا گھنا جنگل تھا۔ یہاں سڑک پر روشنی ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا... رات بھی تاریک تھی۔ یہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں جب چاند کہیں نصف شب کے بعد جھلک دکھاتا ہے۔ مطلع شام سے ابر آلود تھا۔ ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ بادل گہرے ہو گئے ہیں۔ سڑک گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے روشن تھی ورنہ اس تاریکی میں سڑک کی سیاہ چوڑائی کا اندازہ ہونا بھی ناممکن تھا۔
جب ہم نے مین روڈ چھوڑ کے دائیں جانب کی نسبتاً کم چوڑی سڑک پکڑی تو سناٹا مزید گہرا ہو گیا۔ اب مین روڈ پر دونوں طرف سے آنے والا ٹریفک بھی نہیں تھا۔ اچانک ہوا تیز ہوگئی اور اس کا اندازہ شیشم اور پیپل کے پتوں کا شور بڑھ جانے سے ہوا تاہم پجیرو ایسی طاقتور گاڑی تھی کہ وحشت وصحرا اور ندی نالوں پر سے دندناتی گزر جاتی تھی۔ یہ علاقہ ہمیشہ سے ڈاکوؤں کی دست برد سے محفوظ رہا تھا چنانچہ میں اور انور علی بے فکری سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ انور اپنی اس کامیابی سے خوش تھا کہ ابا جی کا علاج ان کی ضد اور منشا کے مطابق اب حویلی میں ہی ہوگا اور یہ بات انور کے حق میں جائے گی۔ شاید اکبر نے ابا جی کی بیماری کو اتنی اہمیت کبھی نہ دی تھی اور اس کے لیے بھی یہ سارا انتظام ناممکن نہیں تھا مگر وہ اتنا تردد ہی نہ کرتا۔ انور بہت پُرامید تھا کہ آنے والے ہفتے میں وہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے کر لے گا اور سب کی ناراضی بھی دور کر دے گا۔ اکبر اس کے حسنِ اخلاق ہے کہ تمام جا

جائے اور پھر وہ اپنے حصے میں جو چاہے کرے۔
اچانک میرے کانوں نے ایک فائر کی آواز سنی لیکن اس سے پہلے ڈرائیونگ سائڈ کی کھڑکی کے شیشے پر مکڑی کا جالا سا پھیل چکا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور گولی کہیں گاڑی سے باہر لگی۔ تیسری گولی نے انور کی طرف کی کھڑکی کے شیشے کو منتشر کر دیا۔ یہ سب دو چار سیکنڈ کے وقفے سے ہوا۔ گاڑی نے اتنی دیر میں سو پچاس گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا۔ ڈرائیور ایک دم چلایا۔ "سر نیچے کر لیں جناب عالی۔" مگر اس کے چلانے سے پہلے ہی ایک خودکار عمل کے تحت ہم سیٹوں سے نیچے گر گئے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کو سوچے سمجھے بغیر ایک طرف گھما دیا۔ گاڑی اچھلی اور دائیں بائیں ہوئی لیکن کسی درخت سے ٹکرائی نہیں۔ ڈرائیور کی مہارت تھی کہ اس نے اسپیڈ کو بھی کنٹرول کیا اور درختوں کے درمیان سے راستہ بھی نکالا۔ اتنی دیر میں دو گولیاں اور گاڑی کے شیشوں کو منتشر کر چکی تھیں۔ پجیرو کے شیشے اس حد تک ضرور بلٹ پروف تھے کہ پتھر یا گولی لگنے سے ذرہ ذرہ ہو کے بکھرتے نہیں تھے۔ ایسا ہوتا تو اندر آنے والے شیشے کے ذرات بھی ہمیں لہولہان کر دیتے۔ انور نے چلا کے مجھ سے پوچھا اور میں نے اس سے کہ تم ٹھیک ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ فائرنگ کرنے والے دائیں بائیں موجود تھے۔ وہ گاڑی کے پیچھے کسی دوسری گاڑی میں نہیں آ رہے تھے۔
گاڑی بالآخر ایک درخت سے تصادم کے بعد رکی۔ اس جھٹکے نے ہمیں گاڑی کے اندر اچھال دیا۔ ہیڈ لائٹس ٹوٹ گئی تھیں یا ڈرائیور نے آف کر دی تھیں۔ میں نے اندھیرے میں اس کی آواز سنی۔ اس نے چلا کے کہا۔ "بھاگو جناب عالی۔" پھر وہ خود گاڑی سے کود گیا۔ ایک دروازے سے میں نے باہر جست لگائی اور دوسرے سے انور نے... قسمت نے اب تک ہمارا ساتھ دیا تھا کہ گولی شیشے میں سوراخ کر کے گزر گئی تھی لیکن ہم نشانہ بننے سے بچ گئے تھے۔ اگر پہلی گولی نے ڈرائیور کی کنپٹی میں سوراخ کر دیا ہوتا تو گاڑی بے قابو ہو کے الٹ جاتی۔
میں اندھیرے میں سمت دیکھے بغیر بھاگا اور گھنی جھاڑیوں میں سے گزر گیا۔ میرے ہاتھوں پر گہری خراشیں آئیں۔ فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ لگتا تھا کہ حملہ آور گاڑی کے تعاقب میں جنگل کے اندر گھس آئے ہیں۔ اسلحہ انور کے پاس بھی تھا اور ڈرائیور کے پاس بھی لیکن اندھیرے میں کسی اندازے
ے میں

دیکھنے والا چشمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس اندھا دھند فائرنگ کا جواب دینا بھی بے وقوفی ہوتی۔ اس سے حملہ آوروں کو پتا چل جاتا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ مجھے نہ انور کا پتا تھا اور نہ ڈرائیور کا... وہ بھی خاموشی سے فرار ہو کے محفوظ مقام تک پہنچنا چاہتے تھے۔ فائرنگ کے درمیان ہی میں نے کسی کے بھیانک آواز میں چلانے کی آواز سنی۔ یہ غالباً ڈرائیور تھا اور وہ کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔
مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری سمت کیا ہے اور مجھے بھاگتے ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے لیکن پھر فائرنگ کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی اور آوازیں بھی بہت پیچھے رہ گئیں تو میں دم لینے کے لیے ٹھہرا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور میرے حواس قابو میں نہ تھے۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہوا کہ موت ٹل گئی ہے تو میں جیسے تیسے کر کے اس درخت پر چڑھ گیا جس کے نیچے رکا تھا۔ یہ شیشم کا درخت تھا اور اس کے تنے پر رینگنے والے چیونٹے میرے ہاتھوں پر آ گئے۔ انہوں نے مجھے بڑی بے رحمی سے کاٹا بھی لیکن میں نے کچھ اوپر ایک شاخ پر لگنے سے پہلے کسی تکلیف کی پروا نہیں کی۔
جب میں غلیل کی شکل کے ایک مضبوط دوشاخے پر پہنچ گیا تو میں نے خود کو کچھ محفوظ محسوس کیا۔ زمین سے پندرہ فٹ کی بلندی پر مکمل تاریکی کی پناہ میں مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہوا اس درخت کے پتوں میں سے بھی سنسناتی گزر رہی تھی اور ہر طرف سے اٹھنے والے اس شور کی گونج ماحول کو پُرخوف بنا رہی تھی۔ اب بادلوں میں بجلی بھی چمکنے لگی تھی۔ صرف لمحہ بھر کے لیے پھیلنے والی اس روشنی میں مجھے اپنے چاروں طرف جنگل کے جھومتے درختوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ حملہ آور نہ جانے کہاں تھے۔ وہ ہمیں تلاش کر رہے تھے یا اپنی ناکامی سے مایوس ہو کے واپس جا چکے تھے۔ مجھے نہ انور کا پتا تھا کہ وہ کس سمت میں فرار ہوا اور میری طرح کسی درخت میں پناہ لے چکا تھا یا ابھی تک بھاگ رہا تھا۔ یقیناً اتنی ہی تشویش اسے میری طرف سے ہوگی لیکن ابھی سانس روک کر خاموش بیٹھے رہنے کے سوا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرائیور کے بارے میں مجھے اندیشہ تھا کہ اس نے حملہ آوروں کو دیکھا تو ان کو نشانہ بنایا اور انہی کے ہاتھوں مارا گیا۔ جب تک پورا یقین نہ ہو کہ حملہ آور ناکام لوٹ گئے ہیں، میں انور کو یا انور مجھے آواز دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔
آہستہ آہستہ میری سانس قابو میں آئی اور میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اعصاب پر بھی خوف کے مفلوج کر دینے والے اثرات کم ہونے لگے۔ میں نے تاریکی میں روشن نظر آنے والے گھڑی کے ڈائل کو دیکھا تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ابھی یہ اعصاب کی جنگ تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ نامعلوم حملہ آور بھی کہیں تاریکی میں دم سادھے ہمارا کوئی رسماغ ملنے کے منتظر ہوں۔ کسی آواز پر یا آہٹ پر کان لگائے کھڑے ہوں۔ آخر وہ کب تک انتظار کریں گے؟ خون ریزی کا یہ کھیل صرف تاریکی میں جاری رہ سکتا تھا۔ اجالے میں ان کا روپوش ہوجانا یقینی تھا لیکن رات بہت باقی تھی۔ کم سے کم آٹھ دس گھنٹے اس درخت پر ٹنگے رہنا مشکل اور صبر آزما کام تھا۔

بھوک پیاس کوئی آزمائش نہ تھی۔ نیند کے آنے کا سوال ہی نہ تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ یہاں اس پوزیشن میں ایک گھنٹے بعد ہی میرا اسٹیمنا ختم ہوجائے گا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اے خدا انور کو خیر و عافیت کے ساتھ اپنی پناہ میں رکھنا اور اسے اتنی عقل دینا کہ وہ مجھے تلاش کرنے کی احمقانہ جرأت نہ کرے۔ اسے بھی صبح کا اجالا پھیلنے تک جنگل میں گم رہنا چاہیے۔ شواہد یہ کہتے تھے کہ قاتل مسلح ضرور تھے مگر ان کے پاس ٹارچ جیسی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ وہ روشنی ڈال کے جنگل میں دور دور تک ہمارا سایہ تلاش کرتے اور درختوں کو بھی دور سے کھنگال لیتے۔ زیادہ امکان یہ تھا کہ وہ لوٹ گئے یا فرار ہوگئے۔

تمام خدشات، امکانات اور سوالات کے پس منظر میں ایک سوال پوری شدت سے نمایاں تھا کہ آخر یہ قاتلانہ حملہ کس کے ایما پر ہوا اور کس نے کیا؟ اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔ خدا کا شکر گزار میں اس بات پر تھا کہ اس نے ہمیں نادیدہ دشمن کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھا۔ جسم پر چڑھنے والے کیڑے مکوڑوں کو جھٹکنے کے لیے مجھے بار بار ایک ہاتھ کو استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں ہوا سے ہلتی شاخ کو تھامنے پر مجبور تھا ورنہ توازن بگڑتا تو میں پندرہ فٹ نیچے گرتا۔ درختوں میں ہر رات سکون سے پناہ لینے والے پرندے ایک انسان کی دخل اندازی پر ناراضی کا اظہار شور مچا کے کر رہے تھے کہ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ جنگل میں ہوا کے ساتھ اس کا شور مزید بھیانک ہوگیا۔

سوائے استقامت سے اپنی جگہ بیٹھے رہنے اور صبر کرنے کے میں کیا کرسکتا تھا۔ درخت کی پناہ میں بھی بارش مجھ پر برس رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں میرے سارے کپڑے پانی میں شرابور ہوگئے۔ میں دل کو مضبوط کرتا رہا کہ انہی صبر آزما حالات میں مجھے ایک پوری رات گزارنی ہے۔

ایک وقت ایسا آیا جب میرے لیے گول تنے کو گھوڑا بنا کے بیٹھنا بھی اتنا ہی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہوگیا جتنا پیر اوپر اٹھا کے بیٹھنا۔ بارش کی شدت میں کچھ کمی آئی تو میں نے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں ایک ذرکی بات بھی تھی کہ کہیں کوئی بل سے نکل آنے والا سانپ مجھے نہ ڈس لے۔ اندھیرے میں نظر کچھ آتا تھا تو آسمان پر چمکتی بجلیوں کی روشنی میں... نیچے اتر کے میں نے تنے کے گرد گھوم کے وہ جگہ دیکھی جہاں پانی کی بوچھار کچھ کم تھی۔ تنے سے ٹیک لگا کے میں کچھ دیر کھڑا رہا پھر کھڑے کھڑے تھک گیا تو وہیں بیٹھ گیا۔ بارش رفتہ رفتہ ختم ہوگئی اور بجلیوں کے جلوے بھی کم ہوگئے۔

میں نے اندازے سے کسی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ معلوم نہیں میں کدھر سے آیا تھا اور انور کس طرف بھاگا تھا۔ سڑک کہاں تھی اور گاڑی کا خستہ و خراب شکستہ ڈھانچا کہاں کھڑا تھا۔

دور کہیں گیدڑ چلا رہے تھے۔ کئی بار مجھے سرسراہٹ سے ایسا لگا جیسے کوئی جانور جھاڑیوں میں سے نکلا ہو۔ ایک بار مجھے اس کا متحرک سایہ بھی دکھائی دیا۔ میں نے سنا تھا کہ رات کو بھیڑیے بھی نکل آتے ہیں اور وہ بھوکے ہوں تو ہوا کے ساتھ انہیں انسان کی بو محسوس ہوجاتی ہے۔ وہ اکیلے بھی نہیں ہوتے... غول کی صورت میں پھرتے ہیں۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں واپس درخت کے دوشاخے پر مورچا سنبھالے رہوں۔ میں نے اوپر دیکھا تو تاریک آسمان پر کہیں کہیں ستارے روشن ہو رہے تھے۔ بادل جس تیزی سے محیط ہوئے تھے، اب اسی تیزی سے منتشر ہو رہے تھے۔ آسمان کچھ دیر میں بالکل صاف ہوگیا اور میں نے برسوں بعد قطبی تارے کو بھی تلاش کرلیا۔ اب سڑک کی سمت معلوم کرنا میرے لیے ناممکن نہیں رہا۔ اس بات کا امکان ختم ہوگیا تھا کہ میں مخالف سمت میں چلا جاؤں۔ ہمت کر کے میں نے اندھیرے میں قدم آگے بڑھائے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سوچا کہ لاہور سے روانگی کے بعد ملتان کی طرف آتے ہوئے ہم نے کون سی سمت میں سفر کیا تھا۔ اب میں اسی اندازے کی بنیاد پر چل رہا تھا۔ صرف دو گھنٹے میں میری آنکھو
اور تاروں

تھی۔ اس کے باوجود میں رک رک کر قدم بڑھا رہا تھا۔ ایسی ہی احتیاط نے شاید میری جان بھی بچالی۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے پر حرکت دیکھی اور ایک نظر میں اسے گلہری یا گرگٹ جیسا کوئی جانور سمجھا مگر حرکت آہستہ اور مسلسل تھی۔ میں رک گیا۔ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ شاید بہت کم اتنے زہریلے کہ ان کا کاٹا پانی نہ مانگے لیکن سانپ کی دہشت اپنی جگہ ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ یقیناً خاصا موٹا اور لمبا سانپ تھا جس نے میرے راستے کو کاٹا۔ اسے گزرنے میں دس سیکنڈ تو ضرور لگے ہوں گے۔ حرکت اور رفتار سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ چھ سے آٹھ فٹ لمبا ہوگا۔ میں اس کی گزرگاہ سے چار قدم کی مسافت پر تھا۔ وہ دس سیکنڈ بعد گزرتا یا میں... ایک ہی وقت میں ہمارا ٹکراؤ ہوتا۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ جانور سے خطرناک کوئی جانور نہیں۔ کیا سانپ اور نیولا... کیا گیدڑ اور شیر... حضرتِ انسان کے سائے سے بھی سب بچتے ہیں لیکن کہیں آمنا سامنا ہوجائے اور خطرہ جانور کو محسوس ہو یا درندہ بھوک سے مجبور ہو تو پھر آدمی ہی مارا جاتا ہے۔

جب مجھے پورا یقین ہوگیا کہ سانپ گزر کے دوسری طرف کافی دور جاچکا ہے تو میں نے آگے قدم بڑھائے۔ ایک جگہ راستہ یوں بند ہوا کہ چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور مجھے ان کے درمیان سے گزرنا تھا۔ میں بیچ سے نکلا تو ایک دم میرے اعصاب پر بجلی سی گری۔ میں صدمے سے سن اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ میرے سامنے چند فٹ کی جگہ صاف اور ہموار تھی۔ تقریباً ایک والی بال کے گراؤنڈ جتنی... اور اس کے وسط میں کوئی انسان لیٹا ہوا تھا۔ وہ الٹا پڑا تھا اور اس کے ہاتھ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ تاریکی میں بھی اس کی شناخت کے لیے چہرہ دیکھنا ضروری نہیں تھا اور نہ یہ سمجھنا کہ وہ محض ایک لاش ہے۔ یہ انور علی کا ڈرائیور تھا جس کے گولی کا نشانہ بننے کی پُردرد آواز میرے کانوں نے بھی سنی تھی۔ اس جانثار نے ہمیں قاتلوں کی یلغار سے بحفاظت نکال لیا تھا۔ انہیں ہم سے دور رکھنے کے لیے اس نے حملہ آوروں کو نشانہ بنایا تھا مگر وہ اکیلا تھا۔ ان کے جوابی فائر سے وہ خود مارا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ کر میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں نہ زخم کا پتا چلتا تھا اور نہ زخم سے بہنے کے اکڑ چکا
دیکھنا ایک

بے مقصد حرکت ہوتی۔ کچھ دیر یونہی سرنگوں بیٹھنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ میں اس جگہ سے دور نہیں جہاں گاڑی درخت سے ٹکرا کے رکی تھی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک طرف قدم بڑھائے۔ رک کے واپس آیا اور ڈرائیور کی جیب میں دیکھا۔ کسی جیب میں ریوالور نہیں تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں یا ہاتھ کے نزدیک بھی نہیں تھا۔ جھک کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ہر طرف دیکھنے پر بھی مجھے ریوالور کہیں قریب نظر نہ آیا تو میں نے بڑے تذبذب کے ساتھ اس کی لاش کو تھوڑا سا ہلا کے ایک ہاتھ نیچے ڈالا... ریوالور اس کے نیچے دبا ہوا تھا جو ایک دم میرے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے بے جان بدن نے ریوالور کو بارش میں بھیگنے سے بچالیا تھا... یہ استعمال کے قابل تھا۔

تھینک یو فرینڈ... میں نے دل ہی دل میں کہا اور اب زیادہ اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا۔ سراغ کوئی نہ تھا۔ بس میں اندازے سے چلتا گیا۔ تھوڑا سا دائیں طرف... پھر تھوڑا سا مخالف سمت میں... جہاں بھی مجھے راستہ کچھ صاف ملا۔ پھر یکبارگی اچانک اسی طرح میرے سامنے آگئی جیسے ڈرائیور کی لاش آئی تھی۔ وہ ایک درخت میں گھسی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر دم سادھے کھڑا رہا۔ پھر میں نے نیچے سے ایک خاصا بڑا پتھر اٹھایا اور دوسرے درخت کی اوٹ سے گاڑی پر اچھال دیا۔ پتھر نے گاڑی کی فولادی چھت پر ایک دھماکا کیا۔ یہ آواز گرد و پیش میں سو گز دور دشمن کو بھی متوجہ کرسکتی تھی۔ جب دس منٹ تک جنگل کا سکوت برقرار رہا تو میں نے اللہ کا نام لے کر گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔

اس کا سامنے کا حصہ تصادم سے تباہ ہوگیا۔ ونڈ اسکرین نکل گئی تھی۔ گرل ٹوٹ گئی تھی لیکن درمیان سے ٹکر کی وجہ سے ایک طرف کی ہیڈ لائٹ سلامت تھی۔ میں نے ڈرائیور کی سائڈ سے کھڑکی میں جھانکا اور اندر ہاتھ ڈال کے ہیڈ لائٹ کا سوئچ آن کردیا۔

تاریک جنگل میں ایک دم روشنی بکھر گئی۔ ہیڈ لائٹس کے سامنے جہاں تک رکاوٹ نہیں تھی، روشنی کی ایک راہ گزر سی بن گئی۔ دس پندرہ گز کے بعد درختوں اور جھاڑیوں کے حائل ہونے تک اس اجالے نے رینگنے والی مخلوق سے اڑنے والے کیڑے مکوڑوں تک کی حرکت واضح کردی۔ منعکس ہونے والی روشنی نے بھی دائیں بائیں اور اوپر تک جنگل کا پورا منظر نمایاں کردیا۔ اوپر والے درخت کے پیچھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

مضطرب ہو کے احتجاجی انداز میں بولے اور ایک دو نے فضا میں چکر بھی لگایا۔ یہ ان کی پُرسکون راتوں میں الو کی مداخلت تھی۔ میں نے لائٹ کو چند سیکنڈ بعد آف کر دیا اور خود ایک درخت کی اوٹ میں روپوش ہو گیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ روشنی انور علی کے علاوہ میرے دشمنوں کو بھی متوجہ کر لے جو میری طرح دم سادھے بیٹھے ہوں کہ آخر کب تک میں اپنی پناہ گاہ سے نہیں نکلتا۔

پورے دس منٹ میں نے بڑے ضبط کے ساتھ گزارے اور پھر باہر آ کے لائٹ کو دوسری بار آن کیا۔ ایسا میں نے بار بار کیا۔ لائٹ آن اور پھر آف کرنے سے تاریک جنگل کا ایک حصہ بار بار روشن ہوتا تھا۔ بہت دور سے بھی اس سگنل کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر انور کی نظر ایک بار ادھر نہ اٹھی تو دوسری بار اسے افق کے بار بار روشن ہونے سے اندازہ ہو جانا چاہیے کہ یہاں ایسی روشنی صرف اس کی گاڑی پھیلا سکتی تھی۔ گاڑی کے دونوں دروازے تصادم کی قوت سے پچکس گئے تھے۔ انجن کے بعد اس کے ڈرائیونگ کیبن کے قریم کو بھی نقصان پہنچا تھا اور گاڑی تقریباً تباہ ہو گئی تھی۔

ایک کھڑکی کا شیشہ غائب تھا۔ وہ غالباً جھٹکے سے پورا ہی نکل گیا تھا۔ اس میں سے خود کو اندر پہنچا کے میں نے ڈیش بورڈ کے خانوں کی تلاشی لی۔ مجھے اس میں سے ایک ٹارچ ملی۔ دوبارہ باہر آنے سے پہلے میں نے گاڑی کا ہارن بجایا۔ ایک بار... پھر دوسری بار زیادہ دیر تک اور تیسری بار... پھر میں نے مزید دس منٹ ایک درخت کے پیچھے انتظار میں گزارے۔

میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ تیسری بار میں درخت کے پیچھے ہی تھا کہ میں نے اندھیرے میں کوئی حرکت سی دیکھی۔ میں نے باہر نکل کے غور کیا تو وہ کوئی انسانی ہیولا تھا جو ایک جھلک دکھا کے غائب ہو گیا۔ دوسری بار وہ چند سیکنڈ کے وقفے سے نظر آیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ انور کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ حملہ آور ایسی احتیاط کا مظاہرہ نہ کرتے۔ وہ دور سے ہی مجھے نشانہ بنانے کے لیے فائر کھول دیتے۔ وہ یقیناً فرار ہو چکے تھے اور یہ انور تھا جو میرے لائٹ سگنل یا گاڑی کا... ہارن سن کے اس طرف آ رہا تھا۔ میں درختوں کی اوٹ میں آگے بڑھا۔ تقریباً چالیس پچاس گز کے فاصلے سے میں نے انور کو پہچان لیا۔ میں احتیاط کو بالائے طاق رکھ کے دوڑا۔

''انور...'' میں نے چلا کے کہا اور انور چونک کے میری طرف دوڑا۔ ہم ایسے بغل گیر ہوئے جیسے برسوں بعد ملے ہوں۔

''تو نے دیکھ لیا تھا میرا لائٹ سگنل...؟'' میں نے خوشی سے کہا۔

''ہاں... ہارن کی آواز بھی سنی تھی۔'' وہ بولا... ''تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں... اور تُو؟'' میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا۔

''تو زخمی ہے۔'' انور نے کہا۔

''یہ خراشیں ہیں... خدا کا شکر ہے کہ تجھے بھی کچھ نہیں ہوا... کہاں تھا تو؟''

''درخت پر چڑھا بیٹھا تھا۔ چیونٹے کاٹتے رہے پہلے اور پھر میں تھک گیا تو نیچے اترا۔''

میں ہنسا۔ ''یہی میرے ساتھ ہوا... اچھا اب چل... یہ بتا جانا کدھر ہے... تجھے اندازہ ہے راستے کا؟''

''ہاں... بہت اچھی طرح۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کے چلنے لگا۔ اب ہم ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھ سکتے تھے۔

''یار! وہ تیرا ڈرائیور... وہ مارا گیا۔''

''تجھے کیسے پتا چلا... فائر کی اور اس کی چیخ کی آواز تو سنی تھی میں نے بھی۔''

''میں نے اس کی لاش دیکھی ہے ابھی...'' میں نے دکھی دل سے کہا۔

وہ رک گیا۔ ''اچھا... کہاں دیکھی ہے؟''

میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''ادھر پیچھے... سو گز دور۔'' اور پھر ریوالور نکالا۔ ''یہ اس کے نیچے دبا ہوا تھا اس لیے پانی سے خراب نہیں ہوا۔''

''اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اس نے جوابی فائر کیا تھا۔ یہ نہ کرتا تو شاید نشانہ بننے سے بچ جاتا۔''

''کوئی حملہ آور بھی تو نشانہ بنا ہوگا؟''

''واپس آ کے دیکھیں گے... چل۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولا۔

''یار! اس جاں نثار ڈرائیور کی لاش کو چانور تو نقصان نہیں پہنچائیں گے؟''

''جنگل میں گیدڑ اور بھیڑیے تو ہیں... لیکن مجھے آس پاس سے ان کی آواز سنائی نہیں دی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ خون کی بو پر آ سکتے ہیں۔''

''نہیں...

بھوک مٹا کے والپر

پھیل جائے گا۔ ہم جا کے جلد از جلد واپس آتے ہیں۔''

''تجھے یہ جگہ یاد رہے گی؟''

''یار! میرا سارا بچپن اور لڑکپن اسی علاقے میں شکار کرتے گزرا ہے۔ ہرن وغیرہ تو ہیں نہیں... خرگوش بہت سارے میں نے اور پرندے۔''

''انور! یہ حملہ کرنے والے کون تھے؟''

''معلوم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ہمارے دشمن تھے۔ دشمن کون ہو سکتے ہیں، یہ تو بھی جانتا ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

ہماری پیش قدمی کی رفتار اب خاصی تیز تھی۔ صرف آدھے گھنٹے بعد ہم سڑک پر تھے۔ اس ذیلی سڑک پر اس وقت کسی قسم کا ٹریفک نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں کس حد تک زخمی ہوں۔ گہری خراشیں میرے ہاتھوں پر ہی نہیں، چہرے اور گردن پر بھی تھیں جن سے بہنے والا خون اب جم گیا تھا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ابھی اس کا اثر میری جسمانی صلاحیت پر نہیں پڑا تھا۔ میں بھوک، پیاس اور بے آرامی کے باوجود تھکن یا گم ہمتی کا شکار نہیں تھا۔ یہی کیفیت انور کی تھی۔ ہم زندہ تھے اور اپنے پیروں پر چل سکتے تھے۔ یہ احساس ہمیں قوت دے رہا تھا۔

سڑک پر ہماری رفتار بڑھ گئی۔ صرف ایک گھنٹے بعد ہم نے حویلی کو دیکھا۔ اس کے دروازے پر کرسی رکھ کے سونے والا گارڈ انور کے ہلانے سے ہڑبڑا کے اٹھا اور اس نے بوکھلاہٹ میں اپنی رائفل اٹھا کے انور کو سیلیوٹ کیا۔

''وہ سر! ذرا میری طبیعت خراب تھی۔''

انور نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ ''چلو دروازہ کھولو۔''

اس نے بڑی مستعدی سے دروازے کا قفل کھولا۔ یوں ڈیوٹی پر غفلت کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر وہ کتنا پریشان ہوگا، اس کا مجھے اندازہ تھا۔ شاید اسے اب بھی ڈر ہوگا کہ اس کو سزا ضرور ملے گی۔ مگر انور نے وہی کیا تھا جو میں کرتا۔ انسان کوئی مشین نہیں ہوتا اور خراب تو مشین بھی ہو جاتی ہے۔ اس بار معافی مل گئی تو دوبارہ وہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ میں اور انور اندر پہنچے تو سب معمول کے مطابق تھا۔ کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم لوٹ کر کیسے آئے اور آنے سے پہلے ہم پر کیا گزری۔ سب نے یہ آسانی فرض کر لیا ہوگا کہ ہم لاہور میں ہی کسی ہوٹل میں

ہے تھے۔

ایک برآمدے میں دوسرا کمرا میرا تھا اور آخری انور کا... دوسرے میں پہلا خالی تھا۔ دوسرا کمرا اکبر اور تیسرا اسی کی بیوی کی تحویل میں تھا۔ تیسری طرف بڑے چودھری صاحب کا بیڈ روم تھا اور ان کا مہمان خانہ... اپنے کمرے میں جا کے انور نے باہر اٹین شین ہو جانے والے گارڈ کو اشارے سے اندر بلایا۔ ''جاؤ چاچا چاگل کو جگاؤ۔''

''جی جناب عالی...'' گارڈ نے پُرتشویش نظر سے انور کو دیکھا مگر اس کا موڈ دیکھ کر کوئی سوال کرنے سے گریز کیا۔

''میرا خیال ہے تو ابھی یہیں رک... واش روم میں جا کے خود کو صاف کر لے۔'' انور نے کہا۔

میں کرسی پر بیٹھ کے اپنی توانائی بحال کر رہا تھا۔ ''اس کی جلدی نہیں... پہلے تو کچھ کھانے پینے کے لیے منگوا۔''

''ابھی چاچا گل سے کہتا ہوں۔ وہ سب سنبھال لے گا۔'' انور نے کہا۔ ''اس وقت میں کسی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔''

چاچا گل خاصی تشویش کے ساتھ نمودار ہوا۔ ''خیریت ہے جناب عالی... یہ کیا ہوا؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے کچن میں کسی سے کہو کہ ہمارے لیے کافی لائے... ابلے ہوئے انڈے... اس کے بعد باقی کس پک اپ نکلواؤ... دیکھو کون ڈرائیور تمہارے ساتھ جائے گا۔ ایک دو بندے اور لے جاؤ اپنے ساتھ... اور دیکھو... ابھی کسی کو کچھ بھی نہیں بتانا ہے۔''

''جانا کہاں ہے جناب؟''

انور نے اسے وضاحت سے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں سے چاچا گل کو ڈرائیور کی لاش اٹھانی تھی۔ ''سب کے پاس ٹارچ ہونی چاہیے۔ تھوڑا سا تلاش کرو گے تو وہاں پہنچ جاؤ گے۔ اس کی لاش اٹھوا کے لاؤ اور صبح ہوتے ہی کفن دفن کا انتظام کرو۔ ابھی کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

آدھے گھنٹے بعد میں گرم پانی سے غسل کر کے اپنے زخم ڈیٹول سے صاف کر چکا تھا اور کپڑے بدل چکا تھا۔ میں نے اپنے بیڈ روم کا واش روم استعمال کیا تھا۔ اتنی دیر میں انور بھی صاف ستھرا ہو چکا تھا۔ ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کافی پی۔ ابلے ہوئے انڈوں کے علاوہ بھی کچن سے بہت کچھ آ گیا تھا۔ ہم نے درد کا احساس مٹانے والی گولیاں بھی کھائیں۔ اس وقت تک صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ فوری طور پر مجھے نیند کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی اور یہ وقت سونے کا تھا بھی نہیں۔ انور کچھ دیر کے لیے بیڈ پر دراز ہوا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور میں صوفے پر لیٹا رہا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کچھ دیر پہلے تک ہم پر گزر جانے والی رات کے واقعات کا اثر نہیں تھا لیکن اب اس وقت کا ہر لمحہ جیسے پھر زندہ ہو گیا تھا۔ شاید انور بھی وہی سوچ رہا تھا جو میں... اور یہ فطری ردِعمل تھا۔ زندگی کی مہلت ابھی تمام نہیں ہوئی تھی چنانچہ خدا نے ہمیں محفوظ رکھا۔ مارے جانے والے سے بچانے والا ہاتھ یقیناً زیادہ بڑا اور طاقتور ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ خیال جاتا نہ تھا کہ سازش کامیاب ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ انور بھی کسی سوچ میں گم تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''یار! میں چاہتا ہوں کہ ابھی اصل بات کسی کو معلوم نہ ہو۔''

''تو نے گل چاچا سے بھی یہی کہا تھا لیکن لاش اٹھانے والے جو اس کے ساتھ گئے ہیں؟''

''جب گل چاچا کو بتا دیا ہے میں نے... تو وہ ایسا ہی کرے گا۔ ابھی لاش لانے کے بعد میں اسے مزید بتا دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''او کے... ہماری اسٹوری کیا ہو گی؟''

وہ سوچ کے بولا۔ ''ہم شہر سے آ رہے تھے... مراداں والی کی طرف آنے والی سڑک پر کچھ لوگوں نے ہماری گاڑی روکنے کے لیے فائر کیے... انہوں نے ہمیں اتار دیا اور ڈرائیور کو ساتھ لے گئے۔''

''وہ ڈاکو نہیں تھے؟''

''ظاہر ہے... ورنہ ہمیں لوٹتے... ہمارے دشمن ہوتے تو ہمیں بھی لے جاتے یا مار دیتے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ڈرائیور کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھا؟''

''ہاں... وہ یہاں تین سال سے تھا اور یہاں کا رہنے والا نہیں تھا۔''

''اور دنیا میں اکیلا تھا... اس کا کوئی خاندان نہیں تھا؟''

''ہمیں علم نہیں... وہ کسی کے حوالے سے آیا تھا۔ کبھی کبھی چھٹی لے کر جاتا تھا۔''

''کہاں جاتا تھا؟ میں یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ پولیس تفتیش کی رسمی کارروائی ضرور کرے گی۔''

''اسی لیے میں تجھے بتا رہا ہوں... ممکن ہے اکبر کو یا ابا جی کو اس کے بیک گراؤنڈ کا علم ہو۔ انہیں کچھ بتانا ہو گا تو وہ بتا دیں گے۔ ہم اپنی بات کو اسی واقعے تک محدود رکھیں گے کہ یہ واقعہ کس وقت اور کہاں پیش آیا؟''

''ہم اتنی رات گئے کیوں واپس آ رہے تھے؟''

''ہم وقت پر پہنچ جاتے۔ میرا مطلب ہے رات کو لاہور سے کھانا کھا کے چلتے تو زیادہ سے زیادہ بارہ بجے یہاں ہوتے لیکن لاہور سے باہر آئے تو گاڑی میں کچھ خرابی ہوئی۔ ڈرائیور نہ جانے کہاں سے مکینک کو لایا۔ دیر اسی لیے ہوئی۔ ڈرائیور کے وہ دشمن جانتے تھے کہ وہ واپس آئے گا تو اسی راستے سے گزرے گا۔ وہ انتظار کرتے رہے۔''

''اور یہ واقعہ کب پیش آیا؟''

''رات ڈھائی بجے کے بعد... پھر ہم پیدل واپس آئے۔''

''اور یہ خراشیں... جو ہم دونوں کو آئی ہیں؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''اسٹوری میں ترمیم کر لیتے ہیں۔ وہ ہمیں بھی لے گئے تھے مگر جنگل میں ایک جگہ انہوں نے ہمیں اتار دیا۔ پھر بارش ہوئی۔ گاڑی کو وہ ڈرائیور سمیت آگے کہاں لے گئے، ہمیں نہیں معلوم... ہم بارش رکنے کے بعد آئے تو یہ خراشیں آئیں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔ تو جاننا ہے کہ کہانی میں سے سازش کا عنصر نکال دیا جائے۔ ہم یہ نہ کہیں کہ قاتلانہ حملہ ہم پر کیا گیا تھا؟''

''ہاں، میرا یہی مقصد ہے۔ اس واردات کے پیچھے جو بھی تھا... اسے شک نہ ہو۔''

''شک تو ہمارے جھوٹ سے ہو جائے گا۔''

وہ بولا۔ ''ہاں... لیکن وہ سمجھے گا کہ ہم ڈر گئے... یا ہم اس واقعے کی تشہیر نہیں چاہتے۔ اسے یہی پریشانی ہو گی کہ آخر ہم نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا تجسس اسے مجبور کرے گا کہ جھوٹ کی وجہ جانے۔''

میں نے کہا۔ ''جیسی تیری مرضی یار... لیکن کیا تجھے کسی پر شک ہے؟''

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ ''اس کا نام لینا ضروری ہے دوست؟''

''نہیں... ثبوت کوئی نہیں تو نام لینے سے فائدہ؟''

''رائٹ... ثبوت مل جائے گا۔ آج نہ سہی کل... لیکن اب میں بھی چوکس ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔''

انور علی کی رائے سے اختلاف کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس موضوع پر مزید بات کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔ گل چاچا اندر آ

انور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کہاں رکھی ہے؟''

''مہمان خانے میں۔'' وہ کچھ اداس تھا۔

''تم جانتے ہو نا ہماری گاڑیوں کی سروس اور دیکھ بھال کہاں ہوتی ہے۔ انہیں فون کر کے بتا دو کہ گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے اور وہ کہاں موجود ہے... اسے اٹھوا لیں... میں شہر جاؤں گا تو ان سے بات کر لوں گا۔ ڈرائیور کب سے ہمارے پاس تھا؟''

''تین سال سے زیادہ ہو گئے جناب۔''

''کہاں کا رہنے والا تھا؟ کس کے حوالے سے آیا تھا... اس کا کوئی والی وارث ہے؟''

''سوات یا گلگت کا رہنے والا تھا۔ بڑے چودھری صاحب کے پاس آیا تھا۔ انہیں ملا تھا کہیں... سال میں ایک دو بار چھٹی لے کر جاتا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ کہاں... سنا ہے قبائلی علاقے سے بھاگا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی نکال لایا تھا۔ اس کے قبیلے والے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کافی عرصہ دونوں چھپ کر رہے اور ادھر ادھر پھرتے رہے... پھر قبیلے والوں کو پتا چل گیا۔ انہوں نے دونوں کو قتل کرنے کے لیے گھیر لیا تھا مگر یہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اپنی بیوی کے قاتل سے بدلہ لینے کے چکر میں تھا اور وہ اسے مارنے کے چکر میں... اس نے اپنا نام بھی بدل رکھا تھا۔''

''تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ یہ اس نے خود بتایا تھا تمہیں؟''

''جی جناب... آدمی بالکل اکیلا کیسے رہ سکتا ہے۔ کوئی تو ہونا چاہیے جس سے کبھی دل کی بات کہے... پہلے نہیں بتاتا تھا مگر بعد میں مجھ پر بھروسا کرنے لگا تھا۔''

''اور کون لوگ تھے خاندان میں؟''

''سب تھے جنابِ عالی... باپ تھا... بھائی بہن تھے۔'' گل چاچا نے آہ بھری۔

''کمائی کا کیا کرتا تھا؟''

اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔ ''کچھ نہیں... میرے پاس رکھوا دیتا تھا۔ میں نے کئی بار سمجھایا کہ چلو اب بہت سوگ منا لیا... شادی کر لو یہاں۔ اپنا گھر بناؤ... میری بات سنتا تھا، شاید مان بھی جاتا۔'' چاچا گل نے آنکھوں میں آنے والے آنسو صاف کیے۔

''سب قسمت کے کھیل ہیں چاچا... اب اس کی رقم کا کیا کرو گے؟''

''اس نے کہا تھا کہ اگر میرے دشمنوں نے مجھے تلاش [illegible] بھی بدلہ لینا نہیں بھولتے۔ اگر ایسا ہو تو میری لاش میرے خاندان والوں تک پہنچانے کی کوشش کرنا اور یہ ساری کمائی میری ماں کو دے دینا۔''

چاچا گل کی بات نے مجھے بھی اداس کر دیا تھا۔ ایک سادہ صفحہ نظر آنے والوں کی زندگی بھی کیسی داستان ہو سکتی ہے۔ کبھی گل رنگ تو کبھی لہو رنگ... میں نے کہا۔ ''تمہیں اس کی فیملی کا پتا معلوم ہے؟''

''جی سر... اس نے خود ہی دیا تھا۔'' چاچا گل نے کہا۔

''ٹھیک ہے... پھر تم خود ہی یہ ذمے داری پوری کرو۔ یہاں پولیس کی رسمی کارروائی پوری ہو جائے تو میت لے جاؤ۔'' انور علی نے کہا۔

''جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے... پولیس کو بھی بتا دینا۔'' میں نے کہا۔

''بتا دوں گا سر... اب چھپانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا انہیں جو اسے قتل کرنے آئے تھے؟''

انور نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اسی لیے انہوں نے ہمیں اتار دیا تھا، جنگل میں لے جا کے... ہم ان کے چہرے نہیں دیکھ سکے تھے۔''

چاچا گل چلا گیا تو انور نے کہا۔ ''ہم جو کہانی بنا رہے تھے، وہ حقیقت تھی۔''

''چلو جھوٹ سے بچ گئے لیکن اب مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ دنیا میں کتنے دکھی دل والے اپنے زخم چھپائے پھر رہے ہیں۔''

اب صبح کا اجالا بہت پھیل گیا تھا۔ معمول کے مطابق بڑے چودھری صاحب کا ناشتا ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تو وہ تھم دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کی شخصیت میں روشنا ہونے والی تبدیلی نے مجھے حیران کر دیا۔ ایسا اچانک ہوا تھا یا پہلے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے جو لڑکی تھی، وہ کسی طرح بھی دیہاتی نہیں تھی۔ اس کا لباس بیش قیمت ہی نہیں، جدید ترین وضع کا بھی تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ لباس اس پر حسین لگ رہا تھا یا لباس نے اسے اتنا حسین بنا دیا تھا۔ ریشم کا روپ بھی نکھر آیا تھا اور محسوس نہ ہونے کے باوجود اس نے بڑے سلیقے سے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔

ہم دونوں کو دم بخود اور پلک جھپکائے بغیر اپنی طرف دیکھتا پا کے ریشم کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ خوش بھی ہوئی تو یہ ایک فطری بات تھی۔ یہی وہ چاہتی ہو گی۔ اس نے کہا۔ ''کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگیا ہے تم دونوں کو... میں ریشم ہوں۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں... ریشم کو جانتے ہیں ہم۔"
"تم اس کا رنگین ڈی لکس ایڈیشن ہو... یہ انقلاب کیا ہے...؟" انور نے کہا۔
وہ شرما کے بولی۔ "سلونی نے سب کیا ہے۔"
انور نے کہا۔ "اسے میں پرائڈ آف پرفارمنس دے سکتا ہوں۔"
ریشم ہنسی۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"
"اعلیٰ کارکردگی کا انعام... اس نے تو کمال کردیا۔" انور بولا۔
میں نے کہا۔ "دوست! تمہارا مطلب ہے ریشم خود کچھ نہیں تھی... اب ہیرا نظر آرہی ہے تو پہلے کوئلہ تھی؟"
"دیکھو، یہ تمہیں مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش کررہا ہے... سونا تو سونا ہوتا ہے... زرگر اسے زیور بناتا ہے۔"
ریشم کھلکھلا کے ہنسی۔ "چلو اب بہت ہوگیا۔ تم لوگ رات کو کہیں سے پٹ کر آئے ہو... یہ کیا ہوا ہے؟"
ایک دم مجھے بھی یاد آیا کہ ڈرائیور کی میت گیسٹ ہاؤس میں رکھی ہے اور ہم کیسی باتیں کررہے ہیں۔ شاید یہ خودغرضی اور بے حسی تھی کہ ہم ایک فرض شناس نمک خوار کی موت کو اتنی غیر سنجیدگی سے لے رہے تھے۔ وہ اس گھر کا فرد ہوتا تو ہمارا دکھ کتنا زیادہ ہوتا۔ پھر ہم ایسی باتیں نہ کرتے۔ شاید خود انور کو بھی اسی احساس نے شرمندہ کردیا۔ ہم دونوں ہی ایک دم افسردہ اور شرمسار ہوگئے۔
انور نے کہا۔ "رات ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔"
میں نے کہا۔ "اور اس میں ڈرائیور مارا گیا۔ ہم نے بہتر سمجھا کہ بڑے چودھری صاحب کو فوراً نہ بتائیں۔ وہ ناشتا کرلیں تو بتادیں گے... وہ دل کے مریض ہیں۔"
ریشم کا چہرہ بھی اداس ہوگیا۔ "چلو پھر ناشتا کرلیں ہم بھی... آج بھابی ہمارے ساتھ ناشتا کریں گی... وہ انتظار کررہی ہیں۔"
"ان کو بھی بعد میں بتائیں گے پوری تفصیل۔" انور نے کہا۔
ناشتے کی میز پر چھوٹی چودھرائن کا موجود ہونا ایک حوصلہ افزا تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ شاید خود اس نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ انور علی کا حالات پر مکمل کنٹرول ہے اور اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں کہ اس کے شوہر کا دورِ حکومت واپس آسکے۔ صورتِ حال پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کے لیے اسے کافی وقت مل گیا تھا۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں آدھا عملاً دن رات قید تھی اور یقیناً بہت دکھی بھی ہوگی کہ زندگی کی گاڑی جو ایسی سبک رفتاری سے جاہ وجلال اور عیش وعشرت کی شاہراہ پر رواں دواں تھی، اچانک ایک حادثے میں الٹ گئی تھی اور وہ سب جسے اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کا حصہ اور حق تسلیم کرلیا تھا، ماضی کی ایک تکلیف دہ یاد کے سوا کچھ نہیں رہا... وہ ایک بچے کی ماں بھی بننے والی تھی اور اپنی زندگی کے لیے حالات کو قابلِ قبول حد تک بہتر بنانے کے لیے صرف اس کا رونا دھونا کافی نہیں ہوگا۔ اس کا شوہر ایک قیدی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتا تو اپنی فیملی کے لیے کیا کرے گا۔ یہ ذمے داری اب تمام تر اس کے کندھوں پر آگئی تھی۔ اس کے لیے حالات سے لڑنا ناممکن تھا۔ ان حالات سے سمجھوتا کرکے اور مصالحت اور مفاہمت سے کام لے کر وہ کوشش ضرور کرسکتی تھی کہ اپنے شوہر کے لیے زندگی کی ضمانت کے ساتھ آسانی حاصل کرسکے۔
انور نے بھابی کو ناشتے کی میز پر دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور اسے عزت بھی دی۔ "مجھے بہت اچھا لگا آپ کا ساتھ ہونا... خواہش تو میری تھی کہ ہم سب اباجی سمیت ایک فیملی کی طرح بیٹھتے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"اگر تم چاہو گے بھائی جی تو یہ بھی ہوجائے گا۔" وہ بولی۔ "کبھی نہ کبھی۔"
انور نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف خواہش کرسکتا ہوں... امید نہیں رکھ سکتا۔"
بھابی نے فوراً بات کا رخ پلٹ دیا۔ "تمہیں اندازہ نہیں کہ اباجی کی رائے تمہارے بارے میں بدل گئی ہے۔"
"اب تو بدلے گی... وقت جو بدل گیا ہے۔" انور نے کہا۔
"وہ کہہ رہے تھے کہ انور یہ سب کیسے کرے گا... کہ میرے علاج کا انتظام یہاں ہوجائے۔"
"میں نے ایسا کرلیا ہے لیکن... آج آپ بھی دیکھ لیں گی۔" انور نے کہا۔ "اور اباجی کو بھی یقین آجائے گا۔"
ریشم نے کہا۔ "آپ لوگ ناشتا بھی کریں... صرف باتیں نہیں۔"
بھابی نے سر ہلایا۔ "یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟"
"وہ ہم

"تم لوگ لاہور گئے تھے یا شکار کرنے؟" بھابی بولی۔
"شکار کرنے تو نہیں گئے تھے۔ خود شکار ہوگئے۔ ناشتا کریں پھر بتاؤں گا۔" انور نے کہا۔
شاید انور کے لہجے سے بھابی نے غلط اندازہ کیا کہ اس کی باتیں انور کو ناگوار گزری ہیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کے ناشتا کرتی رہی۔ ناشتا ختم کرتے ہی انور اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ اباجی کے کمرے میں آجائیں۔"
بڑے چودھری صاحب اپنے بستر پر دراز ٹی وی پر کوئی فلم لگا کے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور انور کو دیکھ کر انہوں نے ٹی وی بند کردیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے نہ بھابی نے لفٹ کرائی ہے اور نہ چودھری صاحب نے... انہوں نے تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دیا تھا۔
"رات دیر سے آیا تھا تو میرے سونے کے بعد...؟" انہوں نے پوچھا۔
"جی اباجی... کافی دیر ہوگئی تھی۔"
انور کی ماں نے کہا۔ "تیرے چہرے پر یہ خراشیں اور نیل کیسے ہیں پتر؟"
"کوئی خاص بات نہیں اماں جی... ایک اچھی خبر ہے اور ایک بُری۔"
چودھری صاحب نے کہا۔ "اچھی پہلے سنا۔"
"کل ہم دونوں نے سارا لاہور چھان مارا... اور وہ سب کرلیا جو آپ چاہتے تھے۔ آج سے علاج کی تمام سہولت آپ کے کمرے میں فراہم کرنے کا کام شروع ہوجائے گا۔ امید ہے اسی ہفتے میں سب کچھ لگ جائے گا۔ تمام مشینیں... انہیں چلانے کے لیے جنریٹر... ضروری دوائیں سب آجائے گا۔"
چودھری کے چہرے پر کچھ خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ "اچھا، میں تو سمجھ رہا تھا کہ مشکل ہوگا۔"
"کوشش سے مشکل بھی آسان ہوجاتی ہے اباجی... ایک ڈاکٹر سے بھی بات کرلی ہے۔ وہ یہیں رہے گا۔ ایک نرس بھی آجائے گی جو چوبیس گھنٹے آپ کی دیکھ بھال کرے گی۔"
چودھرائن نے دوپٹے کے پلّو سے اپنے آنسو صاف کیے۔ "اللہ جزا دے گا تجھے۔"
میں نے محسوس کیا کہ انور کے والدین کے رویّے میں واضح ندامت تھی مگر ان کا مرتبہ اور ان کی انا اس کے بر نہیں یقین تھا کہ بہت جلد وہ خود انور کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ظلم کا اعتراف بھی کرلیں گے۔
"چل اب بُری خبر بھی سنا دے۔" بڑے چودھری نے کہا۔
انور نے کہا۔ "وہ جو ہمارا ڈرائیور تھا، سوات کا... وہ کل مارا گیا... دشمنوں کے ہاتھوں۔"
چودھری صاحب نے سارا واقعہ توجہ سے سنا لیکن میں نے نوٹ کیا کہ انہیں اس پر زیادہ دکھ نہیں ہوا۔ ان کے لیے وہ عام ملازم ہی تھا۔
"اس کی لاش میں سوات بھجوا رہا ہوں۔" انور نے کہا۔
"اوئے پتر اس کی کیا ضرورت ہے... یہیں دفن کرادو۔" چودھری بولا۔
"دراصل مرنے سے پہلے اس نے درخواست کی تھی۔ پتا بھی بتادیا تھا... اور میں نے وعدہ کرلیا تھا۔" انور... بولا۔
آدھا دن ڈرائیور کی لاش کو کفن دینے کے بعد روانہ کرنے میں گزر گیا۔ میت گئی تو ماحول پر سوگوار فضا طاری رہی۔ دوپہر کے بعد گل چاچا ہماری حادثے میں تباہ حال گاڑی کو ورکشاپ پہنچانے چلا گیا۔ سہ پہر کے بعد میڈیکل کمپنی کا ایک ٹرک نمودار ہوا۔ اس میں دو ماہرین تھے اور دو مددگار جن میں ایک خود ٹرک ڈرائیور تھا۔ ماہرین میں ایک وہی تھا جس نے مجھے سکھر جیل کے ایک قیدی کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا۔ یہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس کا امکان موجود تھا کہ یہاں وہ زیادہ فراغت کے ساتھ مجھ سے بات کرے اور مجھے بتائے کہ ہو بہو میری شکل وصورت والا ایک سزائے موت کا قیدی اس نے سکھر جیل میں بھی دیکھا تھا۔ میں پھر اس کی پُرزور تردید کرسکتا تھا اور خود اس سے پوچھ سکتا تھا کہ آخر اس کا سکھر جیل میں جانے کا اتفاق کیسے ہوا تھا لیکن ہر صورت میں مجھے رسک لگتا تھا۔
ٹرک سے اتر کے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "کیسے ہیں آپ ملک سلیم صاحب؟"
میں نے کہا۔ "آپ نے کل اپنا تعارف تو کرادیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ وہاں آپ کرتے کیا ہیں؟"
"بس انسٹالیشن منیجر ہوں۔ تمام مشینیں اور آلات لگانا اور ان کی پاور سپلائی میرا کام ہے۔ یہ الیکٹریکل اور مکینیکل انجینئرنگ ہے۔"
"آپ کے پاس دونوں ڈگریاں ہیں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میں نے بی ایس سی کیا تھا مکینیکل انجینئرنگ میں... این ای ڈی کراچی سے... پھر مجھے کمپنی نے ایک سال کی ٹریننگ پر جاپان بھیجا اور وہاں میں نے مختلف اسپتالوں کو دیکھا... انسٹالیشن پراسیس کو دیکھا اور ایک طرح سے اپرنٹس کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ یہ دوسرے صاحب ان مشینوں کی ورکنگ اور کارکردگی دیکھتے ہیں... مینٹی نینس انجینئر ہیں... علیم الدین ان کا نام ہے۔''

علیم الدین اس وقت انور سے بات کررہا تھا۔ وہ ہمارے قریب آگئے۔ ''ملک... یہ علیم صاحب ہیں... یہ کمرا دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سارا ایکوپمنٹ لگایا جائے گا۔''

علیم نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور چند منٹ بعد ہم بڑے چودھری صاحب کی خواب گاہ میں تھے۔ دونوں ماہرین نے دو منٹ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''ہمیں یہ کمرا خالی چاہیے... بالکل خالی۔''

''اس میں تو وقت لگے گا۔'' انور نے پریشانی سے کہا۔

''ابھی ہم ایکوپمنٹ اتار جاتے ہیں... آپ بتائیں پھر کب آئیں؟''

''میرا خیال ہے کہ کل صبح۔'' انور نے کہا۔

''دوسری بات... ہم کمرے کو مکمل طور پر ڈس انفیکٹ کریں گے۔ جیسے کہ اسپتال کا کمرا ہوتا ہے۔ دیواروں پر سے یہ سب اتار لیں جو موجود ہے... ان پر سفید رنگ ہوگا۔''

بڑے چودھری نے خاموشی سے احتجاج کیا۔ ''اوئے پھر تو ہر وقت مجھے ایسا لگے گا کہ میں اسپتال میں داخل ہوں۔''

انور نے کہا۔ ''نہیں ابا جی... آپ کو ایسا نہیں لگے گا۔ ہم اس کی نئی ڈیکوریشن کرا دیں گے۔ پھول اور تصاویر...''

''آخر بیڈ یہ کیوں نہیں رہ سکتا؟'' بڑے چودھری نے کہا۔

علیم نے سوچ کے کہا۔ ''رہ سکتا ہے... فوم بدل دیں۔ یہ بہت نرم ہوگیا ہے اور بیڈ شیٹس اتنی ہوں کہ ہر روز بدلی جائیں۔ بالکل صاف اور الگ دھلی ہوئی۔''

انور نے کہا۔ ''یہ کوئی مشکل کام نہیں... رنگ کے لیے بھی ایک دن چاہیے کم سے کم۔''

''رنگ کرنے والے بھی شہر سے ہی آئیں گے۔ وہ آپ ہی لے آئیں تو بہتر ہے۔''

''ہم لے آئیں گے۔'' علیم نے کہا۔ ''اس کے بعد کمرے کو ایسے استعمال نہیں ہونا چاہیے جیسے عام طور پر ہوتا ہے۔ صفائی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' انور نے کہا۔

اب ان دونوں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ کس چیز کے لیے کہاں جگہ مناسب رہے گی اور اسے کہاں سے یا اور سپلائی ہوگی۔ شام ہوتے ہی وہ چلے گئے۔ مجھے بھی شناختی کارڈ آفس جانا تھا۔ انور مجھے ساتھ لے گیا۔ اس شام ہمیں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ انور نے غیر متوقع طور پر ریشم کو ساتھ چلنے کے لیے کہہ دیا۔ ریشم نے غالباً احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے سلونی کو بھی دعوت دے دی تاکہ اس پر اکیلے میرے ساتھ جانے کا الزام بھی نہ آئے۔ وہ ایک بڑی خوشگوار شام تھی۔ شناختی کارڈ کا مسئلہ تو چند منٹ میں حل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے پی سی کے پرسکون اور خوب صورت ماحول میں چائے پی اور رات کے کھانے تک کا وقت تفریح میں گزارا۔ سلونی تو خیر ہمیشہ سے خوش لباس تھی۔ اس نے ریشم کو بھی حیرت انگیز طور پر اپنے جیسا بنا دیا تھا۔ یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ بابا رحیم بخش کی وہی بیٹی ہے جو چند روز قبل تک ویہاتی فیشن کے سوا کچھ نہیں جانتی تھی۔ دونوں خواتین کی تعلیم میٹرک تک تھی۔ میٹرک دونوں نے پاس نہیں کیا تھا۔ ریشم بڑی حیرت سے سلونی کی نگرانی میں سوشل ایٹی کیٹس اور اپر کلاس کی خواتین کے ادب آداب سیکھنے میں کوشاں تھی۔

ریشم کے مقابلے میں سلونی زندگی کے گرم سرد کا زیادہ تجربہ رکھتی تھی اور تلخ تجربات نے اسے وہ سب سکھا دیا تھا جو اپنے جدی پشتی حالات کے کنوئیں میں مینڈک بن کر رہنے والے ساری عمر گزار کے بھی نہیں سیکھتے۔ شاید ایسا ہی سلونی اور ریشم کے ساتھ بھی ہوتا لیکن ان کو حسین صورت کے ساتھ ذہانت اور ہمت بھی عطا ہوئی تھی چنانچہ حالات کی آزمائش میں بھی ان کو آگے بڑھنے کا راستہ ملا۔ سلونی نے شہر میں بھی آگے بڑھنے کا جو راستہ تلاش کیا، وہ شریفانہ ہرگز نہیں کہلاتا مگر جب موقع ملا تو وہ انہی حالات کی سیڑھی پر کامیاب ہوتی چلی گئی اور آج انور کا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔

ریشم کے لیے ہر جگہ جہاں ہم گئے، نئی تھی اور وہاں کے ماحول کے مطابق اور اس سوسائٹی کے لائف اسٹائل... انداز و اطوار اور ایٹی کیٹس کو اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی

اور وہ جھجک کے ساتھ احساس کمتری کے کمپلیکس کا شکار ضرور تھی جو ایک قدرتی بات تھی لیکن وہ مشاہدہ کررہی تھی۔ سیکھ رہی تھی اور بدل رہی تھی۔ ہم تین جو ریشم کے ساتھ تھے، باہر کی دنیا کے گرم سرد کا مزہ چکھ چکے تھے۔ میرا پس منظر شہری تھا اور میں نے متوسط طبقے کے ماحول میں بھی کالج، یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرلی تھی اور پھر زندگی مجھے نادر شاہ کے مقابل کھڑا کرکے.... ناکردہ گناہ کی سزا میں سکھر جیل کی کال کوٹھری تک لے گئی تھی۔ انور جہاندیدہ کتابی علم میں بہت آگے اور اکتسابی علم میں اس سے بھی آگے تھا۔ اس کی خوش قسمتی نے ساتھ دیا اور وہ اپنی عقل و ذہانت کو اپنی مرضی کے مطابق بڑھانے اور استعمال کرنے کے قابل رہا تھا۔ بس ایک حادثے یا غیر متوقع تجربے نے اسے زندگی کا وہ رخ بھی دکھا دیا تھا جو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے پھر سے حقیر تنکے کی طرح بے بسی سے بہہ کر تباہی اور ہلاکت کی طرف لے جانے والے حالات کے دھارے میں سے نکالنے والا میں ہوں۔ میں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر قدرت نے مجھے اس کی رہائی کا وسیلہ بنایا تھا تو اس کے حالات کو بھی میری زندگی کا رخ بدلنے کے لیے رکھا تھا۔

یوں ہم چاروں سمجھتے اور اپنی اپنی زندگی کے اس خوشگوار انقلاب کی خوشی میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک تھے۔ ریشم نے قدم قدم پر غلطی کی۔ چائے پیتے ہوئے پی سی کے ماحول میں وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔ وہ چائے نہیں پیتی تھی مگر اس نے پی۔ کھانے کے وقت جب ویٹر نے مینیو اس کے سامنے رکھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے یا کیا کہے... سلونی نے ویٹر کو کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کے ٹالا اور پھر ریشم کو بتاتی رہی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انگریزی وہ پڑھ سکتی تھی مگر کیا چیز کیا ہے... یہ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا۔ اس کام میں بھی سلونی نے اس کی مدد کی۔ ریشم نے کنفیوز ہو کے اس سے کہہ دیا کہ وہ خود ہی انتخاب کرلے۔ میں نے اور انور نے عمداً اس کی طرف نہیں دیکھا اور اپنی باتوں میں لگے رہے... پھر انور نے اور میں نے سلونی کو اپنی پسند بتادی اور اس نے ویٹر کو آرڈر لکھوا دیا۔ ریشم کو یوں کانٹا استعمال کرنا کہاں سے آتا۔ اس کی وجہ سے ہم نے بھی ہاتھ ہی استعمال کیے۔ اس ماحول میں اپنی اجنبیت کے احساس پر ریشم نے خود ہی قابو پایا اور شاید اسے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ صرف ہم نہیں... وہاں کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں [illegible]

لے گیا اور میں درحقیقت ایسا محسوس کررہا تھا کہ یہ میری دوسری زندگی ہے۔

انور نے سب کو مخاطب کیا۔ ''اب کافی یا آئس کریم؟''

ریشم نے سب سے پہلے کہا۔ ''میرے لیے تو آئس کریم۔''

''میرے لیے کافی۔'' میں نے کہا۔

''میرے لیے بھی۔'' سلونی نے ہاتھ اٹھایا۔

''او کے... میں ریشم کا ساتھ دوں گا۔'' اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

اسی وقت ریشم نے انور کی طرف جھک کے آہستہ سے کچھ کہا اور اس نے سر ہلایا۔ ''سلونی! تم آرڈر دو... میں ذرا ریشم کے ساتھ جارہا ہوں۔'' پھر وہ دونوں اٹھے اور ٹیبلوں کے بیچ میں سے گزرتے غائب ہوگئے۔ یہ منظر میرے لیے بڑا حیران کن تھا کہ ریشم نے راہنمائی کے لیے اپنا ہاتھ انور کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور گاؤں کی اس لڑکی کو اس ہال میں بیٹھتے ہوئے لوگوں کی تجسس بھری نظر اور معنی خیز مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ تھی۔ یہاں یہ نظارہ معیوب تھا، نہ انوکھا... ایسے اندازِ دلبری اور آدابِ عاشقی کا مظاہرہ اس سوسائٹی کے ایٹی کیٹس میں شامل تھا۔ متوجہ کرنے والا ریشم کا حسن بے مثال تھا جو رنگ، پیراہن اور میک اپ کے اضافے سے نگاہوں کو خیرہ کررہا تھا۔ حسن و شباب کی دلکشی خداداد تھی تو اسے اجاگر کرنے کا سارا کریڈٹ سلونی کو جاتا تھا۔ شاید ہال میں اس وقت اپنے حسن پر نازاں ہر پری چہرہ کے غرور کا آئینہ ٹوٹ گیا ہوگا۔

''تم نے بھی کیا کمال کیا ہے سلونی... خاک آلودہ پتھر کو ہیرے کی آب و تاب دے دی ہے۔'' میں نے کہا۔

سلونی ہنسی۔ ''آپ تو شاعری پر آگئے... یہ نظر کا قصور ہے یا دل کا؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''تم خود دیکھ رہی ہو... مگر یہ دونوں جا کہاں رہے ہیں؟''

''ریشم کو واش روم جانا ہوگا۔'' سلونی نے کہا۔ ''اسے تو کچھ پتا ہے نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تم سے کہہ سکتی تھی۔ کیا لیڈیز ایسی بات جینٹس سے کرتی ہیں؟''

''ہوسکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو... آپ جیلسی تو محسوس نہیں کررہے؟''

میں نے مزید خفت سے کہا۔ ''کرنا تو چاہیے... انور

WWW.PAKSOCIETY.COM

یقیناً خوش قسمت ہے... یہ سب محسوس کررہے ہوں گے... سوائے میرے۔''

''آپ کیوں نہیں؟''

''ریشم کے لیے میرے دل میں کبھی سافٹ کارنر نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہوں گا کہ میں اسے نہیں سمجھتا تھا... دراصل ابھی تک میں نورین کے ٹرانس سے نکل نہیں پایا۔''

''کیا وہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت تھی؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''خوب صورت؟ پتا نہیں... ہوسکتا ہے کہ صرف مجھے لگتی ہو... حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے... خیر تم چھوڑو... کافی پیو۔''

سلونی نے دو خالی کرسیوں کے سامنے رکھے دو آئس کریم کے پیالوں کو دیکھا۔ ''آپ دکھی ہوگئے؟''

''کبھی ایسی جان لیوا محبت تمہیں نہیں ہوئی؟'' میں نے کہا۔

وہ خلا میں دیکھتی رہی۔ ''صرف مجھے ہوتی تو کیا؟ دل تو بچہ ہے... کھیلنے کو چاند بھی مانگ سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کون تھا وہ بدقسمت؟''

''بدقسمت، وہ کیسے ہوا؟''

''میرے نزدیک تھا... جو تم جیسی لڑکی سے محروم رہا۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسی۔ ''میرے جیسی؟ آپ نے ابھی دیکھا یہاں سب کیسے دیکھ رہے تھے؟ اسے جو سب سے حسین تھی... میں کس شمار قطار میں بھلا... ان سب کے مقابلے میں جو صرف یہاں ہیں میں تو آخری ہوں... کون دیکھے گا میری طرف؟''

میں دیکھتا رہا۔ ''سلونی! تم خود کو بہت انڈر اسٹیٹ کررہی ہو... یہ میں تمہارا دل رکھنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ حسن کا ایک خیرہ کن جلوہ بادلوں میں چمکنے والی بجلی دکھاتی ہے۔ سورج کی طرف دیکھنے والوں کی نظریں چندھیا جاتی ہیں... مگر ایک جادو چودھویں شب کی چاندنی کا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ دل پر اثر کرتا ہے اور اپنے حسن میں جذب کرلیتا ہے۔ تم میں دوپہر کے سورج کی چکاچوند نہ سہی... ماہِ کامل کا اسیر کرلینے والا سحر ہے۔ تمہاری شخصیت کا تاثر جب دل کو گرفت میں لیتا ہے تو سارے نظارے دھندلا جاتے ہیں۔''

سلونی کے چہرے پر وہی بے یقینی کی مسرت پھیل گئی جو بڑی حقیقی ہوتی ہے۔ جو عورت کے چہرے پر اس وقت ہی نور بن کے پھیلتی ہے جب ایک ماں اپنے گم شدہ لختِ جگر کو پھر پالیتی ہے یا اس وقت نظر آتی ہے جب کوئی مسیحا کسی حرماں نصیب سہاگن کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ اس کا وہ شوہر زندہ رہے گا جس کے دن قطعی طور پر گنے جاچکے تھے۔ شاید یہ نعمت کسی مرد کے حصے میں نہیں آئی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ الفاظ کے جادو کا استعمال خوب جانتے ہیں۔''

''تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے... اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خود تمہیں اس کا احساس نہ ہو۔ ہاں، تمہاری یہ بات زندگی کی ٹھوس حقیقت ہے کہ ہر خواب کو تعبیر نہیں ملتی... شاعر کی زبان میں... وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''لگتا ہے ایسے ہی تجربے سے آپ بھی گزر چکے ہیں۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''شاید میں گزر رہا ہوں ابھی... میں لگی لپٹی رکھے بغیر اعتراف کروں گا کہ نورین کا ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ میرے خیالوں میں زندہ ہے... لیکن جب وہ میرے ساتھ تھی تب بھی اس کا خیال کسی اور کے ساتھ تھا۔''

''آپ نے کچھ نہیں کہا... تو کیا اس نے بھی نہیں سمجھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کبھی نہیں... اسے احساس ہوتا تو وہ اظہار کرتی نہ کرتی... مجھے خبر ہوجاتی۔''

سلونی نے کہا۔ ''یہ دونوں کہاں چلے گئے... آئس کریم تو پگھل کے شربت بن گئی ہے... لو... میرے بات کرنے کی دیر تھی... وہ آگئے... کیا انہیں احساس ہوگا کہ آدھا گھنٹا گزر گیا؟''

''شاید نہیں... اور ضرورت بھی کیا ہے احساس دلانے کی؟''

انور نے قریب آکے کہا۔ ''سوری یار! اس کی طبیعت اچانک بوجھل ہوگئی تھی... باہر تازہ ہوا میں بحال ہوئی۔''

ریشم نے ادھورے اعتماد کے ساتھ وہ بات کہی جو اسے انور نے سمجھائی ہوگی۔ ''شاید کھانے میں ایسی کوئی چیز تھی... میں عادی نہیں نا۔''

سلونی نے کہا۔ ''اب یہ شربت پی کے گزارہ کریں گے آپ دونوں یا میں پھر آرڈر دوں؟''

''آئس کریم تو ہم ضرور کھائیں گے... خواہ وہ اسی کو پھر جما کے لائیں۔''

ہم جب واپس پہنچے تو پھر آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ اس جگہ سے گ

تھا، مجھے گزشتہ رات کی ساری بے رحمی یاد آئی... زمیں سخت مخالف ہے آسماں میرا... پناہ ملی تو یوں جیسے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے... رات کیسی تاریک تھی... موسم کتنا نامہرباں تھا۔ آج کی رات جیسے زخم کی ٹیس پر مرہم... آج سکون ہی سکون تھا... عاقبت ہی عاقبت تھی۔ معلوم نہیں ریشم اور سلونی کے جذبات کیا تھے۔ ابھی ہمارے رشتوں میں قربت کا احساس مصنوعی لگتا تھا۔ اجنبیت کی ایک دیوار اتنی جلدی کیسے گر جاتی۔ ریشم کل تک ایک عام غریب دیہاتی لڑکی تھی جس کی آبرو پر اکبر جیسے بھیڑیے کی نظر تھی اور وہ خود کو ایک بھیڑ سے زیادہ کمزور اور بے بس سمجھنے پر مجبور تھی۔ سلونی کی حیثیت پہلے بھی ایک زرخرید داشتہ جیسی ہی تھی اور خواہ انور اس کی عزت افزائی کررہا تھا لیکن وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ وہ بہرحال اس کی خدمت گار اور ملازم ہے۔ اس کے مقابلے میں انور کی سماجی حیثیت بہت بلند تھی۔ اس کے ساتھ وہ علم اور تجربے میں ہم سب سے زیادہ تھا۔ میں خود کو تعلیم یافتہ تو کہہ سکتا تھا لیکن میں ایک بڑا یافتہ اور مفرور مجرم بھی تھا۔ یہ انور کی فراخ دلی اور فیاضی تھی کہ وہ ہم سب کو رفاقت کا احساس دلا رہا تھا اور ساتھ لے کر چلنے کی حوصلہ افزائی کررہا تھا۔ شاید خیالات کی اس کشمکش نے واپسی پر انور کے سوا سب کو خاموش رکھا۔

اس رات اپنے خیالوں نے مجھے سونے نہ دیا۔ پہلی بار میں نے اپنا نام فریدالدین سے بدل کے خاور کیا تھا تو یہ عذرِ مجبوری تھی۔ دوسری بار اس کی ضرورت نہ تھی لیکن وقت نے اپنی چال چلی۔ زنداں سے رہائی دلوائی تو مراداں والی کا اسیر بنا دیا۔ نئی زندگی کے لیے نئی شناخت عطا کی اور چودھری فریدالدین کو ملک سلیم اختر بنا دیا۔ بظاہر نہ اس کا امکان نظر آتا تھا اور نہ میرے دل میں ایسی کوئی خواہش تھی کہ میں زندگی کا یہ چلن بدلوں۔ عدم آباد کی راہ کا مسافر مراداں والی کا ہوگیا تھا۔ حادثہ بے سبب نہیں ہوتا... اس کے پیچھے قدرت کے ہاتھ کی کارفرمائی ہوتی ہے جو انسان کے نوشتۂ تقدیر کو اس کی زندگی کا حصہ بناتا ہے۔ آج میں نے نورین کے بارے میں جو بھی کہا تھا، اپنے وقت کی حقیقت تھی لیکن آج کے وقت کی حقیقت کچھ اور تھی۔ نورین میری زندگی کے سفر میں ایک پڑاؤ کی طرح آئی تھی جسے میرے دل نے منزل سمجھ لیا۔ اب یوں لگتا تھا کہ وہ سفر تمام ہوا... وہ پڑاؤ گزر گیا۔ اس کی یاد کا نقش کتنا بھی دلنواز سہی، اجاڑ رہا تھا۔

زندگی...

اور یہ اتنی بری بھی نہیں ہے۔ جب تک تقدیر اس کا رخ نہ موڑے، اسی پر قناعت کرو اور خوش رہو۔ جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا... یہی ہے دستورِ زندگی کا... بالآخر اس احساس میں سکون پا کے میں سو گیا۔

مجھے نہیں معلوم یہ بزدلی یا خودغرضی کے ساتھ زندگی سے سمجھوتا کرنے پر شرمندگی کا احساس تھا یا کچھ اور... لیکن رات کے کسی حصے میں اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیرے میں نظر کچھ نہ آتا تھا... پھر بھی میں نے ایک سایہ سا متحرک دیکھا لیکن اس سے زیادہ اعصاب کو متاثر کرنے والی ایک خوشبو تھی جس نے مجھ پر یلغار کی۔ اس خوشبو کو میں بھول نہیں سکتا تھا۔ ہزاروں کے مجمع میں اس خوشبو پر میں سیدھا نورین کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ اس خوشبو نے پہلی بار مجھے اس رات اندھیرے میں اسیر کیا تھا جب میں سکھر جیل کی کال کوٹھری سے فرار ہو کے ایک آسیب زدہ حویلی کے کھنڈر میں چھپا تھا۔ پھر یہ خوشبو نورین کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور اس کی شناخت بن گئی تھی۔

میں نے اندھیرے میں اس کے پیکر کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ''نورین... یہ تم ہو؟'' میں نے کہا اور پھر لائٹ جلانے کی کوشش کی مگر سوئچ آن کرنے کے باوجود اجالا نہ ہوا... شاید یہ کوئی خرابی تھی یا فیوز اڑا ہوا تھا۔

اس نے ایک بار سسکی لی... ''میرا نام یاد ہے تمہیں؟''

میں نے طنز کے اس تیر کی چبھن دل میں محسوس کی۔ ''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ میں تمہارا نام بھول جاؤں؟''

''مجھے تو بھول ہی گئے ہوتا۔''

''نہیں، تم میری یادوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہو... یہاں آؤ میرے قریب۔''

''نہیں، اب اس دوری کو میں نے بھی قبول کرلیا ہے... میری قسمت میں صرف محرومیاں ہیں۔''

''ایسا مت کہو نورین... میں نے اس کا اظہار نہیں کیا کبھی... لیکن حقیقت یہی ہے کہ...''

اس نے تلخی سے میری بات کاٹ دی۔ ''خوب جانتی ہوں تمہاری حقیقت کو میں... مجھے سمجھنے میں ذرا دیر لگی۔ تم صرف ایک جھوٹے دھوکے باز انسان تھے جس پر میں نے بے وقوفی میں اعتبار کرلیا۔''

''یہ غلط ہے... ایسا کیوں سمجھتی ہو تم...؟''

''کیوں؟ کیا تم نے دھوکا نہیں کیا تھا میرے ساتھ؟ جھوٹ نہیں بولا تھا کہ تم سلمان سے ملے تھے... اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر گئے تھے؟''

''وہ... میں نے مصلحت کے تحت کہا تھا... تمہیں صدمے سے بچانے کے لیے...''

''یہ بھی جھوٹ۔'' اس نے میرے سامنے ایک اخبار لہرایا۔ ''اس میں سب کچھ ہے... سلمان زندہ نہیں تھا... تم نے اس کی لاش بھی دیکھ لی تھی وہیں جہاں وہ مجھ سے ملنے پہنچا تھا۔ تم نے اس کے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔ ضرور تم نے اسے لوٹا بھی ہوگا... میرے ساتھ جانے کے لیے وہ گھر سے خالی ہاتھ تو نہیں نکلا ہوگا۔ تم ایک پیشہ ور قاتل تھے... تم نے اسے مار دیا اور اس کی لاش کھنڈر میں اوپر ڈال دی پھر تم میرے ساتھ شرافت کا ڈراما کرتے رہے... مجھے ساتھ لیے پھرتے رہے... ایک کے بعد ایک جھوٹ بولتے گئے... کیوں خاور... شاید یہ تمہارا اصلی نام بھی نہیں ہوگا۔''

''میں مانتا ہوں کہ میں نے اپنا نام بھی غلط بتایا تھا۔ وہ میری مجبوری تھی لیکن سلمان کو میں نے قتل نہیں کیا تھا... میں تمہاری قسم کھا سکتا ہوں۔''

''مت کھاؤ میری جھوٹی قسم... پاگل میں تھی کہ تمہارے جال میں پھنس گئی۔ آخر کیا چاہتے تھے تم؟ کسی دن اپنی ہوس کا نشانہ بناتے اور میری بے بسی کا فائدہ اٹھاتے رہتے؟ بلیک میل کرتے مجھے... بالآخر بیچ دیتے کسی کے ہاتھ...''

''نورین... خدا کے لیے بس کرو۔ تم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے بہت وقت ملا تھا مجھے...'' میں نے فریاد کی۔

''فائدہ تو ہو گیا تمہارا... میرا سب کچھ تمہیں مل گیا... سارا زیور، نقد رقم... میری آبرو بھی کب تک محفوظ رہتی... کیسے مزے سے کٹتی بے خیرتی کے ساتھ ملک سلیم اختر بنے تم یہاں زندگی کے مزے لوٹ رہے ہو... ایک ریشم ہے... ایک سلونی... ایسی اور بہت ملیں گی... نورین پر لعنت...''

''نورین...'' میں چلایا۔ اسی وقت لائٹ آ گئی۔ میں نورین کی طرف لپکا تھا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کمرے میں جہاں وہ موجود تھی۔ اس کی کوئی نشانی تھی تو وہ خوشبو جو اس کے وجود کی علامت تھی۔ باہر سے محافظ ایک دم اندر آ گیا۔

''سر! آپ نے آواز دی مجھے... خیریت ہے نا جی؟''

''ہاں، سب خیریت ہے... تم جاؤ۔''

''میں نے کسی کو نکلتے دیکھا تھا یہاں سے... لائٹ گئی ہوئی تھی۔''

''کوئی نہیں تھا یہاں۔'' میں نے جھلا کے کہا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا۔ میرے سارے جسم پر ٹھنڈا پسینا بہہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خواب کے سوا کچھ نہ تھا... مگر خواب اپنے پیچھے خوشبو چھوڑ کے ختم نہیں ہوتے۔ اس کی خوشبو کو صرف میں نے ہی نہیں، گارڈ نے بھی محسوس کیا تھا۔ روحوں کے وجود سے انکار کرنا بھی اتنا ہی دشوار تھا جتنا ان کے وجود کو تسلیم کرنا لیکن روح کا دنیا سے جا کے پھر زندگی کے قالب میں نظر آنا... یہ میری عقل نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ ساری دنیا میں ایسے واقعات پیش آتے رہتے تھے جن کو عقل کی کوئی دلیل یا وضاحت قابل قبول نہیں بنا سکتی تھی لیکن میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا... میں نے کسی سے سنی سنائی کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا چنانچہ میں کنفیوز ہو گیا کہ آخر یہ کیا تھا... فریب خیال؟ فریب نظر... تصور کا طلسم یا دماغ کی خرابی؟

صبح تک میں ذہنی انتشار اور خیالوں کے آسیب سے کافی حد تک نجات پا چکا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ میرے ذہن پر بوجھ تھا اور لاشعور میں بہت گرد بر تھی۔ نورین کو فراموش کر دینے کا احساسِ جرم... اپنی شخصیت بدل لینے کا خیال پھر پکڑے جانے کا ڈر اور موجودہ حالات سے ایک خود غرضانہ مفاہمت پر شرمندگی... ان سب عوامل نے مل کر مجھے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ میں نے ایک برا خواب دیکھا... لیکن اس وقت میری عقل بالکل خبط ہو گئی جب میرے جاگنے کے کچھ دیر بعد ریشم نے سر دروازے سے اندر ڈال کے بڑی شوخی کے ساتھ پوچھا۔

''سر... میں حاضر ہو سکتی ہوں؟''

میں غسل کے بعد لباس بدل کے ناشتے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''یس میڈم! آپ ہی کا انتظار تھا مجھے...''

اس نے اندر آ کے ناک کو ادھر اُدھر گھما کے سوں سوں کی... ''یہ کیسی خوشبو ہے؟ اور کس کی؟''

''یہ تم اپنے ساتھ لائی ہو۔''

''اونہوں...'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ اس سے بالکل مختلف ہے ورنہ مجھے کیوں محسوس ہوتی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''کیسی ہے یہ خوشبو؟''

''یہ میں کیسے

لے سکتی ہوں... سلونی نے کل مجھے جو خوشبو دی تھی، وہ بھی بہت اچھی تھی۔ کیا نام تھا اس کا... چارلی... جو تم نے یا چودھری صاحب نے لگائی تھی، وہ بھی اچھی تھی۔ یہ الگ ہے، اس کا کیا نام بتاؤں۔ اس سے پوچھو نا جس کی ہے۔''

''اچھا، تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟ رات ساڑھے بارہ بجے ہم آئے تھے اور اب بجے ہیں ساڑھے آٹھ... اس درمیان میں گون آ سکتا ہے... یا آ سکتی ہے یہاں... خود اپنی کہو کہ یہ انقلاب کیسا اور کس کے لیے؟ چند دن پہلے تم کیا تھیں اور اب کیا ہو؟''

وہ کچھ لال ہوئی۔ ''یہ سب تم سلونی سے پوچھو... وہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے... اور اب چلو ناشتے کے لیے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم بھی یہاں بیٹھو... ناشتا منگوا لیتے ہیں۔'' میں نے سرنکال کے خادم کو ناشتے کے لیے کہہ دیا۔

''صرف ہم ہی نہیں...'' وہ ایک صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ''حویلی میں بہت کچھ بدل رہا ہے۔''

''اچھا ہی ہو رہا ہے سب۔'' میں نے کہا۔ ''انور بہت سمجھ دار ہے... سختی نرمی کہاں ہونی چاہیے کہاں نہیں، سب جانتا ہے۔ چھوٹی چودھرائن کے رویے کی تبدیلی میں نے دیکھی۔ وہ بڑی چودھرائن اور چودھری صاحب کا دل بھی جیت لے گا۔ اس کے بعد امید ہے اکبر کے ساتھ بھی صلح صفائی کا راستہ نکال لے گا۔''

''اس کی نیت اچھی ہے... لیکن اندر کے معاملات ایسے نہیں جیسے نظر آتے ہیں۔''

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''تمہاری نظر اندر کے معاملات تک پہنچ گئی... کیا بات ہے؟''

''مجھے تو چار دن ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے لیکن سلونی نے حویلی کے اندر بہت کچھ دیکھا ہے اور سنا ہے... اس نے بتایا ہے مجھے۔''

''اور تم سمجھتی ہو کہ وہ سب صحیح ہے؟''

''وہ غلط کیوں بتائے گی آخر...؟ اس کی اور میری دوستی ہو گئی ہے... ہم ایک دوسرے کے رازدار ہیں۔''

''اچھا کیا بتایا ہے اس نے؟''

''اس نے بڑے چودھری صاحب کے زمانے میں حویلی کے اندر کے سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی سے چلائے... وہ حویلی کے علاوہ مہمان خانے کے انتظام بھی

''میں جانتا ہوں، وہ کیا انتظامات تھے۔''

''اس کی مجبوری الگ تھی لیکن اس نے بڑی ذہانت سے اس مجبوری کو دوسروں کی مجبوری بنا دیا۔ کیا یہ تعریف کی بات نہیں؟ ایک بات پر شاید تم یقین نہ کرو... اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔''

''مطلب یہ کہ دوسروں سے بولتی ہو۔''

''وہ بولنا پڑتا ہے... کیا تم نہیں بولتے؟'' اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ''اوکے... میں مان لیتا ہوں کہ سلونی نے سچ کہا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہا۔''

''سب کا خیال ہے کہ اس کو بڑے چودھری صاحب نے اٹھوایا تھا تو اپنے لیے... مگر ایسا نہیں تھا۔ بڑے چودھری میں خرابیاں بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی کچھ اچھائیاں بھی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ سلونی اپنی تعلیم مکمل کرے مگر اکبر نے کہا کہ گاؤں میں پڑھا لکھا بندہ ہونا ٹھیک نہیں۔ لڑکی پڑھ کے دوسری عورتوں کو بھی خراب کرے گی۔ مطلب یہ کہ آزادی یا حق کی بات کرنا خرابی ہے۔ نیت اس کی شروع سے تھی... اس نے سلونی کو اٹھوایا... بڑے چودھری کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں رہا... ہاں ان کے کہنے پر وہ مہمانوں کی خدمت ضرور کرتی رہی۔''

خدمت کی بات کرتے ہوئے ریشم کی نظر جھکی رہی اور چہرہ لال ہو گیا۔ ''اس میں بڑے چودھری کی اچھائی کیا تھی؟''

''بڑے چودھری نے ہمیشہ اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس کو وہ عزت دی جو اکبر اسے نہ دیتا۔ کچھ عرصے بعد اس کا دل بھر جاتا تو وہ سلونی کو بھی نکال باہر کرتا۔ اس کی جگہ کوئی اور لے لیتی... لیکن بڑے چودھری نے اس کی ذہانت اور اس کی خدمت سے متاثر ہو کے اسے کچھ ذمے داری دی۔ سلونی نے یہ بھی بتایا کہ بڑی چودھرائن کی اس پر کڑی نظر تھی۔ بیٹے کی آوارہ مزاجی ان کے نزدیک کوئی ایسی بات نہ تھی۔ گاؤں کی کم ذات لڑکیاں آخر ہوتی کس لیے ہیں۔ خود بڑے چودھری صاحب اپنی جوانی میں ایسے ہی تھے لیکن شادی کے بعد بڑی چودھرائن نے کچھ عقل سے اور کچھ اپنی زبردستی سے بڑے چودھری کو نکیل ڈالی۔ دراصل وہ بڑے بھائی کی بیٹی تھی اور اس کا باپ بہت سخت تھا۔ وہ چھوٹے بھائی کو یعنی بڑے چودھری کے باپ کو تھپڑ مار دیتا تھا۔ اکبر کی بیوی یہ نہیں کر سکی... بس سلونی کے خلاف ہونے کی پہلی وجہ یہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے شوہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں... کہ چھوٹی والی بھی انور سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟ اور کوئی ہے خاندان میں؟"

"ہاں، اس کے ماموں کا بیٹا ہے۔ جب باپ کی طرف سے کوئی نہیں تو ماں کے بھائی کا نمبر پہلا... وہ پسند بھی کرتی ہے اسے۔"

میں نے کہا۔ "اگر سلوتی کے کانوں تک ایسی بات پہنچ گئی ہے تو اکبر کو بھی پتا ہوگا... اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اکبر کو اب ایک تیر سے دو شکار کرنے ہیں۔ قضا کے تیر کا نشانہ پہلے وہ بھی بن سکتا ہے جو انور کی جگہ لے سکتا ہے۔ پہلے اسے مقابلے سے خارج کر دیا جائے۔ پھر بیوی کی جگہ دوسری بیوی کے لیے خالی کی جائے۔ کیا انور یہ سب نہیں سمجھتا؟"

"اگر نہیں جانتا تو تم اسے بتا دو... سمجھا دو... صرف تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "اچھا، اب میرا خیال ہے کہ کمپنی کے لوگ آنے والے ہوں گے۔ کیا بڑے چودھری صاحب کو دوسرے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ہے؟"

"ہاں... وہ رات کو دوسرے کمرے میں سوئے تھے... ان کا کمرا بالکل خالی ہے۔"

"اب ایک سوال میں تم سے پوچھوں؟"

"شرمانے کی کون سی بات ہے اس میں؟" ریشم بولی۔

"ہاں، جب تمہیں شرم نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے... کل رات آئس کریم چھوڑ کے تم انور کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟"

اس کا رنگ پھر لال پڑ گیا۔ "تمہیں کیا شک ہے، میں لے گئی تھی اسے؟ اس نے خود کہا تھا مجھ سے کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"اچھا؟ پھر کیا کہا اس نے؟ چاہو تو بتا دو ورنہ میں اپنے اندازے پر قائم رہوں گا۔"

ریشم نے ایک گہری سانس لی۔ "اس نے کہا... کہ میں تمہارے ساتھ جانے کا خیال چھوڑ دوں۔"

میں چونکا۔ "مگر میں کہاں جا رہا ہوں؟"

"ہم جانا چاہتے تھے... جا نہیں سکے تھے۔ اس کی خواہش ہے کہ تم یہاں اس کے ساتھ رہو مگر اسے اعتبار نہیں... تم اپنی مرضی سے چلے جاؤ... یا مجبور ہو جاؤ... میں تو اسی گاؤں کی بیٹی ہوں۔ مجھے گاؤں نہیں چھوڑنا چاہیے... ایک اجنبی کے ساتھ۔"

"بالکل ٹھیک مشورہ دیا اس نے... کیا اس نے یہ بھی بتایا کہ تمہارے گھر میں اب تمہاری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تو تم اکیلی وہاں کیسے رہو گی؟ یا اس نے کہہ دیا کہ تم چاہو تو ہمیشہ حویلی میں رہ سکتی ہو... مہمان بن کے نہیں... مالکن کی حیثیت سے...؟"

ریشم کا رنگ شرم سے لال چقندر ہو گیا۔ "حد سے زیادہ چالاک ہو تم... اور بے شرم۔" وہ جھینپ کر ایک دم اٹھی۔

میں نے ایک قہقہہ مارا۔ "چاند نکلتا ہے تو سب کو نظر آتا ہے... ویسے میرا مشورہ ہے کہ اس کی مان لو۔" مگر اتنی دیر میں ریشم فرار ہو چکی تھی۔ میرے لیے یہ اطلاع یا انکشاف اس لیے حیرانی کا سبب بنا کہ ایک نظر کی محبت کوئی افسانہ یا شاعرانہ بات نہیں تھی۔ شاید تورین کے معاملے میں میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن انور جیسے جہاں گرد اور افلاطونی ذہن رکھنے والے کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات بھی تھی۔ میرے کندھوں سے ریشم کی ذمے داری کا بوجھ اتر گیا تھا جو نہ میں نے اپنی مرضی سے لیا تھا اور نہ ریشم ڈالنا چاہتی تھی لیکن حالات کی گردش نے اسے دونوں کی مجبوری بنا دیا تھا۔ پہلے میں تورین کی ذمے داری اٹھانے کا تجربہ کر چکا تھا جو مجھے بہت مہنگا پڑا تھا۔ بعد میں یہ کوئی زبردستی کا سودا نہیں رہا تھا۔ خود میں اس سے نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ میرے احساس اور وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی اور آج بھی تھی۔ گزری ہوئی رات کا واقعہ وہم تھا یا حقیقت کا کوئی روپ... لیکن اس نے میرے دل میں پرانی کسک کو تازہ کر دیا تھا۔ ریشم نے بھی میری خلش میں اضافہ ہی کیا تھا۔ خوشبو اسے بھی محسوس ہوئی تھی۔ رات کے محافظ کی گواہی کے بعد میں ریشم کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ آرزو کا سراب تھا... یا سچ مچ وہ روح بن چکی تھی اور اب یونہی راتوں کے اندھیرے میں یا خواب میں میرا پیچھا کرتی رہے گی۔ ایسا سمجھنا دنیا سے اس کے مادی وجود کا عالم ارواح میں پہنچ جانے کے مترادف تھا۔ کیا میں مان لوں کہ وہ واقعی مر چکی ہے؟ قدرت کا یہ اشارہ میرے شک کی تصدیق کرتا ہے۔

ریشم کے فرار سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میڈیکل ایکوپمنٹ سپلائی کمپنی کا ٹرک پہنچ گیا ہے۔ جب میں نے جا کر دیکھا

تھا۔ دونوں مینجر مشینوں کے لیے پاور سوئچ کی جگہ کو مارک کر رہے تھے اور ایک الیکٹریشن ان کی ہدایات کے مطابق وائرنگ دیکھ رہا تھا..... باہر نصب ہونے والے پچاس کے وی اے کے آٹو ٹینک جنریٹر کو بھی اسی سسٹم سے جوڑنا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے ایک کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے، یہ کام آج مکمل ہو جائے گا؟"

ان دونوں کا سر نفی میں ہلا۔ "آج تو کسی صورت نہیں... ایک دن جنریٹر کی تنصیب کے لیے چاہیے... ایک دن باقی مشینوں کو لگانے کے لیے... میرا خیال ہے پرسوں شام تک ہم اسے قابلِ استعمال بنا دیں گے۔"

انہیں اپنے کام میں مصروف چھوڑ کے میں بڑے چودھری صاحب کی خیریت معلوم کرنے گیا تو انور پہلے سے وہاں موجود تھا اور ایک بے حد خدمت گزار، فرماں بردار دخترِ مشرق کی طرح بہو ان کے پاؤں دبانے کا ثواب سمیٹ رہی تھی۔ مجھے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ انور نے میدان مار لیا ہے۔ میرے سلام کا جواب بھی ملا اور ماں جی نے مجھے دعا بھی دی۔

اس سے پہلے کہ میں یا کوئی اور کچھ کہتا، بھابی نے کہا۔ "ماں جی... یہ سب ان کی کوشش سے ہوا۔"

چودھری صاحب نے طمانیت کا اظہار کیا۔ "بہت اچھا انتظام ہو گیا میرے لیے۔"

میں نے کہا۔ "چودھری صاحب! یہ سو فیصد انور کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ ہے... میں نے صرف ساتھ دیا۔"

"تم جیسا مخلص دوست بھی ہر ایک کو کہاں ملتا ہے۔" بھابی نے کہا۔

انور بولا۔ "اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ملک سلیم بڑا مخلص اور سیانا بندہ ہے۔ اس سے میں نے کہا ہے کہ جانے کا خیال چھوڑے، ادھر ہی رہے ہمارے ساتھ۔"

بڑے چودھری نے اس خیال پر کوئی حوصلہ افزا ردِعمل نہیں دیا مگر بھابی نے فوراً کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ اب یہ جائیں گے بھی کہاں... ان کے کون سے بیوی بچے یاد کر رہے ہیں۔ آج میرے والد بھی آ رہے ہیں ابا جی کی خیریت معلوم کرنے... وہ آپ سے مل کے خوش ہوں گے۔ میں نے انہیں بتایا تھا آپ کے بارے میں۔"

ری عزت

میں ترقی کی علامت تھی۔ میں نے اخلاقاً کہا۔ "مجھے بھی خوشی ہو گی ان سے مل کر۔"

انور اٹھا تو مجھے بھی اٹھنے کا موقع مل گیا۔ "ملک سلیم... تم ذرا ان کام کرنے والوں کو دیکھو... مجھے کچھ اور کام ہیں۔"

کرنے والے اپنا کام تندہی سے کر رہے تھے۔ اس میں نگرانی کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کا کام جلد از جلد ختم ہو تو کمپنی کو اپنے پیسے ملیں اور وہ جائیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے اچانک انور کے کہنے سے شہر جانا پڑ گیا۔ وہاں مجھے تباہ شدہ گاڑی کی مرمت اور مکمل بحالی کے معاملے میں ورکشاپ والوں سے بات کرنی تھی۔ لاہور کا راستہ ہی سوا گھنٹے سے زیادہ کا تھا۔ پھر لاہور کے اندر بھی ورکشاپ دوسرے کنارے پر بلکہ اس سے بھی آگے شاہدرہ میں تھی۔ ورکشاپ والوں کے تخمینے یوں بھی زیادہ تھے کہ ان کے ملازم اور کارکن چاہے عام مکینک ہوں، وہ اسپیشلسٹ شمار ہوتے تھے اور بڑے لوگوں کی بڑی گاڑیوں کی مینٹی نینس کے اخراجات بھی اسی تناسب سے وصول کرتے تھے۔ کوئی چھوٹی گاڑی والا چھوٹا آدمی ان کا کلائنٹ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے نقصان کو خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا جو اتنی غلط بات بھی نہ تھی۔ گاڑی واقعی تباہ ہو گئی تھی لیکن وہ اپنا فائدہ کیسے بھول جاتے۔ مخلصانہ مشورہ دیتے تو کہتے کہ اب گاڑی کچھ پرانی ہو گئی ہے، اس کی ری سیل کم ہے اور مرمت کے بعد تو بالکل نہیں رہے گی۔ بہتر ہو گا کہ آپ نئی لے لیں۔ وہ بھی کہتے رہے کہ جب ہم کام کر کے دیں گے تو آپ کو نئی پرانی کا فرق پتا نہیں چلے گا۔ مجھے اندازہ ضرور تھا کہ نئی گاڑی کی قیمت کیا ہے۔ یہ تین سال پرانا ماڈل اور جینوئن کنڈیشن میں کتنے کا ہو گا۔ بیچنے اور خریدنے کی قیمت ہمیشہ الگ ہوتی ہے۔ لیکن گاڑی کی قیمت بننے کے بعد کتنی ملے گی، یہ ذرا مختلف بات تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اناڑی کو فرق نظر نہ آئے۔ ڈیلر اور تجربہ رکھنے والے خریداروں سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ گاڑی ایکسیڈنٹ شدہ اور بنی ہوئی ہے۔

میرے تزدیک اس تباہ شدہ حالت میں گاڑی کوئی لیتا تو لوہے کے بھاؤ تول کر... نقصان یقیناً ہوا تھا مگر اسے یوں کم کیا جا سکتا تھا کہ گاڑی بنوا کے سیل کے لیے رکھ دی جائے اور کوئی شوقین مگر غریب پھنس جائے تو نکال دی جائے کہ چاندی بنوا ب تیرے حوالے... جو اچھی قیمت ملے، وہ ڈال کے دوسری نئی گاڑی خریدنا چودھری فیملی کے لیے مشکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں تھا۔ انور نے بھی میرے فیصلے کی تائید کی اور بعد میں یہی ہوا کہ نئے ماڈل کی نئی گاڑی لینے کے لیے انہیں نصف رقم ضرور مل گئی۔ رات کے کھانے سے پہلے میں واپس پہنچ گیا۔ دن میں کام کرنے والے فارغ ہو چکے تھے اور انہیں مہمان خانے میں جگہ دے دی گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن میں کافی کام کر لیا تھا۔ اب اگلے دن جنریٹر آنا تھا اور اس کے بعد مشینوں کی تنصیب کا باقی کام مکمل ہونا تھا۔ تیسرا دن انہوں نے مشینوں کو چالو کرنے اور ٹیسٹ کرنے کے لیے رکھا تھا۔ ریشم اور انور مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ شاہینہ اس وقت بھی چودھری صاحب کے پاس تھی۔ سلونی مجھے مہمان خانے کی طرف سے آتی ہوئی ملی۔ ''یہ کمپنی والے رات کو کام ختم کر کے واپس جانا چاہتے تھے۔ انور صاحب نے کہا کہ ابھی ڈیڑھ گھنٹے میں جاؤ گے اور صبح پھر ڈیڑھ گھنٹا لگے گا آنے میں... فون کر دو کمپنی میں اور گھر پر کہ ہم رات کو یہاں قیام کریں گے۔ انہیں یہ بات ٹھیک لگی۔ اب مہمان خانے میں جگہ کا انتظام کر دیا ہے... آپ کا کام ہو گیا؟''

''ہاں، وہ کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا۔ یہ دونوں کہاں ہیں... انور اور ریشم؟''

''ابھی تو یہیں تھے۔ شاید پیچھے باغ میں ہوں گے۔ آپ فریش ہو جائیں سر تو میں کھانا لگواتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک گزارش ہے تم سے۔''

''آپ حکم دیں سر۔'' سلونی نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''نہ مجھے سر کہلانا اچھا لگتا ہے اور نہ جناب عالی... میں تمہاری طرح عام آدمی ہوں... صرف نام کافی ہے۔''

''میں کوشش کروں گی سر... دراصل عادت نہیں ہے۔''

''ہو جائے گی۔'' میں نے کہا اور حویلی کے پیچھے باغ میں جانے کے لیے آخری برآمدے میں بائیں طرف کے دروازے سے نکل گیا۔ رات کے نو بجے تھے اور باغ میں اندھیرا ہی تھا لیکن بارھویں تیرھویں شب کے چاند نے گھنے درختوں کے بیچ میں خالی جگہ سے اپنی روشنی پھیلا دی تھی۔ اس سے گھپ اندھیرا کسی حد تک دھندلکے میں ڈھل گیا تھا جس میں میری آنکھیں دور تک دیکھ سکتی تھیں۔ انور اور ریشم مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اخلاقاً مجھے ان کی پرائیویسی سے دور ہی رہنا چاہیے تھا لیکن ایک شک کی تصدیق کے خیال نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی وہ راہِ عشق کی مسافت پر کچوے کی طرح رینگنے کے بجائے خرگوش کی طرح جست لگاتے ایک دوسرے کے لیے پیار اور وارفتگی کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں یا ہنوز سفر میں ہیں۔ ایک جگہ مجھے کچھ حرکت محسوس ہوئی اور میں نے غور سے دیکھا تو دو سائے متحرک نظر آئے۔ وہ ضرور آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ پھر کسی بات پر ریشم کھلکھلا کے ہنسی۔ کچھ اور آگے جا کے میں نے دیکھ لیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے چل رہے ہیں۔ اب باغ کی آخری حد آ گئی تھی اور وہ حویلی کی طرف پلٹ گئے۔ اس مرحلے پر میں نے بہتر سمجھا کہ میں بھی خاموشی سے واپس چلا جاؤں۔ ان کے اور قریب جانا معیوب بات تھی اور انہیں میری موجودگی کا پتا چل جاتا تو یہ زیادہ بری اور غیر اخلاقی بات ہوتی۔ جو میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ میری آنکھوں نے دیکھ لیا تھا۔ شک و شبے کی اب کوئی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں شدت سے اور بڑی تیز رفتاری سے گرفتار ہو چکے تھے۔ یہ ایک آفاقی سچائی کا مشاہدہ تھا۔ کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ نگری نگری پھرا مسافر... مگر دل ٹھہرا تو کہاں... ایک گمنام گاؤں مراداں والی کی گمنام اور کم حیثیت لڑکی پر... عشق نہ دیکھے دیس، قبیلہ، عشق نہ پچھے ذاتاں... اور عشق کوئی کام نہیں کہ کوئی اپنی ضرورت یا فرصت میں وقت اور مقام دیکھ کے عقل و ہوش سے کرے... یہ تو ایسے ہی ہوتا ہے جیسے جان لیوا کینسر کے نہ احتیاط کام آتی ہے نہ علاج... یہ ایسا ہی ہے اور ایسا ہی رہے گا۔

انہوں نے مجھے حویلی کی پچھلی طرف دروازے کے قریب دیکھا۔ ''تم کب آئے؟'' انور نے اخلاقاً پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے... سلونی نے کہا کھانا لگوا رہی ہوں تو میں نے سوچا تمہیں بھی بلا لوں۔''

''میں ذرا ریشم کو اپنے پائیں باغ کی سیر کرا رہا تھا۔ یہی کہیں گے نا اسے۔'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ''لیکن باغ کی طرح اس میں گل بوٹے نہیں ہیں... بس پھل دار درخت ہیں... پھل بھی ان کا شوق سے کوئی نہیں کھاتا۔''

کھانے کی میز پر بھابی شاہینہ کی موجودگی میرے لیے اب زیادہ حیرانی کا سبب نہیں بنی۔ حیرت مجھے بڑے چودھری صاحب کو دیکھ کر ہوئی۔ وہ نہ صرف خوش اور مطمئن تھے بلکہ کسی طرح سے بھی بیمار نظر نہ آتے تھے۔ یہ اچھی علامت تھی۔ اس کا سبب پوچھنا لاحاصل ہوتا لیکن انور کی ماں بڑی چودھرائن کے نہ آنے پر میں نے پوچھ لیا۔

''کیا... بڑی

انور نے فوراً نارمل لہجے میں کہا۔ ''وہ کھا چکی ہیں۔ اکبر کے ساتھ... تم شروع کرو۔''

بڑے چودھری اور شاہینہ بھابی کی خوشی کا سبب واضح ہو گیا تھا۔ میں اس پر کوئی تبصرہ کیوں کرتا۔ صاف ظاہر تھا کہ آج دن میں کسی وقت انور نے ماں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کھانا اپنے بیٹے اکبر کے ساتھ کھا سکتی ہیں۔ بڑے چودھری کی موجودگی ایک طرح سے مفاہمت اور صلح جوئی کی اس کوشش کی حوصلہ افزائی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک بے نام سی شرمساری کا عکس بھی نظر آتا تھا۔ وہ ہمیشہ سب کے سامنے سربلند رہے تھے۔ اپنا خاندان ہو یا اپنی رعایا... سب ان کے تابع تھا اور صحیح وہی تھا جو وہ کہیں یا کریں۔ شاید ان کے لیے ڈوب مرنا زیادہ آسان ہوتا... اپنے کیے پر شرمندگی کا اظہار کرنا یا کسی سے معافی مانگنا ان کی فطرت قبول نہ کرتی۔

بھابی اسے اپنی کامیابی کی منزل کی طرف بڑی پیش رفت سمجھ رہی تھی اور اس کا یہ امید رکھنا حق بجانب لگتا تھا کہ اگلے مرحلے میں یعنی مستقبل قریب میں انصاف پسند بھائی جی کا دل اس سہاگن کے لیے موم ہو جائے گا جو بیوہ جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ شاید اس کے نزدیک دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے کا مرحلہ اتنا دشوار بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اس کے شوہر کے مقابلے میں انور بے وقوفی کی حد تک رحم دل تھا۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ انور نے حکمرانی نہیں کی تھی، وہ علم کی دولت سمیٹتا رہا تھا جو یہاں بے مصرف تھی۔ کم سے کم وہ ایسا ضرور سمجھتی ہو گی۔ اس کے ظاہری روپ سے اندازہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ اس ظاہری معصوم چہرے کی طفلانہ مسکراہٹ کے پیچھے کیسے انتقامی جذبات کا کیسا آتش فشاں سویا ہوا ہے۔ دنیا کے بہت سے سرسبز و شاداب گل پوش یا برف پوش آتش فشاں ایسے ہیں جن سے کسی پیشگی وارننگ کے بغیر آگ کا دریا بہنے لگتا ہے تو ہنستی بستی آبادیاں راتوں رات خاکستر ہو کے لاوے کی بے رحم تہ کے نیچے قبرستانوں میں بدل جاتی ہیں۔ عورت کی فطرت کی عیاری و مکاری اور انتقامی فطرت کی کہانیاں میں نے بہت سنی تھیں جو زیادہ تر مردوں کے تعصب کی پیداوار لگتی تھیں کیونکہ عورت کو میں نے ماں، بہن اور بیوی یا بہن کے روپ میں صرف محبت اور بے غرضی اور قربانی کا پیکر دیکھا تھا۔ لیکن جو مشہور تھا، سو فیصد جھوٹ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ شاہینہ وہ عورت تھی جو انتقام کی آرزو میں زہریلی ی انور کے

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ جنوری 2014ء کی جھلکیاں

سفر مزاج

ایک انتہائی اہم شخصیت کی زندگی کے عروج و زوال کی دلچسپ روداد جو خود میں بھرپور سبق ہے

جاپانی ہنری فورڈ

غربت سے امارت تک پہنچنے والے کی روداد جس نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا

مروہ کا مجنوں

لیلیٰ مجنوں کی داستان سے زیادہ اہم داستانِ عشق، مروہ کے مجنوں کی کتھا

سلطانہ بیگم

انا کے خول میں بند عورت کا قصہ جو بہو اور بیٹی میں فرق کرنے کی عادی تھی

اس کے علاوہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی داستان ''سراب'' فلمی دنیا کا ماضی و حال ''فلمی الف لیلہ'' اور بہت سی دلچسپ تحریریں جنہیں آپ پسند کریں گے جنہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ مجھے اور ریشم کو بھی ڈس سکتی تھی۔

ایک بار پھر شاہینہ نے مجھے یاد دلایا۔ ''ملک صاحب! آپ کو یاد ہے نا، کل والد صاحب تشریف لا رہے ہیں آپ سے ملاقات کے لیے۔''

دونوں خطابات نے مجھے حیران کیا۔ ملک صاحب اور والد صاحب... یہ اندازِ تخاطب سراسر منافقت کا آئینہ دار تھا۔ شاید خود انور اور بڑے چودھری صاحب کو بھی اس پر کچھ حیرانی ہوئی۔ انور نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا مگر بڑے چودھری صاحب کی نظر اپنی بہو پر سوالیہ انداز میں ٹھہر گئی۔

میں نے کہا۔ ''جی مجھے یاد ہے۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔''

''میں نے اس لیے کہا کہ آپ اپنی مصروفیت میں بھول نہ جائیں۔''

انور نے لہجے سے طنز یا تمسخر کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ''تایا جی... ان کے نام کے ساتھ عقیدت مند بہت سے القاب و آداب استعمال کرتے ہیں لیکن میں تو بچپن سے انہیں تایا جی کہنے کا عادی ہوں۔ بڑے پہنچے ہوئے پیر مانے جاتے ہیں۔ گرد و نواح میں ان کے بہت عقیدت مند ہیں جو ان کے پاس دعائے خیر اور حاجت روائی کے لیے آتے رہتے ہیں۔''

بڑے چودھری نے کہا۔ ''ہاں، اب وہ پیر و مرشد ہو گئے ہیں۔''

سسر کے لہجے میں کچھ تمسخر اور کچھ طنز کا عنصر بہو کو پسند نہیں آیا۔ ''آپ تو جانتے ہیں ابا جی... ان کا مزاج شروع سے ایسا ہی ہے، صوفیانہ... دنیاداری میں کبھی نہیں پڑے... لوگوں کا اعتقاد ہے۔''

''چھوٹے بھائی کے لیے تو کبھی کچھ نہیں کیا۔''

بہو کا لہجہ زیادہ جارحانہ ہو گیا۔ ''اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے آپ کو ابا جی... کسی اور کے لیے وہ کیا کرتے ہیں دعا کے سوا اور لیتے کچھ نہیں۔''

''ملک سلیم اختر! تجھے ہے ضرورت دعاؤں کی... اور پیاسا جاتا ہے کنوئیں کے پاس... تجھے خود حاضر ہونا چاہیے پیر صاحب کی خدمت میں۔'' بڑے چودھری نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''جی میں ضرور جاتا لیکن وہ یہاں بڑے بھائی کی حیثیت سے آ رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت کا حال پوچھنے۔''

انور نے کہا۔ ''مجھے تو کل جانا ہے ایک ضروری کام سے شہر۔''

بھابی نے کہا۔ ''آخر ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا ہے بھائی جی؟''

''اب تمہیں کیا بتاؤں بھابی جی... آج ملک ورکشاپ گیا تھا۔ ایک تو انہوں نے مانگے ہیں پانچ لاکھ روپے... لیکن اصل بات یہ ہے کہ ایک مہینا لگے گا تو اتنا عرصہ ہم کیا انہی دو گاڑیوں سے گزارہ کریں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو نئی گاڑی دے دیتے ہیں۔ پرانی گاڑی کی قیمت ہم بعد میں ایڈجسٹ کر لیں گے... مرمت کے بعد... کیا ملک نئی کی کچھ قیمت بتاتی تھی انہوں نے؟ اور گاڑی کون سی دیں گے؟''

میں سمجھ گیا تھا کہ انور کو تایا جی کے سامنے جانا منظور نہیں۔ ان کی نیت کچھ بھی ہو، انور کو ان کی دوسری بیٹی کے لیے انکار کا مرحلہ بھی تھا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں پیر صاحب یہ بات نہ چھیڑ دیں۔ دوسرا ناپسندیدہ موضوع ان کے داماد اکبر کے لیے رعایت حاصل کرنے کا ہو سکتا تھا۔ اگر وہ عفو و درگزر کے موضوع پر خطبہ شروع کر دیتے تو انور کے لیے نہ انکار کا راستہ ہوتا نہ اقرار کا... کام کو بہانہ بنا کے فرار میں ہی عافیت تھی۔ میں نے اسے سپورٹ کیا۔ ''گاڑیاں کئی تھیں مگر میں کیا فیصلہ کرتا... میں نے کہا کہ کل چودھری انور صاحب خود آ کے طے کریں گے۔''

کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی بڑے چودھری صاحب اٹھ گئے۔ آخر میں ہم بھی اٹھے۔ انور میرے ساتھ آ گیا۔ اس نے برتن سمیٹنے والے ملازم کو کافی کے لیے کہہ دیا تھا۔ ریشم نے مجھ پر بہت سے انکشافات کیے تھے۔ یہ خاندان کے اندر کی سیاست تھی جس میں ماضی کی تاریخ کے خونی اوراق تھے تو مستقبل کی تاریخ میں بھی ہوس کی قربان گاہ پر بھی بہت سے بے گناہ سر دکھائی دیتے تھے۔ اگر میں انور سے کہتا کہ کیا ملک پر حکمرانوں کی تخت نشینی کا قصہ ایسی چھوٹی چھوٹی جاگیروں پر قبضے کے لیے ہمیشہ ایسے ہی ہر جگہ دہرایا جاتا رہے گا؟

انور نے کہا۔ ''تو کیوں چپ ہے ملک؟''

میں چونکا۔ ''ایسے ہی... میں ابھی خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا... اب کل پیر صاحب بھی مجھ سے میرا شجرۂ نسب پوچھیں گے۔ حوالے مانگیں گے۔ یہاں شناختی کارڈ کی کیا حیثیت ہے۔ بندہ خاندانی ہو تو اس کا خاندان بھی ہو۔''

''تو ان...

مریخ کی مخلوق ہوں۔ آسمان سے اترا ہوں۔'' وہ ہنسا۔

''کچھ بھی کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے کہا۔

دروازے کی سائڈ سے ناک کر کے راجا ریاست نے پوچھا۔ ''میں حاضر ہو سکتا ہوں؟''

''آیئے آیئے راجا صاحب۔'' انور بولا۔

وہ ہمارے ساتھ سائڈ والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ''میں نے مداخلت تو نہیں کی؟''

''بالکل نہیں، ہم کھانا کھا کے ذرا گپ لگانے بیٹھے تھے۔ آپ بتایئے کوئی تکلیف تو نہیں ہے مہمان خانے میں؟''

وہ مسکرایا۔ ''تکلیف؟ آپ شرمندہ کرتے ہیں سر... ہمیں تو لگتا ہے کہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ اس دور افتادہ گاؤں میں ایسی خاطر مدارات اور سہولتوں کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

وہ کچھ دیر بیٹھا انور کی سعادت مندی کو سراہتا رہا جس نے باپ کے علاج کے لیے پیسا پانی کی طرح بہا کر ناممکن کو ممکن کر دیا تھا اور اسی جگہ مکمل علاج اور دیکھ بھال کی سہولت فراہم کر دی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک کارڈیالوجسٹ اور ایک ٹرینڈ نرس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے جو دن رات یہیں رہیں گے تو وہ بڑا متاثر ہوا۔

پھر ایک خادم نے آ کے بڑے چودھری صاحب کا پیغام دیا۔ وہ انور کو بلا رہے تھے۔ وہ کافی ختم کر کے چلا گیا۔ راجا ریاست پھر بھی بیٹھا رہا۔ پھر مجھے جس بات کا اندیشہ تھا اس نے وہی کی۔

''ملک صاحب! ذرا نجی طور پر آپ سے ہی بات کرنا چاہتا تھا۔''

میں نے محتاط ہو کے کہا۔ ''کہیے۔''

وہ بولا۔ ''مجھے معذرت کرنی تھی آپ سے... اس دن میں نے جو بات کی، وہ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔''

''آپ نے سکھر جیل کا ایک بندہ کہا تھا مجھے...'' میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ بولا۔ ''صورت کی مشابہت سے مجھے ایسا لگا تھا۔''

''بس اتنی ہی بات تھی؟'' میں نے کہا۔

وہ کچھ تذبذب کے ساتھ بولا۔ ''شاید اتنی ہی بات نہیں تھی۔ مجھے... یہ شبہ ہوا... کہ آپ نے بھی پہچان لیا تھا مجھے...''

نہیں کہی

کیا آپ شوگر موزی مرض سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکرمند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھوکھلا کمزور بے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔ خدارا ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون اوقات

صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک

عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ... دراصل... آپ چونکے تھے مجھے دیکھ کر... آپ کو احساس نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے لیے آپ کے قدم رکے تھے۔ یہ بالکل لاشعوری ردِعمل تھا پھر آپ سنبھل گئے۔ کیا یہ بھی غلط فہمی تھی میری؟"

"یعنی تم نے یقین نہیں کیا تھا میری بات کا... اب کیا کرنا چاہیے مجھے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے؟" میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔ "اس دن... یعنی پرسوں... آپ کمپنی کے آفس سے کہاں گئے تھے؟"

میں نے خفگی سے کہا۔ "یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے معلوم ہے... آپ شناختی کارڈ کے آفس گئے تھے... اپنا شناختی کارڈ بنوانے۔"

میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہونے لگا مگر میں نے اعتماد میں فرق نہیں آنے دیا۔ "کیا مطلب؟ تم جاسوسی کر رہے تھے میری؟ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے؟"

وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "آپ نے ایک نیا شناختی کارڈ بنوایا ہے؟"

"ہاں... پرانا کھو گیا تھا۔"

"جی نہیں... پرانا کھو جائے تو نئے پر وہی نمبر آتا ہے جو پہلے تھا۔ تاریخ اجرا نئی ہوتی ہے... اس کے لیے کوئی ایجنٹ کو رشوت نہیں دیتا اور وہ تو ہے ہی بدنام ایسے کاموں کے لیے۔" وہ اب زیادہ بے خوفی سے بات کر رہا تھا۔

"اٹھو۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "اور نکل جاؤ میرے کمرے سے... ورنہ میں خود تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔"

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے فرید... میرا مطلب ہے ملک سلیم صاحب۔"

میرے سامنے جیسے بم پھٹ گیا۔ اس نے دانستہ میرا جیل کا نام لیا تھا۔ اسے نام یاد آ گیا تھا اور وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ میں اس اچانک پیدا ہونے والی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بلاشبہ میں چیختا دھاڑتا اور اسے دھکے دے کر نکالتا تو شور سب سنتے... انور علی کے ساتھ بڑے چودھری صاحب بھی متوجہ ہوتے۔

"اتفاق یہ ہے کہ اسی ایجنٹ سے میں نے ایک جعلی شناختی کارڈ بنوایا تھا، چھ مہینے پہلے... اور میں نے تعاقب نہیں کیا تھا آپ کا... اگلے دن یعنی کل... وہ ایجنٹ نظر آ گیا مجھے... اور میں نے اس سے پوچھ لیا کہ کیسا چل رہا ہے کاروبار... اور اس سے پوچھا کہ حال ہی میں کسی نے ملک سلیم اختر کے نام سے شناختی کارڈ حاصل کیا ہے؟ وہ بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ کارڈ بنوانے وہ میرے پاس ہی آیا تھا کل... آج کارڈ لینے آئے گا۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس کا نام پہلے فرید تھا نا... وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا کہ ہاں فریدالدین تھا۔ یہ تم کیسے جانتے ہو... میں نے ہنس کے ٹال دیا کہ بیٹا ہم بھی بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ دراصل اس کمپنی میں ملازمت ملنے سے پہلے میں نے بہت دھکے کھائے۔ بہت سے غلط کام بھی کیے۔ ایک بندے کو شناختی کارڈ کی ضرورت تھی۔ مجھے اس ایجنٹ کا پتا چلا تو میں نے کہا کہ میں گاہک لاتا ہوں... مجھے کیا دو گے۔ اس نے دو کہے... میں نے پانچ... چار پر بات ہو گئی۔ جان پہچان کی وجہ یہی تھی۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بند گلی میں محصور ہو گیا ہوں۔ راستہ نہ آگے تھا اور نہ پیچھے... انکار ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ جواب تک شکل کی وجہ سے خوف کی بات تھی، اب وہ خطرہ بن کے سامنے آ گئی تھی اور میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس مشکل سے نجات کے دو ہی راستے تھے۔ یا میں فرار ہو جاؤں یا مجھے پہچان لینے والے کو قتل کر دوں... یا میں نہ رہوں یا وہ نہ رہے... لیکن یہ دونوں راستے بھی بند تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ اب تیسرا اور آخری راستہ اعتراف کے بعد یہ پوچھنے کا تھا کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے اور رازداری کا معاہدہ کن شرائط پر ممکن ہے۔ میں نے اٹھ کے دروازہ بند کیا تو وہ چوکنا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "ڈرو نہیں... میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ ہماری باتیں کوئی بھی سنے۔"

"یہ میں بھی نہیں چاہتا۔" اس نے مطمئن ہو کے سر ہلایا۔

میں پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "اب اگر میں تم سے ایک سوال کروں۔"

وہ بولا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ سوال کیا ہوگا۔ تم پوچھو گے کہ میں سکھر جیل میں کیوں تھا؟"

"اگر تم اعتماد کرو گے تو میں بھی یہ رسک لوں گا۔"

وہ بولا۔ "رسک ہے تو دونوں کے لیے... اس لیے میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔ سچ سچ اور تفصیل سے... کہانی ذرا لمبی ہے۔"

"فکر مت کرو... مجھے سونے کی جلدی نہیں رات بہت لمبی ہے

☆☆☆

"میرا اصل نام سعادت یار خان ہے جیسے تمہارا چودھری فریدالدین ہے۔ میں نے نام ہی نہیں چہرہ بھی بدلا ہے ورنہ تم بہ آسانی مجھے پہچان لیتے۔ کچھ لوگ جن میں شاید میں بھی شامل ہوں... آواز کو لاشعور میں محفوظ کر لیتے ہیں اور برسوں بعد بھی آواز سن کے بندے کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ صلاحیت تم میں نہیں ہے۔ چھ سات مہینے پہلے میں سکھر جیل میں تھا اور وہاں یہ وقت میں نے جوڈیشل ریمانڈ پر گزارا تھا۔ اس وقت میری اور تمہاری جان پہچان ہوئی تھی۔ تمہارے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو... کسی کی دشمنی نے تمہیں وہاں پہنچایا ہے اور دشمن اتنا طاقتور ہے کہ ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس طاقتور دشمن کا نام نادر شاہ ہے تو مجھے کچھ حیرانی اور دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ اس کے ایک دو کارندے جیل کاٹ رہے تھے۔ اب پتا نہیں ان کا قصور کیا تھا۔ وہ جیل کے اندر خود کو محفوظ سمجھنے لگے تھے کہ مار دیے گئے... ایک پر الزام آیا کہ وہ فرار کی کوشش میں مارا گیا جبکہ اسے سلاخوں کے پیچھے کوٹھری میں گولی ماری گئی تھی۔ دوسرے کی جیل کے اندر لڑائی میں ہلاکت دکھائی گئی۔ وہ جرائم پیشہ پہلے سے تھے اور کسی طرح نادر شاہ کے گروہ تک پہنچ گئے تھے۔ اس قسم کے ہر جرائم پیشہ گروہ میں کام کرنے والے عموماً بدترین حالات میں پرورش پانے والے... جاہل اور جرائم میں ملوث نوجوان ہوتے ہیں... کسی مہذب اور تعلیم یافتہ آدمی کا ایسے گروہ میں کیا کام... ظلم اور تشدد تم پر بھی بہت ہوتا تھا۔ یہی خیال مجھے تمہاری طرف لے گیا اور میں نے موقع پا کے تم سے بات کی تھی اور تفصیل سے تو نہیں لیکن تم نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم پر نادر شاہ نے اپنے ہی بھائی کے قتل کا کیس کھڑا کیا اور اب وہی تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے اپنا اثر رسوخ استعمال کر رہا ہے۔ تم نے ہائی کورٹ میں تو اپیل کی تھی مگر وہ مسترد ہو گئی تو تم نے آگے سپریم کورٹ میں اپیل نہیں کی تھی۔ ایک تو تم مایوس تھے کہ وہاں بھی فیصلہ یہی ہوگا۔ عدالت ثبوت اور شہادت دیکھتی ہے، کسی کے دل میں نہیں دیکھ سکتی۔ دوسرے تمہارے پاس وسائل نہیں تھے کہ بڑا وکیل کر سکو۔ اگر قواعد کے مطابق تمہیں سرکاری وکیلِ صفائی فراہم کیا جاتا تو وہ محض رسمی کارروائی ہوتی اور وہ بس ری زندگی

جواری

"ظاہر ہے اس کے بعد تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تقریباً ایسی ہی کہانی میری ہے۔ میں جرم محبت کی پاداش میں سولی پر چڑھایا جا رہا تھا۔ لیلیٰ کے لیے مجنوں نے جان دی تو تاریخ بن گئی، فلمیں بن گئیں... انارکلی کو سزائے موت دی گئی تو مغلِ اعظم میں دلیپ کمار چلّا چلّا کے گاتا رہا... اے محبت زندہ باد... فرہاد بھی شہیدِ محبت... لیکن کلثوم کے عشق کے جرم کی سزا سعدی کو مل رہی ہے تو یہ انصاف ہو رہا ہے؟ نام تو سعادت تھا میرا لیکن یار دوستوں میں سعدی تھا۔ بعض شیخ سعدی بھی کہہ دیتے تھے کیونکہ میں واقعی کچھ نیک اور شریف تھا ان کے مقابلے میں اور انہیں برائی سے روکتا بھی تھا۔ کلثوم وہ لڑکی تھی جس سے محبت کرنا میرا جرم بنا۔

"اب یہ محبت کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ یہ الگ کہانی ہے اور ہر محبت جیسی کہانی ہے... جو کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے... قدرت حالات پیدا کر دیتی ہے اور کوئی بھی بات بہانہ بن جاتی ہے۔ ہمارے ملک کا عجب حال ہے... اگر کوئی الیکٹرک انجینئر بن جائے تو وہ صرف الیکٹریشن بن سکتا ہے وہ الیکٹریشن جو کسی سرٹیفکیٹ، ڈپلوما یا ٹریننگ کے بغیر سوئچ لگاتے لگاتے پوری فٹنگ اور ریپیئر سیکھ لیتا ہے۔ یہی آٹو موبائل انجینئر کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان سے وہ استاد برتر جو بیس تیس سال کا تجربہ رکھتے ہیں۔ تیل گریس میں فرش پر لیٹ کر گاڑیاں ٹھیک کر لیتے ہیں... بس میں بھی چکر میں تھا کہ اب الیکٹریکل انجینئرنگ کی کتابوں کے علم کا استعمال کہاں کروں... ایک حوالے سے مجھے کلثوم کی ٹیوشن مل گئی جو انٹر سائنس کا امتحان دے رہی تھی مگر سائنس میں کمزور تھی۔ بتانے والے نے تو صرف یہ کہا کہ وہ انجینئر ہے۔ وہ انٹر کی فزکس کیمسٹری تو میں بھول گیا تھا مگر میں نے دوبارہ دیکھ لی اور پڑھانا شروع کر دیا۔ پانچ ہزار فی مضمون کے حساب سے دس تھے جو بڑھ کر پندرہ ہو گئے کیونکہ دھی رانی کی انگریزی بھی مسئلہ تھی... خود مجھے انگریزی ہمیشہ مسئلہ رہی مگر میں نے کہا کہ جناب پڑھا دوں گا... ہر مضمون میں کامیابی اعلیٰ نمبروں سے ہوگی۔

"اس کے بعد اللہ بھلا کرے آپ کا... عشق تو ہونا ہی تھا۔ پہلے نگرانی سخت تھی۔ پھر یہ دیکھ کر سعادت یار خان تو واقعی شیخ سعدی ہے، پہرے داری کم ہو گئی۔ چائے اور خاطر تواضع ان کا وتیرہ تھا۔ میرا تو اس کی طرف نظر بھر کے دیکھنے سے برا حال ہوتا تھا لیکن وہ تھی ہی اتنی خوب صورت کہ نظر اٹھتی تھی تو ٹھہر جاتی تھی۔ پہل اس کی طرف سے ہوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور چرمر کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ یہ کاپی اس نے دوبارہ بنائی اور پھر پوری فوٹو اسٹیٹ کاپی بنا کے پاسپورٹ مجھے واپس کردیا۔

''بس یہی حد تھی میری خوش قسمتی کی۔ اس کے آگے بدقسمتی تھی۔ مجھے فوٹو اسٹیٹ کرنے والے کے سوال سے اس کی نیت کا کیا اندازہ ہوسکتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کمینہ کسی زمانے میں کلثوم کے باپ کا ڈرائیور تھا اور دس سال رہا۔ بڑی وفاداری سے خدمت کرتا رہا۔ کلثوم کو اسکول بھی لاتا لے جاتا رہا اور کچھ عرصہ کالج بھی۔ پھر کلثوم نے ضد کر کے باپ سے ایک نئی چھوٹی سی مہران لے لی اور خود ڈرائیو کرنے لگی۔ اس شخص کے بھائی کی فوٹو اسٹیٹ اور اسٹیشنری کی دکان تھی۔ ایک دن وہ دکان پر تھا کہ نہ جانے کدھر سے گولی آئی اور اس کے سر میں اتر گئی۔ سڑک پر فائرنگ ہوئی تھی۔ نشانہ وہ بھی بن گیا۔ اس کا گھر اسی آمدنی سے چلتا تھا۔ پیچھے رہ گئی ایک بیوی اور دو چھوٹے بچے۔ اکیلی وہ کیسے رہتی۔ اس بھائی نے ہی بھابی سے شادی کی اور اس کے دونوں بچوں کا باپ بن گیا۔ اس نے ڈرائیوری چھوڑ دی اور دکان پر بیٹھنے لگا۔

''اس خبیث نے میرے جاتے ہی کلثوم کے پاسپورٹ والا صفحہ اٹھایا اور اس کے باپ کو پہنچا دیا کہ یہ تو ہو بہو اپنی کلثوم بی بی لگتی ہے مجھے۔ کلثوم کا باپ جدی پشتی وڈیرا اور بڑے اثر رسوخ والا آدمی تھا جس کے خاندان میں جرم محبت کی سزا صرف موت ہے۔ باپ، چچا یا بھائی ایسی لڑکی کو عزت کے نام پر خود مار کے تھانے میں حاضر ہو جاتا ہے اور ان کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ تھانے میں ان کی غیرت مندی کو سراہنے والے انہیں بچا لیتے ہیں۔ ایسے حالات میں کلثوم نے جان ہتھیلی پر رکھ کے مجھ سے محبت کی۔ کون کہتا ہے کہ عورت ذات کمزور یا بزدل ہوتی ہے۔ وہ جب دل لگاتی ہیں تو ہم مردوں سے زیادہ دلیر ثابت ہوتی ہیں۔ کچے گھڑے پر طوفانی رات میں سیلابی دریا عبور کرنے اتر جاتی ہیں۔ وہ میرے بارے میں تو کچھ بھی نہ بتا سکا اور پاسپورٹ شناختی کارڈ کے پتے پر بھی میرا سراغ نہ ملا۔ یہ بھی بہت بچایا ہمیں خدا نے ورنہ آج آپ کو یہ سب بتانے کے لیے زندہ ہی کہاں ہوتا۔ میری ہڈیاں پڑی ہوتیں کسی نامعلوم مدفن میں۔ اس نے کلثوم سے پوچھ گچھ کی تو اس نے حلف اٹھا کے کہہ دیا کہ وہ کیا جانے یہ فیض وقاص کون ہے۔ اور وہ کیسے کسی کی بیوی ہوگئی، محض صورت کی مشابہت پر جس کا پاسپورٹ بھی موجود ہے۔ اس کے اثر رسوخ والے باپ نے اِدھر اُدھر اپنے بہت جاسوس چھوڑے مگر وہ میرا سراغ لگانے سے قاصر رہے۔ کلثوم نے کسی ذریعے سے مجھے خبردار کرا دیا کہ میں غائب ہو جاؤں ورنہ مارا جاؤں گا اور اب زندگی رہی تو میں خود تم سے آملوں گی ورنہ خدا حافظ۔ میں نکل گیا دبئی اور کئی مہینے اپنے بھائی کے پاس رہا۔ کلثوم سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ میں نے وہاں ملازمت بھی کرلی مگر کلثوم کو نہ بھلا سکا۔ اس کے باپ نے میری تلاش میں ناکامی کے بعد دوسرا پکا کام یہ کیا کہ فٹافٹ بیٹی کو بیاہ کے رخصت کردیا۔ رشتہ تو اس کا روایت کے مطابق بچپن ہی سے ملے تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی رو پیٹ کے اور صبر کر کے بیٹھ گئی۔ جب مجھے پتا چلا تو اس واقعے کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ میں نے بھی صبر کیا لیکن ٹریجڈی پوری نہیں ہوئی تھی۔

''ایک دن میں کسی دوست سے ملنے گیا تھا۔ اس سے اگلے دن میں کراچی چلا جاتا اور وہاں سے دبئی۔ وہ ہنگاموں کا دور تھا۔ نہ جانے کس معاملے میں گھنٹا گھر سے آگے احتجاج ہو رہا تھا۔ ایک طرف مظاہرین نعرے لگا رہے تھے اور پتھراؤ کر رہے تھے۔ دوسری طرف سے پولیس نے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پکڑ شیلنگ... لوگ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے۔ میں بھی اپنی جان ایک شیل سے بچانے کے لیے بھاگا جو میرے قریب آ کے گرا تھا۔ کسی پولیس مین نے گھما کے میرے سر پر لاٹھی ماری اور مجھے پکڑ لیا۔ ایسے موقع پر یہی ہوتا ہے۔ ہنگامہ کرانے والے بھاگ جاتے ہیں۔ تماشا دیکھنے والے پکڑے جاتے ہیں۔ پولیس کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے نفری پوری کرنی ہوتی ہے کہ یہ موقع واردات سے پکڑے گئے مجرم ہیں۔ میں بھی حوالات میں پہنچ گیا جہاں میرے جیسے سب ہی اپنی بے گناہی کا رونا رو رہے تھے۔ اب میری شامتِ اعمال کہ ان میں وہ فوٹو شاپ والا بھی موجود تھا۔ میں تو اسے نہیں پہچان سکا مگر اس نے مجھے پہچان لیا اور کلثوم کے باپ کو فون بھی کردیا۔ وہ آیا اور اس نے اپنے بندے کو تو چھڑا لیا اور مجھے تاڑ لیا۔ رات بھر میں ان کی آزادی کا سودا ہوتا رہا جن کے والی وارث آزادی کی قیمت دے سکتے تھے۔ جو گنے چنے لاوارث بدقسمت رہ گئے، ان میں ایک میں بھی تھا۔ حوالات میں چند لوگ بیٹھے تھے، کچھ مجرم اور کچھ ناکردہ گناہ کے اسی روز شہر میں ڈکیتی کی ایک واردات ہوئی تھی جسے پولیس نے ناکام بنا گئے تھے اور ایک

کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بھی حوالات میں آرام کر رہا تھا۔ پولیس نے اس کی مرہم پٹی کرا دی تھی اور وہ مزے سے کھا پی بھی رہا تھا۔ کلثوم کے باپ کے کہنے پر میرے خلاف جو پرچہ کاٹا گیا، اس میں مجھے ان ڈاکوؤں کا ساتھی بنا دیا گیا اور لکھا یہ گیا کہ میری نشاندہی اس زخمی ڈاکو نے تفتیش کے دوران کی اور اپنے دیگر ساتھیوں کے نام بتائے۔ اب تک میں نے صرف سنا تھا پھر دیکھا اور بھگتا کہ پولیس کیسے کیس بناتی اور بگاڑتی ہے۔ پولیس نے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کے بڑی اچھی کہانی بنائی اور مجھے بھی بینک ڈکیتی میں مجرم ثابت کر دیا۔

''اگلے دن مجھے نیم مردہ حالت میں اٹھا کے انچارج کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہاں میں نے کلثوم کے باپ کو دیکھا۔ اس نے کہا کہ ہاں یہی بندہ ہے اور مجھ سے میرا نام بھی پوچھا۔ میں نے اپنا اصل نام بتا دیا۔ اس کے جانے کے بعد انچارج نے افسوس سے سر ہلایا۔

''اوئے تو نے اس کی کڑی پھنسائی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! مجھے محبت تھی اس سے۔''

''اوئے تو اسے بھگا کے لے جاتا چاہتا تھا۔ دیکھ... ساری اسٹوری مجھے بتا دے سچ سچ۔ شاید میں تیری جان بچا لوں ورنہ یہ ناممکن ہے۔ یہ عزت دار بندہ ہے۔ ایسی باتیں تیری زبان سے نکلنا اس کے لیے بڑے شرم کی بات ہوگی اور اب تو وہ لڑکی بھی شادی شدہ ہے۔ اس کا شوہر پہلے اسے مارے گا پھر تجھے مارنے آجائے گا۔ ادھر حوالات میں ہی گولی مار کے چلا جائے گا۔''

''میں اس کے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہوگیا اور میں نے اسے اول تا آخر سب سچ بتا دیا۔ یہ بھی کہ کب کلثوم نے مجھے کتنے پیسے دیے تھے اور کتنا زیور میں نے کس کے ہاتھ بیچا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اعترافِ جرم نہیں کر رہا، اپنے ڈیتھ وارنٹ پر سائن کر رہا ہوں۔ میں جب حوالات پہنچایا گیا تو اس ڈاکو نے میری ساری بات سنی اور بہت افسوس کا اظہار کیا کہ یار تو بڑا بے وقوف ہے۔ مرنا تو ہے تجھے... یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو اپنی کلثوم کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی ہے تو نے... مشکل ہے کہ وہ بچے... بعد میں ایسا ہی ہوا۔ کلثوم کو اس کے شوہر نے شادی کے چھ ماہ بعد قتل کر دیا۔ بعد میں تھانے دار نے مجھ سے ایک معاہدہ کیا کہ میں کلثوم والا معاملہ دوبارہ اپنی زبان [illegible] سال [illegible] کو خطرہ

تھا کہ میں نے اپنے بھائی کو بتایا ہوگا۔ کلثوم کو لے کر میں دبئی ہی جاتا۔ اگر میں نے یہ بک دیا کہ مجھے کلثوم کے باپ نے محبت کے جرم کی سزا دلوائی ہے تو اس کی بدنامی بہرحال ہو گی۔ خواہ وہ مجھے مروا دے۔ مجھے یہ یقین بھی دلایا گیا کہ میری خاموشی کلثوم کی جان بچا سکتی ہے اور میں نے صرف اس لیے خاموشی اختیار کی اور ڈکیتی کا اعتراف کرلیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ بعد میں میری احمقانہ خاموشی سے کلثوم کو فائدہ نہیں ہوگا۔ بدقسمتی سے اس دن آپریشن فیجر جو اسپتال میں زیرِ علاج تھا، مر گیا۔ اب مجھے پتا ہی نہیں چلا اور ڈکیتی میں قتل کی فردِ جرم بھی شامل ہوگئی۔

''بس اس کے بعد سب بدل گیا۔ جو ایف آئی آر درج ہوئی اس کے واقعات اخبارات کی کہانی بن گئے۔

''مجھے سر پر کپڑا ڈال کے عدالت میں پیش کیا گیا تو جج نے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یہ تک نہیں پوچھا کہ ڈکیتی کی واردات میں گرفتار ہونے والا ڈاکو تو زخمی تھا۔ یہ تو دونوں ٹانگوں پر سیدھا چل کے آیا ہے۔

قصہ مختصر، سیشن کورٹ میں میرے خلاف جو مقدمات پیش ہوئے، اس میں مجھے عادی مجرم بتایا گیا جو پہلے سے فلاں فلاں وارداتوں میں مطلوب تھا۔ ان میں اقدامِ قتل، ڈکیتی اور اغوا برائے تاوان جیسے جرائم بھی شامل تھے۔ اس کے بعد مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں جو شکوک تھے، وہ سب رفع ہو چکے تھے۔ مجھے کلثوم کے باپ کے ایما پر اس شعبے میں سزائے موت دی جا رہی تھی کہ مجھ پر اس کی بیٹی کو ورغلانے کا الزام تھا۔ میں نے ٹیوٹر ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ کہانی بھی عام نہیں کی گئی تھی کیونکہ اس سے ایک عزت دار آدمی کی حیثیت پر حرف آتا تھا۔ تاہم کسی نہ کسی طرح اس کی بھنک کلثوم کے شوہر کے کانوں میں بھی پڑی۔ تھا وہ بھی اسی فرعونی نظام کا حصہ۔ اس نے کلثوم سے پوچھا۔ شک یا افواہ بے سبب نہیں ہوتی۔ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ کلثوم کی صفائی یا تردید کیا معنی رکھتی تھی۔ کاری قرار دے کر اسے بھی زیرِ خاک سلا دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں۔ یہ خبر مجھ تک پہنچائی گئی تاکہ مجھے اذیت یا عبرت ہو اور یہ بھی پتا چلے کہ میرا جرم کتنا سنگین اور ناقابلِ معافی تھا۔

''پہلے کلثوم کی بدنامی کے خیال نے مجھے لب نہ کھولنے پر مجبور کیے رکھا تھا۔ بعد میں یہ مجبوری نہ رہی، تب بھی فرق نہ پڑا۔ میں چلا چلا کے حقیقت کا ڈھنڈورا پیٹتا تو جیل کی دیواروں کے سوا کون سنتا۔ الٹا یہ ہوتا کہ سزائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

موت کے فیصلے سے قبل ہی موت آجاتی۔

''پھر اچانک وہ ہوا جسے میں معجزہ ہی کہوں گا۔ جیل میں ڈاکو بھی تھے جن کا تعلق کسی ایک گروہ سے تھا۔ ان کے سردار کا نام بھی عجیب تھا... گاما رستم۔ گاما تو غلام محمد سے بگڑ کے بنا تھا، رستم خوامخواہ ساتھ لگا لیا۔ ٹو ان ون۔ انہیں چھڑا کے لے جانے کے معاملات پر جیل انتظامیہ سے مذاکرات جاری تھے۔ تمام شرائط طے ہوگئیں تو ایک رات ڈاکوؤں کے گروہ نے جیل پر حملہ کیا۔ اسکرپٹ کے مطابق حفاظتی عملے نے مزاحمت کی مگر وہ دیوار توڑ کے اندر آئے اور اپنے تمام ساتھیوں کو نکال لے گئے۔ اندر سب کو معلوم تھا چنانچہ بہت سے قیدیوں نے ڈاکوؤں کی منت سماجت کر کے اپنے لیے بھی بات کرلی تھی۔ اندر والے سب جانتے ہیں کہ مجرم کون ہے اور بے گناہ کون۔ گاما رستم نے بھی ایک فہرست بنالی تھی کہ ان کی آزادی کی خوشی میں اور کون کون سے بے گناہ رہا کیے جائیں گے۔ ان سب کی ہتھکڑی اور کوٹھریوں کے تالے کھول دیے گئے تھے یا توڑ دیے گئے تھے۔ ڈاکوؤں کے ساتھ وہ بھی فرار ہوئے... میرا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ جب اصل لوگ طے شدہ پروگرام کے مطابق شمال کی طرف فرار ہوئے تو سیدھا یا جنوب کی طرف بھاگنے والوں پر فائرنگ کی گئی اور کافی لوگ مارے گئے یا پکڑے گئے۔ تاہم میں شمال کی طرف ہی نکلا تھا۔ تم بھی ادھر ہی نکلے ہو گے چودھری فرید الدین۔''

☆☆☆

جب وہ خاموش ہوا تو میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

''میں گاما رستم کے ساتھ تھا۔''

اس نے کہا۔ ''پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ اب وہ کہاں ہے؟''

''نہیں، لیکن تم ایسی بے خوفی سے اس کمپنی میں ملازمت کر رہے ہو۔ آخر تم نے اپنی شناخت کیسے بدلی؟''

''یہ آج کل کیا مشکل ہے۔ ایک تو یہ دیکھو۔'' اس نے سر کے اوپر سے وگ ہٹادی۔

میں نے حیرانی سے اس کے اصل بالوں کو دیکھا جو براؤن تھے اور گھنگرالے... وگ میں سیدھے گہرے سیاہ بال تھے جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی۔ ''ہاں، یہ تو آسان کام ہے۔''

اس نے آنکھوں پر سے کنٹیکٹ لینس اتارے۔ اس کی عام سیاہ آنکھیں نیچے سے ''بلی آنکھیں تھیں۔''

''میں یہ نہ کرتا تو پہچان سے کیسے بچتا۔ لیکن میں نے اور بھی بہت کچھ کیا۔ ایک تو یہ بیوٹی سیلون بہت مدد کرتے ہیں۔ پھر میک اپ آرٹسٹ جو ٹی وی کے ڈراموں میں جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان کرتے ہیں۔ میں بہت گورا تھا۔ اب کافی سانولا بن چکا ہوں۔ میری ناک کے پاس ایک مسا بہت نمایاں تھا۔ وہ جلا دیا گیا ہے۔ ایسے کہ نشان تک باقی نہیں۔ وہ میری شناخت کی علامت لکھا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر کام کرنے کے بعد مجھے اس کمپنی میں موقع ملا۔ کام تو مجھے آتا تھا مگر میرے پاس ڈگری نہیں تھی۔ جو تھی اس پر نام اصل لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک جعلساز کا معلوم کیا جو دستاویزات بنانے اور بدلنے کا ماہر تھا۔ وہ ڈگری تو نہیں بنا سکتا تھا مگر اس نے کمال مہارت سے اس پر میرا نام اور ولدیت بدل دی۔ ڈگری پر تصویر تو ہوتی نہیں۔ رول نمبر میں نے فرسٹ کلاس میں پاس ہونے والے کا معلوم کیا تھا، اس کا نام سعادت یار خان تھا۔ میں نے ڈگری پر یہی لکھوایا اور بس... اب میں سعادت یار خان ہوں۔ کمپنی والے زیادہ سے زیادہ ڈگری کی تصدیق کراتے تو جواب میرے حق میں آتا کہ ہاں ڈگری اصل ہے لیکن کمپنی کو اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ انٹرویو لینے والوں نے میری لیاقت کا اندازہ کرلیا تھا۔ باقی میں نے اپنے کام سے ثابت کر دیا۔ پروبیشن پیریڈ تین مہینے کا تھا۔ اب میں کنفرم ہوں اور محفوظ بھی۔ لیکن چودھری فرید الدین...''

''بار بار یہ نام مت لو۔ کسی روز بلا ارادہ تمہاری زبان پر آجائے گا۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''اور مجھے یہ بتاؤ کہ آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں... کچھ نہیں چاہتا۔''

''پھر میرا اعترافِ جرم حاصل کرنے کا مقصد... تم بلیک میل کرو گے مجھے... راز کو راز رکھنے کی قیمت طلب کرو گے؟''

''تم مجھے بے عزت کر رہے ہو۔ کیا میں ایسا آدمی ہوں؟'' وہ خفگی اور رنجیدگی سے بولا۔

''آدمی ایسا ویسا کچھ نہیں ہوتا۔ حالات جو بناتے ہیں، بن جاتا ہے اور حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔''

''میں بتا چکا ہوں کہ پیسے کا لالچ ہوتا تو میں لاکھوں سمیٹ کر غائب ہو جاتا۔ زندگی کو داؤ پر نہ لگاتا۔'' وہ گرم ہو گیا۔ ''اور ایسے الزامات تو میں تم پر بھی لگا سکتا ہوں۔ تم کیا کر رہے ہو یہاں اور کیوں کر رہے ہو؟ اپنی حقیقت پر ایک پردہ ڈال کے فا
جاننے سے پہلے آ

تمہارے پوچھے بغیر ہی... ورنہ کیا ضرورت تھی مجھے... یہاں آ کے اعتراف کرنے کی۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ''آئی ایم سوری... میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہم تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ملک سلیم اختر... ایک ساتھ ڈوبیں گے۔ اچھا ہے ایک دوسرے کا پردہ رکھیں اور بُرا نہ چاہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ابھی تو رات کے بارہ ہی بجے ہیں۔ یہاں گاؤں میں وقت کی رفتار کتنی کم ہو جاتی ہے۔ ٹھہرو... میں دیکھتا ہوں اس وقت کوئی کافی لا کے دینے والا ہے یا نہیں۔''

میں نے برآمدے میں آ کے دیکھا تو محافظ دونوں برآمدوں کے سنگم پر اسٹول لیے بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر مجھے درمیانی حصے میں ایک سایہ متحرک نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ ریشم کے کمرے کا دروازہ تھا۔ کوئی ابھی ابھی باہر سے اندر گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا لیکن اندر سے روشنی باہر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لائٹ آف تھی۔ گارڈ سے کچھ کہنے کے بجائے میں نے صحن کو ترچھا عبور کیا اور برآمدے میں عین اسی دروازے پر پہنچ کے انگلی سے دستک دی۔ اندر سے فوراً ریشم کی سہمی ہوئی آواز آئی... ''کون؟''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں دیکھنے آیا تھا کہ تم سو رہی ہو یا جاگ رہی ہو؟''

اس نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھا۔ ''اب سچ بھی بتا دو۔''

''ایک درخواست لے کر آیا تھا منظوری کے لیے... اچانک مجھے کافی کی اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''آخر تم جاگ کیوں رہے تھے؟''

''دیکھو، میں نے تو نہیں پوچھا تم سے کچھ بھی۔ محبت میں شبِ فراق ایسے ہی گزاری جاتی ہے، ابھی مجھے تارے بھی گننے ہیں۔''

''اچھا اچھا... جاؤ میں لاتی ہوں۔ خود ہی سب کرنا پڑے گا، کسی کو جگاؤں گی نہیں میں۔''

''اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں تمہارے خوابوں کا شہزادہ ملے گا... اور میرا گھر

لیا۔ ''ہو گیا

کچھ بندوبست... تمہیں سونے کی جلدی تو نہیں ہے؟''

''اب نہیں رہی... تمہاری کہانی سن کے ہی جاؤں گا۔''

میں نے اسے اپنے بارے میں اتنا ہی سچ بتایا جتنا اس نے بولا تھا۔ نورین کے بعد ریشم... پھر انور علی اور اب سعدی۔ ان سب کے سامنے میں اپنی عمر رفتہ کی کتاب کا ہر صفحہ کھول کے رکھ چکا تھا۔ راز کو ایسے راز رکھنا کہ خود اپنے سوا کسی پر ظاہر نہ ہو، اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں ان چاروں کے سامنے جھوٹ بولتا۔ الگ الگ چار کہانیاں نہ سہی... ایک کہانی بنالیتا جو دہراتا رہتا مگر مجھے معلوم تھا کہ جھوٹ بولنے والے کو یاد نہیں رہتا کہ اس نے پہلے کب کہاں کیا کہا تھا اور کیوں... آپ بیتی تو دماغ میں یوں محفوظ رہتی ہے جیسے ریکارڈ کی ہوئی آواز...

ریشم آئی اور ایک نظر مجھ پر اور میرے مہمان پر ڈال کے لوٹ گئی۔ اس کی نظر میں نہ کوئی سوال تھا نہ شک۔ اگر ہم باتیں کر رہے تھے تو نہ حیرانی کی بات تھی نہ پریشانی کی۔ کام کی بات کے علاوہ بھی باتیں تو بہت ہوتی ہیں اگر کرنے والا مل جائے۔ میں نے بھی اپنی ساری کہانی سنا دی۔ حقیقت کے بارے میں کہتے ہیں کہ فسانے سے زیادہ دل پر اثر کرتی ہے تو یہ بھی حقیقت ہے۔

''سوری، تم نے اگر کلثوم سے محبت کی تھی تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جرم تھا تمہارا غریب ہونا۔''

اس نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ''ہمارے ملک میں ایسا ہی ہے۔ انسان کوئی جرم نہ کرے تب بھی وہ پیدائشی طور پر مجرم ہوتا ہے۔ وہ غریب گھر میں کیوں پیدا ہوا، کم ذات کیوں تھا، مسلمان کے گھر پیدا ہوا تو اکثریت رکھنے والے فرقے سے تعلق کیوں نہیں تھا۔ باپ کا خاندانی عقیدہ بیٹے کے لیے جرم بن جاتا ہے اور ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں جو اس جرم کا کفارہ جان دے کر ادا کرتے ہیں۔ انسان کی شرافت، علم، ہنر، صلاحیت، اس کا عظیم شاعر یا موسیقار یہاں تک کہ سائنس داں ہونا بھی بیکار... اس کا جرم اپنی جگہ رہتا ہے۔''

''تم الیکٹریکل انجینئر سے زیادہ فلسفی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا تمہارا خون اتنا سرد ہے۔ تمہارے دل میں انتقام کی آگ ہی نہیں ہے۔ تم اسے کوئی سزا نہیں دینا چاہتے جس نے تمہاری زندگی برباد کی، تمہیں مجرم بنا دیا۔ اس لڑکی کو بے گناہ مار دیا جس سے تم محبت کرتے تھے اور تمہیں یہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جس میں تم چہرے، نام اور شناخت

WWW.PAKSOCIETY.COM

بدل کے پھر رہے ہو؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "ملک صاحب! ایک زمانہ تھا جب میرے خون میں انتقام کے شعلے بھڑکتے تھے لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ اس سے کیا ہو گا... کیا کلثوم مجھے واپس مل جائے گی؟ میں انتقام لوں گا تو کس کس سے... مجرم ایک اس کا باپ ہی تو نہیں... اس کا شوہر بھی ہے۔ اس کے غلام اور معاون پولیس کے وہ حکام بھی ہیں جو وردی پہنتے ہیں قانون کی حفاظت کے لیے... مظلوم کمزور کی مدد کے لیے... مگر وہ کرتے کیا ہیں؟ آخر کتنے قتل کروں گا میں... وہ بھی اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کے۔ ایک بار تو خدا نے بے گناہ جان کے بچالیا۔ جب شکر ادا کرنے کے بجائے میں خود مجرم بن جاؤں گا تو اس کے رحم و کرم کا مستحق بھی نہیں رہوں گا اور پھر اس سے فرق بھی کیا پڑے گا؟ تم کہہ سکتے ہو میں بے غیرت یا بزدل ہوں۔"

"کاش میری فطرت بھی تمہاری طرح درگزر کرنے والی ہوتی۔"

"درگزر کرنا مجبوری ہے میری... مجھے زندگی سے پیار ہے۔ میں پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے چلنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔ وقت جو گزر گیا، واپس نہیں آسکتا۔"

"تمہاری باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ اب تک تو مجھے جینے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا کہ میں کسی طرح نادر شاہ کے وجود سے اس دنیا کو پاک کر دوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت بڑا بدمعاش... انڈر ورلڈ مافیا کنگ یا ڈان ہے۔ ناجائز اور تمام غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کرتا ہے۔ ایسے تو ہزاروں لاکھوں ہیں۔ نیچے سے اوپر تک ہر جگہ موجود ہیں جن کو خدا نے طاقت دی ہے اور ذمے داری کہ ان سے لڑیں، وہ ان کے معاون بنے ہوئے ہیں پھر میں کیا اور میری اوقات کیا کہ دنیا کو نہ سہی پاکستان کو ویسا بناؤں جیسا قائداعظم کہا کرتے تھے۔ اس ملک اور معاشرے کو اسلام کے اخلاقی نظام کا آئینہ دار بناؤں... نہیں... یہ سب تو مجھے ناممکن نظر آتا ہے اب... کم سے کم اپنی زندگی میں... میں تو بس نادر شاہ سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا مگر اسے مجرم بنا دیا گیا... بے گناہ مار دیا گیا پھر اس کے جرم بے گناہی کی سزا میں مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچایا گیا۔ اس نظام سے میں کیا لڑوں گا، میری نظر میں تو وہ قاتل ہے۔ اس نے خود گولی نہیں چلائی تو کیا ہوا اس نظام کو استعمال کیا... میرا پہلا مجرم وہ ہے۔"

"اور تم اپنے ارادے میں اٹل ہو؟"

"ابھی تک ہوں۔ حالانکہ تقدیر مجھے موقع فراہم کر چکی ہے، زندہ رہنے کا، محبت کرنے کا اور خوشی پر اپنا حق حاصل کرنے کا۔ میرا باپ تو ایک غریب اور شریف آدمی تھا جس نے ہماری تربیت مذہب اور انسانیت کے ان اصولوں کے مطابق کی تھی جن پر وہ خود بھی کاربند رہا۔"

بات کرتے کرتے اچانک میری نظر کھلے دروازے سے باہر گئی تو مجھے اندھیرے میں کوئی متحرک نظر آیا۔ وہ بڑی تیزی سے صحن کو عبور کر کے برآمدے میں غائب ہو گیا۔ میرا دماغ چوکنا ہو کے خطرے کی گھنٹی بجانے لگا۔ اس وقت کون ایسے جا سکتا ہے؟ باہر آسمان تاریک تھا۔ شاید چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ روشنی برآمدوں میں تھی لیکن وسیع صحن کو روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس کے باوجود تاریکی ایسی نہیں تھی کہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ باہر گیٹ پر گارڈ تھا اور دروازہ بند تھا۔ اندر کے کسی ملازم کو ایسے صحن کراس کرنے کی کیا ضرورت... میں نے بھی صرف حرکت دیکھی تھی۔ وہ ایک زیادہ سیاہ سایہ تھا جس پر انسان ہونے کا شبہ ہی کیا جا سکتا تھا، جن بھوت ہونے کا نہیں۔ قد و قامت میں وہ انسان کے برابر ہی تھا۔

سعدی نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا ہے باہر؟"

میں نے کہا۔ "میں ابھی دیکھ کے آتا ہوں۔ میں نے کچھ دیکھا ہے۔"

میں اٹھ کے باہر آیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ چاروں طرف کے برآمدوں کے کونے جہاں رات کو محافظ پہلے کھڑے رہتے تھے یا برآمدے میں گشت کرتے تھے اور اب انور کی اجازت سے اسٹول ڈال کے بیٹھے نظر آتے تھے، اپنی جگہ پر موجود نہیں اور وہ دونوں کارنر تاریک پڑے ہیں جہاں رہائشی کمرے تھے، بڑے چودھری صاحب کے اور حویلی کے دوسرے لوگوں کے بیڈ روم تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس کونے کی مدھم روشنی میں محافظ کو بیٹھا دیکھا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔

میں اسی طرف گیا اور ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ بلب روشن ہو گیا اور گارڈ بھی نمودار ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہی کیا۔ "کہاں تھے تم؟ اور یہ لائٹ کیوں آف تھی؟"

وہ گھبرا گیا۔ "[illegible]"

"ادھر کیا د

"ادھر فیوز بورڈ ہے سر! کبھی فیوز اڑ جاتا ہے تو کسی ایک حصے میں لائٹ نہیں رہتی۔"

"لائٹ تو کہیں بھی نہیں تھی باہر۔ سب برآمدوں میں اندھیرا تھا۔"

اس نے کہا۔ "ان کا ایک ہی فیوز ہے سر... ادھر کی لائٹوں کا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا۔

"تم نے ابھی کسی کو اندر آتے دیکھا؟"

وہ گھبرا گیا۔ "کون سر؟ میں نے تو نہیں دیکھا کسی کو۔"

میں اسے چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ایک دروازہ ریشم کے بیڈ روم کا تھا۔ دوسرا شاہینہ بھابی کا اور تیسرا انور کا۔ میں نے کچھ ذہن پر زور دیا کہ میں نے جو سایہ متحرک دیکھا تھا، وہ برآمدے میں کہاں گیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میرا وہم نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سرتاپا اپنے وجود کو سیاہ چادر میں چھپایا اور عین اس وقت جب برآمدے کی لائٹس آف ہوئیں، اس نے صحن عبور کر لیا۔ میری نظر شاہینہ بھابی کے دروازے پر رک گئی۔ میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا لیکن کوئی ادھر آیا تھا تو اس کی ڈائریکشن میں یہی دروازہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں کے دونوں دروازے پندرہ فٹ دور تھے۔ میرا اندازہ اتنا غلط نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ سایہ ایک تیر کی طرح خطِ مستقیم میں گیا تھا۔

ابھی میں تذبذب میں کھڑا تھا کہ کوئی دروازہ خفیف سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ آواز ایسی تھی جیسے پرانے زنگ خوردہ قبضے میں سے نکلتی ہے۔ اگر اسے تیل دینے کی ضرورت ہو۔ میں چونک پڑا۔ میرے پیچھے ریشم کے کمرے کا دروازہ اب بند تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ کھولا گیا مگر فوراً بند بھی کر دیا گیا ہو گا اور بند کرتے وقت اس نے چوں بھی نہیں کی ہو گی۔ میں پلٹ کے گیا اور آہستہ سے ایک انگلی سے دروازے کو ناک کیا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ریشم کی ڈری سہمی آواز نے پوچھا۔ "کون؟"

میں نے کہا۔ "بھوت... اس وقت اور کون آسکتا ہے؟"

اس نے دروازہ کھولا۔ "تم... اب کیا ہوا ہے؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

میں نے کہا۔ "ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابھی تم نے دروازے سے جھانکا تھا؟"

"ہاں، اندھیرے میں اندازہ نہیں ہوا کہ تم ہو۔ اندر [illegible]

چھا۔ "تم کیا دیکھ رہی تھیں باہر؟"

"پہلے تم بتاؤ... تم کیوں کھڑے تھے بھابی کے دروازے پر؟"

میں نے کہا۔ "مجھے شک ہوا تھا کہ ادھر کوئی آیا ہے۔ جب ذرا سی دیر کے لیے لائٹ آف ہوئی تھی، کسی نے صحن کراس کیا تھا۔"

"سلیم! یہاں کچھ دال میں کالا ہے۔ کل سے دیکھ رہی ہوں میں۔ پہلے تو اپنا وہم سمجھا تھا میں نے مگر مجھے بھی رات کے وقت ایسا لگتا ہے کہ کچھ مشکوک سائے حرکت کرتے ہیں۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں کبھی کبھی۔"

"کیسی آوازیں... کہاں سنائی دیتی ہیں؟"

"بھابی کے کمرے میں سے... جیسے سرگوشی میں بات کرنے والا بے دھیانی میں اونچا بولنے لگے پھر خاموش کر دیا جائے۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ شاید دن میں سوتی رہتی ہوں اس لیے... کل رات پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں جگا دوں لیکن انور نکل آیا اور ہم کافی دیر باہر پھرتے رہے۔ باہر کا مطلب ہے حویلی سے باہر... پیچھے ان کا خاندانی قبرستان ہے... وہاں۔"

"آدھی رات کے بعد؟ تمہیں ڈر نہیں لگتا... کیا چیز ہو تم؟ جن بھوت ہوتے ہیں وہاں۔"

"میں خود انہی میں سے ہوں۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔ "ایک بار انور کو بتایا تھا، وہ کہنے لگا کہ دیکھتے ہیں تمہاری ہمت... وہ مجھے بتاتا رہا اپنے دادا اور دادی... نانا اور نانی کے بارے میں۔"

"آج بھی تم دونوں باغ میں گھوم رہے تھے، اندھیرے میں... خیر وہ بات بتاؤ جس کے لیے تم مجھے جگانا چاہتی تھیں؟"

اگر اندھیرے میں وہ شرم سے لال ہوئی تھی تو میں دیکھ نہیں سکا۔ "یہاں کچھ ہو رہا ہے۔ پتا نہیں بیچ کی دیوار ایسی ہے یا میرے ہی کان زیادہ سنتے ہیں۔ اب میں بھابی پر یہ الزام تو لگا نہیں سکتی کہ کوئی ان سے ملنے آتا ہے۔ ابھی اتنے دن بھی نہیں ہوئے اکبر سے جدا ہوئے... ویسے بھی یہ ناممکن ہے یہاں۔"

"پھر کیا شک ہے تمہیں؟"

"تمہیں کیا شک ہوا جب تم نے کسی کو دیکھا تھا؟ میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہارا وہم نہیں لیکن کوئی اندر آیا کیسے؟"

میں دروازے سے باہر نکل گیا۔ "میں دیکھتا ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے سعادت کا خیال تھا کہ وہ میرے انتظار میں ہوگا لیکن وہ کمرے میں نہیں تھا۔ مجھے واپس آنے میں دس منٹ سے زیادہ ہی لگ گئے تھے اور شاید وہ تھکن اور نیند سے مغلوب تھا۔ اس نے سارا دن جو محنت کی تھی، وہ جسمانی تھی۔ پھر اسے یقین ہی نہیں ہوگا کہ میں کتنی دیر میں واپس آتا ہوں۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ میں بھی اب سونا ہی چاہتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایک نظر گیٹ پر ڈال لوں۔ اگر واقعی کوئی اندر آیا تھا تو وہ گیٹ سے ہی گزرا ہوگا اور گیٹ پر گارڈ نے کچھ نہیں دیکھا ہوگا تو پھر میں سمجھوں گا کہ وہ میری نظر کا دھوکا تھا یا پھر جھوٹ تھا۔

گیٹ رات کو بند رہتا تھا۔ باہر سے آنے والے کو پہلے گارڈ سے قفل کھلوانا ضروری تھا مگر اندر سے کوئی باہر جانا چاہے تو اس کے لیے بڑے پھاٹک میں ایک کھڑکی اتنی بڑی تھی کہ اس میں سے سر کو جھکا کے گزرا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کھڑکی کو کھلا دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اگر کبھی رات کو حویلی کے اندر سے کوئی یہ کھڑکی کھول کے نکلتا تھا تو گارڈ قفل کھول کے اندر آتا تھا اور کھڑکی بند کر کے گیٹ سے باہر چلا جاتا تھا اور پھر تالا لگا دیتا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جا کے دیکھا۔ گارڈ کرسی پر سر جھکائے بیٹھا ہوا محوِ خواب تھا۔ اس کی رائفل دونوں ٹانگوں کے بیچ میں دبی ہوئی تھی اور اس کی نوزل گارڈ کے پیٹ میں کھب رہی تھی۔

گارڈ کا یوں سو جانا کوتاہی اور غفلت میں آتا تھا اور جرم تھا لیکن وہ بہرحال انسان تھا۔ خدا نے رات سونے کے لیے بنائی ہے مگر وہ نوکری کی وجہ سے رات جاگ کر کاٹنے پر مجبور تھا۔ گارڈ کو کرسی فراہم نہ کرنا ویسے تو زیادتی لگتا ہے لیکن انہیں بیٹھنے دیا جائے تو وہ انسانی کمزوری کا شکار ہو کے اونگھ جاتے ہیں۔ قریب جا کے میں نے اسے آہستہ سے کندھا پکڑ کے ہلایا۔

"گارڈ... ایسے ڈیوٹی دیتے ہو تم؟"

عموماً ایک آواز پر گارڈ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور معافی مانگنے لگتے تھے یا طبیعت اچانک ناساز ہونے کا عذر پیش کرتے تھے مگر یہ گارڈ ٹس سے مس نہ ہوا۔ دوسری بار میں نے زیادہ برہمی سے اس کا شانہ ہلایا۔ "اتنی گہری نیند..." مگر اس سے آگے بولنے کا مجھے موقع نہ ملا۔ گارڈ بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو جھکا اور کرسی الٹی تو فرشِ خاک پر سجدہ ریز ہو کے ساکت ہو گیا۔ اس کی رائفل اس کے اوپر گری۔ میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر گارڈ کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ بے ہوشی نہیں خوابِ ابد ہے۔ وہ زندہ نہیں ہے لیکن تصدیق کے لیے میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام کے نبض کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ نبض کی حرکت مفقود تھی۔ روایتی طریقے پر میں نے سانس کی آمد و رفت کو چیک کرنے کے لیے اس کی ناک کے نیچے ہتھیلی کو لا رکھا۔ مجھے کسی حرارت یا نمی کا احساس نہیں ہوا۔ اس کی ایک جیب سے ٹارچ باہر جھانکنے لگی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے اس کی ایک آنکھ کے پپوٹے کو اٹھا کے دیکھا۔ نیچے آنکھ کی پتلی ساکت تھی۔ اس کا جسم ابھی گرم تھا اور زندگی سے محروم بدن کی طرح سخت ہو کے اکڑا نہیں تھا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اس کے جسم پر کہیں خون یا زخم نہ تھا۔ اصل اسباب کا تعین اب پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی کر سکتی تھی۔

میں اٹھا تو ٹارچ کی روشنی کے دائرے میں مجھے کرسی کے دوسری طرف ایک کپ پرچ نظر آئے۔ میں نے اس پر روشنی ڈالی۔ کپ کی تہ میں تھوڑی سی چائے موجود تھی۔ میں نے کپ کو احتیاط سے ایسے اٹھایا کہ کنڈے پر فنگر پرنٹس ہوں تو محفوظ رہیں۔ پھر میں لوٹ کے اندر گیا اور انور کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد وہ آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔ "سلیم! کیا ہوا؟ خیریت ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں... خیریت بالکل نہیں ہے... تُو ذرا منہ پر پانی کا چھینٹا مار کے آ۔"

"یار! کچھ بتا تو سہی۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "بتانا نہیں، میں کچھ دکھانا چاہتا ہوں... فٹافٹ آ جا۔"

وہ دو منٹ میں پھر نمودار ہوا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ میں نے خاموشی سے اسے گیٹ پر پڑی ہوئی گارڈ کی لاش دکھا دی۔ اس کا ردِعمل بھی شاک کا تھا۔ "او مائی گاڈ... اسے کیا ہوا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "یہ مر چکا ہے... بلکہ مار دیا گیا ہے۔ تُو پہلے اس کی لاش اٹھوا... پھر میں تجھے کچھ اور بھی بتاتا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے وہ بتا دیا جو دیکھا تھا اور وہ بھی جو ریشم سے سنا تھا۔ وہ پریشانی اور تشویش زدہ کرسی کے بازو پر انگلیاں چلاتا رہا۔ "میرا ابھی خیال ہے کہ اسے چائے میں زہر دیا گیا اور زہر دینے والا [illegible] گزرا۔"

"اور بھابی کے کمرے کی طرف گیا۔"

"ابھی ایسا مت بول۔ یہ قتل سے زیادہ سنگین الزام بن جائے گا۔ گڑبڑ تو یقیناً ہے کہیں... یہ صرف میرا وہم نہیں۔"

"گڑبڑ کیسی؟"

"اس کا امکان تو ایک فیصد بھی نہیں کہ... کوئی بھابی سے ملنے آتا ہو۔ انہیں واقعی اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔"

"شادی کے بعد یہ محبت ان کا فرض ہے یا مجبوری ہے۔" میں نے کہا۔

"شادی سے پہلے بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے اور ہمارے گھروں میں اس وقت اس محبت کا کوئی تصور نہیں جو قلعوں یا ناولوں میں ہوتی ہے۔"

"شادی سے پہلے اپنے منگیتر یا نامزد شوہر سے تو ہو سکتی ہے۔ نامزدگی پہلے تیری ہوئی تھی، سینیارٹی کی وجہ سے... پھر اکبر نے تیری جگہ لے لی۔ بھابی نے اپنی محبت کو سوئچ اوور تو کیا ہوگا۔ جیسے بجلی کو ایک فیز سے دوسرے فیز پر سوئچ کرتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں، ایسا ہوا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ شوہر سے محبت کے فرض کو نبھا رہی ہیں۔ ہر عورت نبھاتی ہے۔ میرے لیے اب ان کے دل میں صرف نفرت ہو سکتی ہے مگر اس کا نشانہ گارڈ کیوں بنے گا؟"

"اس کا نشانہ تُو ہی بنے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب ہے..."

"میرا بالکل وہی مطلب ہے جو تُو سمجھا۔ محتاط ہو جا۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ بھابی اپنے التفات سے ڈبل گیم کھیلے۔ تجھ سے شوہر کے لیے مراعات بھی حاصل کرے اور اسے دوبارہ تخت پر بٹھا دے بعد میں یا اس سے پہلے ہی... اس مرتبہ تجھے ہرگز یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ صرف قیدی بدلے جائیں گے۔ جو ایک بار سانپ کے ڈسنے سے بچ جائے، وہ سانپ کو دوسرا چانس دینے کا رسک نہیں لیتا۔ نہ بھابی اتنی بے وقوف ہے اور نہ اس کا شوہر۔"

"یو آر رائٹ۔" انور علی نے اعتراف کیا۔ "اس چائے کی پیالی کو تالے میں رکھ۔ جب پولیس آئے گی تو لے ہوئی چائے

تین لفافے

ایک بڑی کمپنی میں سیلز کے شعبے میں نیا چیف مقرر کیا گیا۔ چارج لینے کے بعد جانے والے چیف نے اس سے علیحدگی میں ملاقات کی اور اسے تین مہر بند لفافے دیے جن پر ایک سے تین تک نمبر پڑے ہوئے تھے۔

اس نے کہا۔ "سیلز کے شعبے میں اکثر کڑا وقت آتا رہتا ہے۔ جب بھی تم مشکلات سے دوچار ہو، تو ترتیب وار ان لفافوں کو کھولنا، ان میں میرے تجربات کا نچوڑ ہے۔"

چھ ماہ خوب گزرے پھر کاروبار یکایک مندا ہونے لگا۔ نئے چیف نے پہلا لفافہ کھولا۔ اس میں لکھا تھا۔ "اس مندی کا سارا الزام اپنے پیش رو پر ڈال کر سرخ رو رہو۔"

اس نے یہی کیا بلکہ ایک پریس کانفرنس بھی کر ڈالی۔ کام تیزی سے چل نکلا۔ مالکان اس سے خوش ہو گئے۔

ڈیڑھ سال بعد پھر مندی کا حملہ ہوا۔ وہ پچھلے تجربے سے خوش تھا۔ اس نے دو نمبر والا لفافہ کھولا۔ اس میں ہدایت تھی۔ "کچھ پرانے لوگوں کو نکالو، نیا اسٹاف بھرتی کرو۔"

یہ تدبیر بھی کارگر رہی۔ تین برس بعد مندی کا تیسرا حملہ ہوا تو اس نے بڑی امید سے لفافہ نمبر تین کھولا تو یہ تحریر اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ "اپنے جانشین کے لیے ایسے ہی تین لفافے تیار کرلو۔ یہاں تمہارا وقت پورا ہو چکا ہے۔ سیلز میں کوئی زیادہ دیر نہیں ٹک سکتا کیونکہ مالکان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔"

(بنگلہ دیش سے عائشہ خرم کا تجزیہ)

کے بارے میں دے گی؟ یہ پاکستان ہے بیٹے... تُو ولایت میں نہیں ہے۔ اگر تُو نے بھروسا کیا تو میں پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ رپورٹ میں کیا لکھا جائے گا... چائے میں کچھ نہیں تھا۔"

"تھینک یو یار! تُو نے مجھے خبردار کر دیا۔ مجھے ان معاملات کا زیادہ پتا نہیں۔"

"اور مجھے دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔"

اس کے بعد جو ہوا معمول کی کارروائی تھی۔ پولیس کئی گھنٹے بعد آئی۔ اتنی دیر گارڈ کی لاش اسی طرح پڑی رہی۔ بڑے چودھری صاحب کا بلڈ پریشر بڑھ گیا، بھابی سخت فکرمند نظر آتی رہی۔ میڈیکل کمپنی والے تمام معاملات سے بے نیاز اپنا کام کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب ضابطے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد حالات ایسے نارمل نظر آنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ انور علی بھی اسی شک کا اظہار کرتا رہا کہ قتل گارڈ کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ یہ یہاں عام بات تھی۔ اس کی جگہ دوسرے گارڈ نے لے لی۔ یہ بھی عام سی بات تھی۔

جب سعادت سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بڑی تندہی سے مشینری انسٹال کرانے میں لگا ہوا تھا۔ یہ مشینری کچھ دیر پہلے ہی ان کے ایک ٹرک سے اتاری گئی تھی۔ دوپہر سے کچھ پہلے بڑی بھابی شاہینہ خود مجھ سے ملنے آئی۔

''تمہیں کچھ معلوم ہے یہ انور بھائی کہاں غائب ہو گئے ہیں؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ میرے ساتھ تھے۔''

''تم ان کے دوست اور مشیرِ اعلیٰ ہو... انہیں کچھ سمجھاؤ۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''وہ خود کافی سمجھ دار ہے اور آپ بھی کوئی بات سمجھائیں گی تو سمجھ لے گا۔'' میں نے کہا۔ ''رہی بات میرے مشیرِ اعلیٰ ہونے کی تو میں اسے کیا کہوں... آپ کی خوش فہمی یا غلط فہمی۔''

''مجھے ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ وہ حویلی کے سارے سیکیورٹی گارڈز کو تبدیل کر رہا ہے۔ آخر کیوں؟''

''میں کیا بتاؤں... اس نے مجھ سے اس معاملے میں کوئی مشورہ تو کیا، بات تک نہیں کی۔ اور یہ ہے بھی ایک انتظامی معاملہ... ممکن ہے کل رات گارڈ کے قتل کے بعد اسے محسوس ہوا ہو کہ سیکیورٹی والا عملہ کچھ مستعد نہیں رہا۔ رات کو ڈیوٹی دینے والے کو خود میں نے کئی بار سوتا ہوا دیکھا اور کل اس کا قتل ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔''

''میں نے سنا ہے کہ وہ کسی عورت کا چکر تھا۔''

''ہو سکتا ہے... لیکن کل رات جب لائٹ گئی تو سیکیورٹی گارڈ غائب تھے۔ یہ میں نے خود دیکھا اور اس وقت مجھے شک ہوا کہ کوئی اندر آیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ گارڈ کو قتل کر کے اندر پہنچا ہو۔''

شاہینہ کا رنگ متغیر ہوا۔ ''یہ تم نے پولیس کو نہیں بتایا۔''

''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ محض شک کی بنا پر میں کیا بیان دیتا؟''

''پرانے لوگ آزمائے ہوئے تھے، پرانے نمک خوار اور وفادار تھے۔ ان کو سختی سے ہدایات دی جا سکتی تھیں۔ اب یہ نئے لوگ نہ جانے کہاں سے آئیں گے۔ ان پر بھروسا کیسے کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ بھی ایک پرانا نمک خوار تھا جس نے انور کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ یہ سیدھے سادے مقامی لوگ آج کل کی سیکیورٹی کے تقاضے کیا جانیں۔ یہ مزدور کسان تھے۔ بندوقیں دے کر کھڑا کر دیا گیا کہ چوکیداری کرو۔ اگر انور نے ایسا سوچا ہے تو میں اس کے حق میں ہوں۔ اسے مشورہ دوں گا کہ وہ شہر سے کسی پروفیشنل سیکیورٹی کمپنی کو کنٹریکٹ دے۔ وہ اپنے ایکوپمنٹ کے ساتھ آئیں گے۔ خاردار تاروں کی باڑھ جس میں کرنٹ ہو... انفراریڈ الائٹ کے الارم... کلوزسرکٹ کیمرے۔''

شاہینہ بے وقوفوں کی طرح میری صورت دیکھتی رہی۔ ''مجھے تو ان چیزوں کا کچھ پتا نہیں... لیکن ایک بات اور تھی۔ آج میرے والد صاحب آ رہے تھے۔ انہوں نے کہلوایا تھا کہ وہ بھائی صاحب سے بھی ملنا چاہتے ہیں مگر بھائی صاحب نے کل رات ہی ضروری کام سے کہیں جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اب یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ ہر بار وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔''

''ہر بار کیا مطلب؟ سال بھر سے تو وہ نیچے قید تھا۔''

''اس سے پہلے... اور والد صاحب تو ان سے نیچے جا کے بھی ملنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ملنے سے انکار کیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ انور علی کا ذاتی معاملہ ہے... میرا اس میں دخل دینا کسی صورت مناسب نہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ بھابی کچھ پریشان ہے۔ پیر صاحب کے آنے کا غلغلہ ہوا تو میں نے باہر نکل کے دیکھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا جلوس ایسی شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوگا۔ میرے ذہن میں ان کا تصور بالکل مختلف قائم کیا گیا تھا۔ یوں جیسے وہ ذرا بھی دنیادار نہیں... نام و نمود سے دور رہنے والے اور دولت وجاگیر سے بے نیاز کوئی صوفی ہیں جو اپنی شانِ درویشی اور تصوف سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ درجن بھر مرید تھے۔ ان میں دو ذاتی محافظ تھے۔ وہ دونوں اندر تک آئے۔ باقی کو دروازے پر ہی روک کر مہمان خانے میں جگہ دے دی گئی۔ خود پیر صاحب مقامی سے زیادہ سعودی لگتے تھے۔ وہی لمبی سفید قبا... سر پر چارخانے والا رومال... ہاتھ میں سبز منکوں والی تسبیح... اور چہرے پر بالشت بھر سے زائد لمبی سفید داڑھی...

شاہینہ کے و
اظہار ایک فطری با

کو غیر موجود پا کے وہ مایوس تھی۔ انور پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ بڑے چودھری صاحب بھی باہر نہیں آئے۔ ان کے پاس علالت کا بہانہ تھا لیکن وہ اپنے بھائی کی پیری مریدی کا تذکرہ پہلے ہی ایسے غیر سنجیدہ انداز میں کر چکے تھے کہ مجھے ان سے یہی امید تھی۔ پھر بڑی چودھرائن کیوں باہر نکلتی... شاید اسے مجھ سے بھی شکوہ ہوگا کہ میں ان کے استقبال کے لیے کیوں باہر نہیں نکلا۔

پیر صاحب پہلے بھائی کے کمرے میں گئے۔ یہ رسم دنیا بھی تھی اور شاید مزاج پرسی کے بعد انہوں نے بھائی کی صحت یابی کے لیے مخصوص دعا ارسال کرنا اس تمام انتظامات سے زیادہ فائدہ مند سمجھا ہو جو انور اپنے باپ کے علاج کے لیے کر رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں بھی گھر سے غائب ہو سکتا ہوں لیکن .... سعادت نے مجھے روک لیا۔ ان کا کام پورا ہو چکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ انور اپنا اطمینان کر لے۔ اس کی غیر موجودگی میں یہ ذمے داری مجھ پر آ گئی۔ میں ان کی مشترکہ ہدایات کو سمجھنے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ کس شخص کو کیسے استعمال کیا جائے گا اور اس میں کیا احتیاط لازمی ہو گی۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقفہ آ گیا اور انہوں نے کہا کہ اگر چودھری صاحب کو بیڈ پر شفٹ کر دیا جائے تو وہ ایک آزمائشی مظاہرہ کر سکتے ہیں جو ہماری عملی تربیت کے لیے بھی ضروری ہے۔

پیر صاحب اس وقت اپنی بیٹی کے کمرے میں تھے۔ میں نے چودھری صاحب سے بات کی۔ ''ابھی آپ شفٹ ہو جائیں... باقی سامان بعد میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔''

''اگر تم یہی کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تم پیر صاحب سے ملے؟ انور تو ہے نہیں۔'' انہوں نے قدرے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ابھی ہو گی ملاقات۔'' میں نے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ انور سارے ملازموں کی چھٹی کر رہا ہے؟'' بڑے چودھری صاحب کچھ ناخوش تھے۔

''مجھے معلوم نہیں... لیکن وہ ایسا کر رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ پرانے چوکیداروں کا زمانہ نہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان بے چاروں کا کیا ہوگا... پرانے نمک خوار ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ انور کسی کو بے روزگار نہیں کرے گا۔ ان کے لیے دوسرے کام بہت ہیں۔''

۔ مجھے پیر
ہوا۔ میں

ذہنی طور پر ان کے تمام سوالات کے لیے تیار تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے میرے شجرۂ نسب کی بات کی۔ میرا تعلق کس خاندان سے ہے اور میرے آباؤ اجداد کون تھے۔ یہ عام سی بات تھی جو مجھ سے ہر جگہ ہر شخص پوچھتا تھا۔ اب میں نے اپنا ایک بیک گراؤنڈ بنا لیا تھا اور اپنی کہانی پر ایسے قائم رہتا تھا کہ کوئی بھی فرق نہ نکال سکے۔

حسبِ توقع وہ بہت جلد مطلب کی بات پر آ گئے۔

''بھئی ہم نے سنا ہے کہ تم انور کے معتمدِ خاص ہو۔ وہ تمہاری رائے پر چلتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ماشاء اللہ عاقل و بالغ ہے اور بہت تعلیم یافتہ ہے... بہت دنیا دیکھ چکا ہے۔''

''ہم چاہتے تھے کہ تم اس معاملے میں کوئی مصالحتی کردار ادا کر سکو... یہ جو بھائیوں کے درمیان اختلافات کا سلسلہ ہے...''

''دیکھیے... یہ محض اختلافات نہیں... اور میں اس کے پس منظر سے قطعی ناواقف ہوں۔ میں باہر کا آدمی ہوں اور میرا یہاں قیام بھی عارضی ہے۔ میں اس خالص خاندانی معاملے میں نہیں پڑ سکتا۔ آپ بزرگ بھی ہیں اور تمام حالات سے باخبر بھی... یہ کام آپ ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔''

پیر صاحب نے عفو و درگزر کے موضوع پر ایک تقریر کے بعد کہا۔ ''اگر ہم یہ ذمے داری تمہیں تفویض کرنا چاہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں خود کو اس کے قابل نہ سمجھتے ہوئے آپ سے معذرت کروں گا۔''

رفتہ رفتہ میرے نہ ماننے کے باوجود ان کے لہجے میں سختی آنے لگی اور انہوں نے نہ صرف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار برہمی کی صورت میں کیا بلکہ وہ مجھے اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب سے بھی ڈرانے لگے۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے داماد اکبر کی معزولی اور گرفتاری کا براہِ راست ذمے دار مجھے ہی سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں مجھے اکبر نے ریشم کے ساتھ فرار ہونے کے جرم میں قید کیا تھا تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ ہم دونوں ایک ایسے غیر شرعی فعل کا ارتکاب کر رہے تھے جس کی آخری سزا سنگساری ہو سکتی تھی۔ میں نے بہت برداشت اور مصلحت سے کام لیا۔ بہت سے تحفظات میری راہ میں حائل تھے۔ پھر یہ احساس کہ میرا ماضی ایک پرفریب پردہ ہے جو چاک ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہ پیر صاحب ابھی جلال میں آ جائیں تو نہ جانے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مریدوں کے لشکر سے ایک بدعقیدہ کافر کی کیسی عبرت کرادیں... اس کی انہوں نے دھمکی بھی دے دی تھی کہ معاملات میری اور انور کی کوشش سے ٹھیک نہ ہوئے تو پھر انہیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ کچھ کرنے کے بھی دو مطلب تھے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی دنیاوی قوت یعنی مریدوں کی فوج سے کام لیں اور دوسرا اپنی روحانی قوت سے ہمیں درسِ عبرت بنا دیں۔ بہتر ہے کہ ہم ان کے جلال کو نہ للکاریں۔

اور کوئی جگہ یا موقع ہوتا تو میں ان جیسے فراڈ پیروں کے چیلنج کو قبول کرتا اور ان کی اوقات ان پر واضح کر دیتا۔ یہاں میں مجبور تھا اور بروقت خدا نے میری مدد کردی۔ مجھے پیغام ملا کہ بڑے چودھری صاحب کو ان کے روم میں شفٹ کردیا گیا ہے اور میں دیکھ لوں۔ پیر صاحب قبلہ یہ بھی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ ان کے روحانی دستِ شفا سے منکر ہو کے اور ان شیطانی مشینوں پر انحصار کر کے ہم دنیا و عاقبت میں خرابی مول لے رہے ہیں۔ میں موقع کو غنیمت جانتے ہوئے فوراً نکل گیا بلکہ فرار ہوگیا۔ میں اب انور کے اور بڑے چودھری کے رویّے کو حق بجانب سمجھنے پر مجبور تھا اور اسے بھی انور علی کی خوش نصیبی سمجھتا تھا کہ وہ ان پیر صاحب کا داماد ہونے سے بچ گیا۔

میڈیکل سپلائی کمپنی نے اپنا کام تسلی بخش طریقے سے پورا کرلیا تھا لیکن ابھی ایک آخری مرحلہ باقی تھا۔ کسی وجہ سے جنریٹر نہیں پہنچا تھا اور اسے لگانے کے لیے انہیں مزید ایک دن درکار تھا۔ اس رات دونوں انجینئرز نے پھر مہمان خانے میں قیام کرنا ہی بہتر سمجھا لیکن شام کو سعادت کے ساتھی کو اپنے گھر سے کوئی پیغام ملا اور وہ چلا گیا۔ پیر صاحب قبلہ بھی سہ پہر کے وقت رخصت ہو گئے۔ ان کی روانگی کے وقت میں نے بہتر سمجھا کہ غائب ہوجاؤں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے شاہینہ سے میرے بارے میں کیا کہا لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے بھابی کے رویّے میں نمایاں تبدیلی نظر آئی۔

اس نے شام کو مجھ سے شکایت کی۔ ”والد صاحب بہت ناراض تھے۔ تم نے انہیں بہت بے عزت کیا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے بہت برداشت کیا... صرف اس لیے کہ آپ کے والد ہیں۔ ورنہ میں پیری فقیری کا بالکل قائل نہیں... جو کچھ وہ مجھ سے چاہتے تھے، وہ میں کر نہیں سکتا تھا۔“

”تم شرافت سے بھی تو انکار کر سکتے تھے۔“

”میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ تو کھلی دھمکی دے کر گئے ہیں مجھے... میرا کیا تعلق اس گھر کے معاملات سے؟“

انور شام کو سیکیورٹی کمپنی کے ایک نمائندے کے ساتھ واپس آیا۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کے موجودہ انتظامات کا جائزہ لیا اور اپنی رائے بھی دیتا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مشورہ پروفیشنل ایکسپرٹ کا تھا اور ان کے چارجز بھی اسی حساب سے تھے۔ جاتے جاتے اس نے کہا کہ حویلی میں مستقل رہائش رکھنے والوں اور آنے جانے والوں کی مکمل تفصیل کی ضرورت ہوگی اور وہ تمام کوائف کی تصدیق کریں گے۔ تمام سیکیورٹی امور کی ذمے داری قبول کرنے میں انہیں ایک ہفتہ لگے گا۔

یہ جمعرات کا دن تھا۔ حویلی کی روایات کے مطابق بڑے چودھری صاحب اپنے والدین کی قبروں پر پھول چڑھانے، اگربتیاں جلانے اور فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ وہاں سے جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ انہوں نے قبرستان کی دیکھ بھال کرنے والے کو طلب کرلیا۔ وہ ایک مالی تھا جو یہاں کئی تھوڑا بہت کام کرتا تھا۔ انور ان کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا اور میں انور کا ساتھ دینے پر۔

بڑے چودھری صاحب نے دو قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کیسے دھنس رہی ہیں... نہ بارش ہوئی ہے نہ سیلاب آیا ہے... نہ زلزلہ...“

مالی نے اعتراف کیا۔ ”ابھی دو دن پہلے تو ایسا نہیں تھا۔“

”ان کو ٹھیک کرا لو کے پٹھے... ورنہ میں تجھے گاڑ دوں گا بیچ میں۔“

انور دو دن پہلے اس قبرستان میں ریشم کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کسی نے کھودا ہے انہیں؟“

یہ سوال اس نے حیرانی سے کیا تھا۔ مالی نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ”کون کرسکتا ہے جی اس کی جرأت؟“

انور کے تجسس نے اسے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ اس وقت مغرب کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے بھی ناک آؤٹ کر دیا۔ مجھے کچھ دیر اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ حقیقت ہے یا میری نظر کا دھوکا۔

انور اچانک غائب ہو گیا تھا۔ محاورے کے مطابق اسے زمین نے نگل لیا تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا، اب وہاں نہیں تھا۔

بر محاذ ... [illegible]

جواز:

پنچایت

محمد تنویر اختر

ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں لیکن ہماری بہت سی رسوم و روایات کئی صدیوں پیچھے کی چلی آرہی ہیں... زیرِنظر کہانی میں کالا کالی کے موضوع پر چاہ کن راچاہ درپیش کے مصداق طبع آزمائی کی گئی ہے... وہ اپنی بدمعاشی کے نشے میں دھت تھا... اس بات سے بے خبر کہ وہ مکافاتِ عمل سے نہ بچ سکے گا اور پھر وہ ہوا جو اس نے کسی اور کے لیے سوچا بھی نہ تھا...

سرائیکی وسیب کے تناظر میں ایک خیال انگیز کہانی...

ٹوٹی پھوٹی سرائیکی میں جب ڈِتو کی بیوی بختو بی بی نے حاکمِ علاقہ کے سامنے زبان کھول کر اپنا قصہ سنایا تو یک لخت حاکمِ علاقہ کے دفتر میں سناٹا سا چھا گیا۔ حاکم عورت کے زخموں پر مرہم پٹی کی تھی اور ٹانگ پر لگے زخم کا ابتدائی

کے خاوند ڈِتو کو بھی جو ایک کونے میں شرم سے سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔

تمام مرد کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ بھی جس نے بختو

WWW.PAKSOCIETY.COM

علاج معالجہ کیا تھا۔ جب سارے مرد حاکم کے کمرے سے چلے گئے تو حاکم عورت نے ایک بار پھر وقوعے کے بارے میں جانکاری لی۔ کچھ نئے سوال کیے کچھ پرانے دہرائے۔ حاکم عورت نے ان زخموں کا خود بھی معائنہ کیا جو بختو کے جسم پر لگے تھے اور ان سے مرہم پٹی کے بعد بھی لہو رس رہا تھا۔ ناخنوں کے نشان تو کسی گنتی میں نہ تھے۔ یہ دیکھ کر حاکم عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک درد بٹانے والی کا آسرا ملا تو بختو بھی سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اس نے ایک بار پھر پورا واقعہ دہرایا۔

ڈتو بستی کا ایک معمولی سا بندہ تھا۔ والدین کی وفات کے بعد تنہا رہ گیا۔ گھر کیا تھا بس سر چھپانے کا ٹھکانا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ اماں بابا مرتے سے زمین، جائداد بھی نہ چھوڑ گئے تھے کہ اسے بیچ کر پیٹ کا دوزخ بھرتا یا گزر اوقات کے لیے اناج ہی اکٹھا کر لیتا۔ بھوک بھوگ ہی میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ پورے علاقے میں کوئی ایسا نہ تھا جو دو بول ہمدردی کے بولتا۔ سر پر ہاتھ رکھتا۔ تھک ہار کر ڈتو نے روزی روٹی کے لیے شہر کا رخ کیا۔ ادھر، ادھر جہاں مزدوری ملتی، کر لیتا۔ وہیں اس کی ایک بوڑھے مزدور سے ''دوستی'' ہوگئی جو ''نقل مکانی'' کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور ایک چاند چہرہ بیٹی کا بوجھ کاندھوں پر لیے ہوئے تھا۔ جسے سر سے اتار پھینکنے کے لیے اسے ڈتو مل گیا تھا۔ باجوں شہنائیوں کی حاجت نہ تھی، پرانے کپڑوں میں ہی اپنی بیٹی کو ڈتو کے حوالے کر دیا۔

مولوی صاحب کو دینے کے لیے ڈتو نے کچھ رقم جوڑ رکھی تھی۔ رخصتی بھلا کہاں ہوئی تھی۔ کرائے کا ایک کمرا جہاں دولہا دلہن نے شب عروسی بتائی اور بوڑھا باپ باہر فٹ پاتھ پر آگ جلا کے رات کاٹتا رہا۔

ڈتو کے حالات سے بخت نور بھی بے خبر نہ تھی گھر ٹھکانا نہ سہی مگر دونوں کو خود پر بھروسا تھا۔ دونوں نے مل جل کر مزدوری کی ٹھانی۔ بختو لوگوں کے بھانڈے مانجھتی اور جھاڑو دیتی۔ ڈتو دن بھر منڈی میں مزدوری کرتا۔ شام ڈھلے دونوں تھکے ہارے گھر کو لوٹتے اور باتیں کر کے ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے۔ شہر کی تابڑ توڑ مہنگائی نے کمر توڑ ڈالی تھی اس لیے انہوں نے جمع شدہ پونجی سمیٹ کر بستی جانے کا فیصلہ کیا۔ بستی آتے ہی ڈتو نے اپنے گھروندے کی لیپا پوتی کر کے ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کھول لی۔ باری باری ڈتو اور بخت نور جسے بستی والوں نے بختو کا نام دیا تھا، دکان پر بیٹھنے لگے۔

ڈتو کو کبھی کبھار سامان لینے کے لیے شہر بھی جانا پڑتا تھا۔ بختو دو چار دنوں میں ہی اپنے برتاؤ، من بھاؤنی مورت اور سیدھے سبھاؤ، بھولی بھالی باتوں کے سبب بستی میں سب کو اچھی لگنے لگی۔ ملی جلی اردو سرائیکی میں اس کی بولی کا مزہ لینے کے لیے کئی عورتیں اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ سودا بھی بکنے لگا اور دکان بھی خوب چل پڑی۔

رفتہ رفتہ ڈتو اور بختو کو اپنی خوش حالی کے خواب آنے لگے اور وہ اپنی دکانداری بڑھانے کا بھی سوچنے لگے۔ اس ہنسی خوشی کے دنوں میں اچانک ہی بختو کے نصیب آڑے آ گئے۔ بستی کا لوفر ملک سونہارے کے دل کو بختو بھا گئی۔ اس بار جب وہ اپنی ڈیوٹی سے لوٹا تو دوسرے ہی دن وہ پرچون کی دکان پر جا پہنچا۔ بنی سنوری، بال سلجھائی بختو اس کے تن، من میں آگ بھڑکا گئی اور وہ اپنی آگ بجھانے کے لیے ڈیوٹی پر واپس جانا ہی بھول گیا۔ پولیس کی ٹریننگ میں اسے یہی بتایا گیا تھا کہ مورچا سامنے ہو تو پیٹھ دکھانا بزدلی ہوتی ہے۔ وہ بھی مورچے پر دھونی رما کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے ''شاہ خرچی'' سے کام نکالنے کی کوشش کی۔ یہ حربہ بیکار گیا۔ ڈتو بھی اس کی خرمستیاں دیکھ رہا تھا۔ کمزور تھا اس لیے ہر کمزور کی طرح اپنے غصے کو پی گیا۔ کام بنتا نہ دکھائی دیا تو ملک سونہارا زور زبردستی پر اتر آیا۔ باری باری وہ اور اس کے دوست دکان کے باہر پہرا دینے اور آوازے کسنے لگے۔

دکان جو صبح سویرے کھل جاتی تھی، دیر سے کھلنے اور جلد بند ہونے لگی۔ بستی کی عورتوں نے بھی دکان کے آگے آوارہ لڑکوں کا جمگھٹا دیکھا تو ان کا بھی آنا جانا کم ہو گیا۔ ہوتے ہوتے دکان داری بھی کم ہو گئی اور آخر کار دکان بند ہو گئی۔ دکان میں پڑا سامان بھی اونے پونے داموں بک گیا۔ ترازو، باٹ بھی اپنا وزن گنوا کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ لوفروں نے کھلی دھمکی ڈتو کو دے دی کہ اگر دکان چلانی ہے تو ترازو ہمارے ہاتھ رہے گا۔ ڈتو اور اس کی بیوی سیدھے سادے، بے بس ضرور تھے لیکن انہیں دکان بند کرنا تو گوارا تھا مگر کسی بھی قیمت پر اپنی ناموس بیچنا اور ترازو کی ڈنڈی ملک سونہارے اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ دینا منظور نہیں تھا۔

ڈتو نے بے روزگار ہو کر بھوکا مرنا قبول کر لیا۔ بستی والوں سے یہ صورتِ حال ڈھکی چھپی نہ تھی۔ جیسا کہ ہر بستی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں ویسے ہی بستی میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے۔ جو کسی مصیبت زدہ کی ڈھارس بندھانے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ لوفر لفنگوں کے منہ لگنے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے تھے مگر ڈتو اور ا

تھے۔ انہوں نے ملک سونہارے کی زیادتیوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھوتا کر رکھا تھا۔ ایسے ہی وسیع القلب لوگوں میں سے ایک بھلے آدمی نے اپنے حصے کے پانچ بیگھے واہی بیجی کے لیے ٹھیکا پر دے دیے۔ دونوں میاں بیوی ایک بار پھر پوری تندہی سے محنت مزدوری پر ڈٹ گئے۔ فصل تیار ہو گی تو پریشانیوں میں کمی واقع ہو گی۔ انہوں نے فصل کی رکھوالی کے لیے کھیتوں میں ایک جھونپڑی بھی ڈال لی اور وہیں رات دن رہنے لگے۔

ایک رات جب رم جھم کی پھوار، اور آسمان کو بادلوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا، لوفروں کا ٹولا، نشے میں دھت، ڈانگوں سوٹوں سمیت جھونپڑی کی دہلیز پر آن پہنچا۔ اس سے پہلے کہ سویا ہوا ڈتو جاگتا اور جوابی کارروائی کرتا۔ لفنگوں نے مار دھاڑ شروع کر دی اور ڈتو کو چارپائی سے رسیوں کے ذریعے باندھ دیا اور بختو کو جھونپڑی سے اٹھا کے لے گئے۔ چیختی چلاتی، دہائیاں دیتی بختو کو کھیتوں کے درمیان لے گئے اور پانچ بندوں نے اسے اپنی وحشت و بربریت کا نشانہ بنا ڈالا۔

بختو جو ملی جلی اردو سرائیکی بولتی تھی اور جس کی بولی کا بستی کی عورتیں خاص طور پر مزہ لیتی تھیں۔ بختو جسے ڈتو شہر سے لے کر آیا تھا۔ اس سے اس کے نازک جسم و جاں پر قیامت کی گھڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس کی چیخیں نہ آسمان تک پہنچیں نہ بستی والے جاگے۔ پانچ بندے باری باری اسے اپنی مردانگی کا یقین دلاتے رہے۔ ان میں سب سے آگے وہ تھا جو دور پار کے ایک تھانے میں سپاہی تھا اور جو اپنے افسر کو رشوت دے کر حاضری لگوا لیتا تھا۔ جس نے ڈتو کی بیوی کو پیسوں کا لالچ دیا۔ یوں دال نہ گلی تو دھونس دھاندلی پر اتر آیا۔ دکان بند کرائی۔ آخر کار زبردستی اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا۔ سب کچھ ہو گیا تو جاتے جاتے اپنے گزرے دنوں کا حساب چکانے کے لیے اپنے چاقو کی تیکھی دھار سے اس کی ٹانگ پر ایک لمبی لہو کی لکیر کھینچتا چلا گیا کہ جب تک جیے گی یاد کرتی رہے گی۔

یہی وہ نشان تھا جو بختو نے اس روز حاکم عورت کے بند کمرے میں اسے دکھایا تھا۔ جسے دیکھ کر حاکم عورت بھی رو پڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ اس نے اپنے ماتحتوں سے بختو کی فریادی عرضی تیار کرائی۔ ضلع کے سب سے بڑے افسر کو اس وقوعے کی رپورٹ بھیجی اور اپنے تئیں دہائی کے

ف ہو گا۔

پنچایت

بڑی بوتل

گھر میں روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر میاں جی نے اپنی دردناک زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ جوڑیا بازار کی ایک دکان پر پہنچے اور ایک سریع الاثر زہر طلب کیا۔ دکان دار نے انکار کر دیا۔ وہ زہر اجازت نامے کے بغیر بیچنا جرم تھا۔

''اجازت نامہ تو نہیں ہے۔'' میاں جی نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ کاغذ ہیں... انہیں دیکھ لو!''

دکان دار نے غور سے ان دونوں کاغذوں کو دیکھا۔ وہ دونوں میاں جی کے دو نکاح ناموں کی فوٹو کاپیاں تھیں۔

وہ دیکھتے ہی دکان دار نے ملازم کو آواز لگائی۔ ''جلدی سے بھائی صاحب کو سنکھیا کی بڑی بوتل دے دو!''

(کراچی سے امتیاز احمد کا تعاون)

ضلع کے ڈی پی او کو اپنا بیان دے کر اور ڈاکٹری معائنہ کرانے کے بعد دونوں میاں بیوی جب اپنی بستی کے بس اسٹاپ پر اترے تو ایک بار پھر انہیں اغوا کر لیا گیا۔ بندوق کی نوک پر اس کے انگوٹھے کے نشان لیے گئے۔ اس کاغذ پر لکھا تھا کہ پنچایت نے معاملہ سننے کے بعد فیصلہ دیا ہے۔ اب مجھے ملک سونہارے اور اس کے ساتھیوں سے کوئی شکایت نہیں۔ پنچوں کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔ میں اس معاملے میں اپنی طرف سے درج کرائی جانے والی رپورٹ واپس لیتی ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی سرائیکی بولنے والی وہ شہر میں رہنے والی پنچوں کا فیصلہ مان گئی۔

کون تھے وہ پنچ؟ اس بات کا اُتا پتا کسی کو نہ چلا۔ معاملہ تو خیر رفع دفع ہو گیا۔ غریب رو دھو کر چپ ہو گئی۔ شہر کا سپاہی ہر الزام سے بری ہو گیا۔

کچھ مہینوں بعد لوگ ان باتوں کو بھول گئے... مگر ابھی گردوزیادہ بیٹھی بھی نہ تھی کہ ایک بار پھر آندھی چلی اور بستی والوں کو گزری باتیں یاد آ گئیں... شاید اس لیے کہ عید سے ایک رات پہلے انہی لفنگوں کی ٹولی کے سردار ملک سونہارے نے اپنے مزارعے کے بیٹے سے وعدے پر ملنے کے لیے جانے والی اپنی بہن کو موقع پر دبوچ لیا۔ ''کالا'' تو بھاگ گیا لیکن ''کالی'' کو اس نے گلا دبا کر مار دیا اور مقامی پولیس کی جیبیں بھرتا وہ شہر اپنی ڈیوٹی پر واپس چلا گیا۔ کون جانے؟ اس بار بستی کی پنچایت میں پنچوں کا فیصلہ کیا ہو گا؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

فیل خانہ

امجد رئیس

ہر کھیل
کے کچھ
اپنے لوازم
خاص ہوتے
ہیں... اِن رموز
کو ایک کھلاڑی ہی
سمجھ سکتا ہے...
کھیل کی بنیاد پر تحریر
کردہ ایک مختصر نادر
کہانی... کمال کی بات یہ تھی
کہ اس کا ہر کردار شطرنج کے گرد
گھوم رہا تھا... اور شطرنج کی
بساط ان سے چمٹی ہوئی تھی۔

کھیل ہی کھیل میں زندگی کا پانسا پلٹ دینے والی بازی

پرویز اختر کی شطرنج کے مہرے ہاتھی دانت کے تھے۔ اُن مہروں پر گرد کی تہ موجود تھی۔ بساط پر کھیل نامکمل رہ گیا تھا اور یہ بازی پرویز اختر کی زندگی کی آخری بازی ثابت ہوئی تھی...

ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹوٹے کہیں کہیں راکھ کے ڈھیر میں سے جھانک رہے تھے۔ راکھ کی چھوٹی سی ڈھیری کسی قبر کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

سونیا نے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ سونیا اس کمرے میں نہیں تھی جہاں پرویز کی موت واقع ہوئی تھی۔ لاش کے قریب شطرنج کی بساط پر ادھوری بازی جوں کی توں موجود تھی۔ پرویز کی تدفین چند روز قبل کر دی گئی تھی۔

انسپکٹر شہزاد فردی ایک سب انسپکٹر کے ہمراہ جائے واردات پر موجود تھا۔ وہ ضروری ہدایات جاری کر رہا تھا۔

''مسز سونیا! آپ اس کمرے سے دور رہیں... یہ ضروری ہے کہ وہاں کسی چیز کو نہ چھیڑا جائے۔'' شہزاد فردی نے پرویز کی بیوہ سے کہا۔ ''بظاہر یہ ہارٹ فیل کا طبعی کیس ہے۔ تاہم تفتیش کی تکمیل تک ضروری ہے کہ وہاں کسی چیز کو نہ چھوا جائے۔'' اول دن سے وہ یہاں کے متواتر چکر لگا رہا تھا۔ سونیا سے یہ بات اس نے پہلے روز بھی کہی تھی۔

سونیا نے کچھ بولنا چاہا لیکن پھر خاموشی کو ترجیح دی۔ تفتیش والی بات اسے عجیب لگی تھی۔ یعنی پولیس پرویز کی اچانک موت کی ''وجہ'' کو اس طرح تسلیم کرنے کے لیے فی الفور تیار نہیں تھی۔

سونیا ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ سے پوری طرح مطمئن لگ رہی تھی کہ موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی ہے... اگرچہ اس [illegible] تھیں۔ سونیا تفتیش [illegible]

رہی تھی۔ شہزاد فردی کے عام سے انداز نے بھی اس کے خیال کو تقویت بخشی تھی۔ تاہم کئی روز گزرنے کے باوجود پولیس کی دلچسپی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ جبکہ پولیس کا معمول تھا کہ اس قسم کے کیسز کی فائلز وہ جلد بند کرنے کی کوشش کرتی تھی... جبکہ انسپکٹر شہزاد فردی کا آنا جانا مسلسل لگا ہوا تھا۔

سونیا، شہزاد فردی کی ساکھ سے بے خبر تھی۔ انسپکٹر شہزاد فردی کئی روز سے سے وہاں آ رہا تھا جبکہ ایک پولیس اہلکار اس نے مستقل وہاں چھوڑا ہوا تھا۔ جو اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ڈیوٹی تبدیل کرتا رہتا تھا۔

[illegible]

بڑی بڑی آنکھوں کے باعث وہ عام پولیس والوں سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب ناقابلِ فہم اداسی کی ہلکی سی جھلک ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔

آنکھوں کی وجہ سے، سونیا کو اس کی شخصیت میں ہالی ووڈ کے اسٹار نکولس کیج کی جھلک نظر آئی تھی۔

سونیا متناسب بدن کی ایک دلکش عورت تھی۔ اس کی عمر بھی تیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ قدِ آدم آئینے کے سامنے پہنچ کر اس نے ہمت کر کے اپنے عکس کو دیکھا۔ اسے کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی۔ چہرے پر ہلکی سی زردی اور اُداسی تھی... آئینے میں اس کا عکس خوف زدہ تھا اور نہ ہی نروس... وہ ایک بیوہ کی طرح ہی نظر آ رہی تھی۔ تھکی ہوئی اور ناخوش۔

حالات کے پیشِ نظر حسیب تدفین کے بعد سے نہیں آیا تھا۔ حسیب اکثر پرویز کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا... اس روز بھی وہ پرویز کے ساتھ کھیل رہا تھا اس لیے اس کا کسی قدر نروس نظر آنا قدرتی بات تھی...

☆☆☆

حسیب، پرویز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہینڈسم تھا۔ علاوہ ازیں وہ شطرنج کا بھی ماہر کھلاڑی تھا۔ سونیا کو وہ دن یاد تھا جب وہ پہلی بار ایک پیٹرول پمپ پر حسیب سے ملی تھی... وہ ایک سرسری سی ملاقات تھی، تاہم دونوں پر اپنے دیرپا اثرات چھوڑ گئی تھی۔

حسیب کے آنے سے قبل پرویز، نارتھ ناظم آباد میں ڈسٹرکٹ چیمپئن تھا۔ شطرنج کے مشترکہ شوق کے باعث سونیا کو اسے پرویز سے ملوانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ قباحت یہ تھی کہ حسیب کے کھیل کا معیار قومی سطح کا تھا... جلد ہی ڈسٹرکٹ میں پرویز کی برتری ختم ہو گئی۔ تاہم دونوں کا وقتاً فوقتاً پرویز کے گھر پر شطرنج کا کھیل چلتا رہتا تھا۔

اس موقع پر سونیا بھی موجود ہوتی لیکن اس کی موجودگی کا سبب حسیب تھا۔ سونیا کو شطرنج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جلد ہی دونوں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر سے باہر ملاقاتیں شروع ہو گئیں... اور سونیا پرویز سے دور ہوتی چلی گئی... یہ اور بات کہ پرویز کو کسی قسم کا شک نہیں ہوا۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ اسے حسیب کی شکل میں ایک اچھا مضبوط پارٹنر مل گیا ہے۔ وہ حسیب سے کھیلتے وقت کافی پُرجوش نظر آتا اور کھیل میں پوری توانائی صرف کرتا تھا۔ مضبوط مدِمقابل کے باعث پرویز کا کھیل مزید بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی توجہ سونیا اور حسیب کے تعلقات کے بجائے شطرنج پر مرکوز ہوتی تھی۔ وہ اندر ہی اندر ڈویژنل چیمپئن شپ جیتنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو پھر پروونشنل اور آخر میں نیشنل چیمپئن شپ... اس کا دیرینہ خواب تھی۔

☆☆☆

وہ بدھ کا روز تھا جب خلاف معمول شہزاد فردی دوسری مرتبہ وہاں پہنچا جبکہ سونیا دوسری مرتبہ حسیب کی آمد کے لیے تیار تھی۔ شہزاد فردی کی شکل نے اس کی طبیعت مکدر کر دی... وہ ایک مضبوط اعصاب کی عورت تھی اس لیے اپنے تاثرات چھپانے میں کامیاب رہی۔

وہ اسے نشست گاہ میں لے آئی۔ سونیا صاف محسوس کر رہی تھی کہ شہزاد فردی بغور اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ تاہم اس نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ شہزاد فردی کے انداز میں کوئی اَن دیکھی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں، مسز پرویز؟''

''بہتر، پہلے سے بہتر... میری کوشش ہے کہ میں اس منحوس دن کے بارے میں زیادہ نہ سوچوں... مجھے اس کمرے سے ڈر لگنے لگا ہے۔'' سونیا نے جواب دیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ کسی ملازمہ کے ذریعے اس کی صفائی کروا دوں۔ ایک ہفتہ ہونے والا ہے۔''

''پلیز ایک آدھ روز اور صبر کریں۔'' شہزاد فردی نے سگار نکالا۔

سونیا نے نڈھال انداز میں شہزاد فردی کی آنکھوں میں جھانکا اور وہ سوال کر ہی ڈالا جسے وہ کئی روز سے ٹال رہی تھی۔ ''انسپکٹر کیا آپ کو ڈاکٹر کی رپورٹ پر شک ہے؟''

''نہیں ایسا تو نہیں ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''لیکن میں آپ کے شوہر کی اچانک موت سے مطمئن نہیں ہوں۔''

یہ کھلا انداز کسی دھماکے کی طرح تھا جس کی گونج سونیا برداشت نہ کر سکی۔ اس کے تاثرات میں لمحہ بھر کے لیے تغیر پیدا ہو ہی گیا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے آواز کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی... دماغ میں متواتر پٹاخے سے چل رہے تھے۔ تاہم اس نے شہزاد فردی سے آنکھیں چرانے کی حماقت نہیں کی۔ اس نے دیکھ لیا کہ شہزاد فردی کی آنکھوں میں ہمہ وقت نظر آنے والا اداسی کا موہوم عکس کچھ گہرا ہو گیا۔

''مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' شہزاد فردی نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔ ''کیا آپ مجھے ایک بار پھر بتائیں گی کہ اس روز جب آپ کے شوہر اپنے دوست حسیب مرزا کے ساتھ زندگی کی آخری بازی کھیل رہے تھے تو کیا ہوا...'' وہ رک کر پھر بولا۔ ''میرا مطلب ہے کہ شاید کوئی بظاہر غیر اہم بات آپ کے ذہن سے نکل گئی ہو...''

''دیکھیے میں اس کھیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں، سوائے اس کے کہ اسے شطرنج کہتے ہیں اسی لیے میں کھیل کے دوران میں شاذ ہی ادھر موجود ہوتی ہوں... اس روز میں وہاں تھی اور میرا بیان پہلے ہی کی طرح ہے... ویسے بھی میرا مشاہدہ ہے کہ شطرنج کے دو کھلاڑی عموماً خاموشی سے ہی کھیلتے ہیں۔''

سونیا کا جواب سن کر شہزاد فردی خاموش رہا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی گھنگریالے سیاہ بالوں کی ایک لٹ سے کھیل رہی تھی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

پھر شہزاد فردی گویا ہوا۔ ''مسز پرویز! شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں کالج کے زمانے سے شطرنج کھیلتا رہا ہوں... یہ ایک خاموش کھیل نہیں ہے۔ بظاہر کھلاڑی گھنٹوں خاموشی سے کھیلتے ہیں لیکن... اندرونی طور پر کھلاڑی کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوتی ہے اور کھیل کے اتار چڑھاؤ کے حساب سے ہیجانی کیفیت بڑھتی جاتی ہے... حرکتِ قلب بڑھ جاتی ہے اور بلڈ پریشر بھی... شاید آپ یقین نہ کریں کہ کرسی پر آرام سے بیٹھ کر بظاہر بے ضرر سا کھیل ہائی لیول پر اتنی توانائی خرچ کرتا ہے۔ جتنی میدان میں کھیلتے ہوئے پیشہ ور فٹ بالر کو بھی نہیں کرنی پڑتی۔'' شطرنج اعصابی توانائی کو نچوڑ لیتی ہے۔'' شہزاد فردی خاموش ہو گیا۔

سونیا کچھ مطمئن دکھائی دی۔ ''جی ہاں۔'' پرویز کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ویسے بھی وہ کبھی ایک مضبوط دل کے مالک نہیں رہے۔''

شہزاد [illegible]

تصدیق کر دی۔

پہلی بار پولیس انسپکٹر کی طرح سپاٹ لہجے میں صاف گوئی سے کام لیا۔

سونیا کا دل زور سے دھڑکا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''یہ کھیل اتنی سنجیدگی سے نہیں ہو رہا تھا کہ کھلاڑی کو شدید دباؤ برداشت کرنا پڑتا... میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی گرینڈ ماسٹر کی سطح کا گیم نہیں تھا اور نہ ہی کسی بین الاقوامی چیمپئن شپ کے لیے کھیلا جا رہا تھا۔'' شہزاد فردی کی آنکھوں میں اداسی بڑھ گئی۔ عجیب انداز تھا اس کا۔ یہ اداسی کا عنصر جذبات سے غیر متعلق تھا... مثلاً جیسے کوئی بے خیالی میں مسکرا دے جس کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سونیا اسے گھور رہی تھی۔ تاہم اس کے اعصاب ابھی تک قابو میں تھے لیکن اسے وہ انداز پسند نہیں آیا جس انداز میں شہزاد فردی اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ آخری چال آپ کے شوہر نے چلی تھی۔ پھر وہ کرسی میں پیچھے کی جانب گر گیا۔ دوبارہ سیدھا ہونا اسے نصیب نہیں ہوا؟''

''ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔'' سونیا نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں میری اس بات پر شک ہے؟''

''جلد بازی سے کام مت لو، تم اپنے سابقہ بیان پر دستخط کر چکی ہو۔''

''بالکل اور تم حسیب سے بھی تصدیق کر سکتے ہو... وہ آنے والا ہو گا۔'' سونیا نے کہا۔ لیکن اس کے اندر بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ شہزاد فردی آج بالکل مختلف نظر آ رہا تھا پھر اس نے وہ سوال کیا۔ جس نے سونیا جیسی عورت کے اعصاب توڑ ڈالے۔ یہ سوال نہیں دھماکا تھا۔

''ہاں، اچھا خیال ہے۔ میں حسیب سے بات کرنا پسند کروں گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بتائیے کہ آپ کبھی ''ڈریم بیچ'' ریسٹورنٹ گئی ہیں؟''

سونیا کو خود کو سنبھالنے میں شدید جدوجہد کرنی پڑی [illegible] سوال کی سنگینی کو

کے

ساتھ کئی شامیں گزار چکی تھی...

''ہاں، میں وہاں کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ جاتی ہوں۔'' سونیا کی آواز کی مضبوطی میں رخنہ پڑ چکا تھا۔

شہزاد کے لب زہرخند انداز میں کھنچ گئے۔ ''دوستوں سے مراد؟''

''عزیز، احباب... شناسا وغیرہ۔'' سونیا نے پہلو بدلا۔

''کیا ان میں حسیب بھی شامل ہے؟'' شہزاد مزدی نے تیز نظروں سے سونیا کی آنکھوں میں جھانکا۔

''دیکھیے... پرویز کی مشاغل کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے رکشے میں اِدھر اُدھر گھومنا پڑتا ہے لیکن یہ میری عادت نہیں ہے۔''

''میرا سوال کچھ اور تھا۔''

سونیا نے غصہ ضبط کر کے جواب دیا۔ ''ہاں چند بار حسیب بھی وہاں آیا تھا۔ اس کی بھی ممبر شپ ہے وہاں پر...''

''جانتا ہوں، وہاں ممبر کے سوا کوئی نہیں جا سکتا۔'' ''لیکن آپ کی ممبر شپ کئی برس پرانی ہے... جبکہ حسیب نے چند ماہ قبل ممبر شپ لی ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نیز کیا یہ نجی نوعیت کے سوالات نہیں ہیں؟'' سونیا نے اعتراض کیا۔

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یا گزشتہ چند روز میں کرتا رہا ہوں... یہ سوالات اس تفتیش سے گہرا تعلق رکھتے ہیں... اور...''

شہزاد کی بات ادھوری رہ گئی اور اطلاعی گھنٹی کی آواز گونج اٹھی۔

سونیا کو اندازہ تھا کہ کون ہو گا پھر بھی اس نے انٹرکام پر سوال کیا اور بٹن دبا کر آٹومیٹک لاک کھول دیا۔ کچھ دیر بعد حسیب مرزا ڈرائنگ روم میں تھا۔ شہزاد فردی کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا... پھر آگے آ کر مصافحے کے لیے ہاتھ... بڑھا دیا۔

حسیب محتاط ہو گیا۔ اس نے خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ اس کی آنکھیں سونیا کے چہرے کو فوکس کیے ہوئے تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہزاد بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ اچانک بولا۔ ''بیٹھ جائیں مسز حسیب۔'' تاہم شہزاد فردی لہجے کی کڑواہٹ کو دبانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

''مسز پرویز مجھے بتا رہی تھیں کہ اس روز کیا ہوا۔'' شہزاد فردی نے پھر کہا۔ ''پرویز صاحب آخری چال چل کر کرسی میں گر گئے تھے... یقیناً آپ بھی اس بیان کی تصدیق کریں گے۔''

حسیب نے سر ہلایا۔ ''ایسا ہی ہوا تھا۔''

شہزاد کھڑا ہو گیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ پرویز کی شطرنج کی ساکھ اچھی تھی۔ آیئے گیم روم میں چلتے ہیں۔''

حسیب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک ڈرائنگ روم میں دو پولیس اہلکار داخل ہوئے۔ شہزاد فردی نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا لیکن سونیا اور حسیب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تاہم وہ شہزاد فردی کے ساتھ کھیل کے کمرے میں آ گئیں۔

سونیا کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اداس آنکھوں والے نے دال کالی کر دی ہے... تاہم وہ اس معمے کو حل نہیں کر پا رہی تھی... ڈاکٹر سرٹیفکیٹ دے چکا تھا۔ ہر چیز بظاہر ٹھیک تھی۔ ''ڈریم چیز'' کے انکشاف نے اسے ہلا دیا تھا... لیکن اس سے کیا ثابت ہو سکتا ہے؟ وہ ساکت، بے جان سی کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ دونوں پولیس اہلکار اسے دیکھ رہے تھے۔

دفعتاً حسیب، کھیل کے کمرے سے برآمد ہوا... اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اعصاب منتشر محسوس ہو رہے تھے...

''تم نے بساط پر مہروں کو چھوا تھا۔'' وہ جیسے چیخ پڑا۔ ''تم احمق! کم عقل عورت... تم نے سب کچھ برباد کر دیا۔''

حسیب کے چہرے کی سفیدی، سرخی میں بدلنے لگی...

سونیا نے بے عزتی کے ساتھ دہشت محسوس کی۔

''سونیا پرویز، تم لوگوں کا منصوبہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ حسیب صاحب تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آخری چال آپ کے مقتول شوہر نے نہیں چلی تھی۔'' شہزاد فردی نے پہلی بار مقتول کا لفظ استعمال کیا۔ سونیا گم صم کھڑی تھی۔

''پوسٹ مارٹم میں، زہر کی ''مخصوص'' قسم دریافت کر لی گئی تھی جو مقتول کے معدے میں تھی۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن جدید فارنسک تکنیک کے ذریعے چند سراغ ہمیں مل گئے تھے۔ گھبراہٹ میں چند مہرے بساط پر لڑھک گئے تھے جن کو بعد ازاں حسیب کی غیر موجودگی میں تم نے دوبارہ سیٹ کر دیا تھا۔ غالباً اس وقت حسیب صاحب پولیس کو فون کر رہے تھے۔ کیونکہ آپ ایک بیوہ کی کامیاب اداکاری میں مشغول تھیں۔''

سونیا کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ وہ شہزاد فردی کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔

''اس سے کیا ہوتا ہے، ڈاکٹر...'' سونیا کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کو شطرنج کے بارے میں کچھ پتا نہیں... ڈاکٹر اور پولیس مین بھی عموماً شطرنج نہیں کھیلتے... مسز سونیا پرویز آپ نے مہروں کو ہاتھ لگا کر خوف ناک غلطی کی۔'' شہزاد فردی کہتا رہا۔ ''پہلے دن بساط دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آخری چال آپ کے شوہر نے نہیں چلی تھی۔''

سونیا پھٹی پھٹی نظروں سے شہزاد فردی کو دیکھ رہی تھی۔

''لہٰذا میں نے فوراً ہی پوسٹ مارٹم کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ تاہم ہمیں اعتراف جرم کی بھی ضرورت تھی... اعتراف کے بعد اس تفصیل میں جانا بیکار ہے کہ پچھلے دنوں میں کہاں کہاں بھاگتا رہا... بشمول ڈریم چیز'' شہزاد فردی نے اشارہ کیا اور پولیس اہلکاروں نے حسیب کے لیے ہتھکڑیاں نکال لیں۔

''کس نے کیا ہے اعتراف؟'' سونیا چلا اٹھی۔

شہزاد فردی نے اس کے مختل حواس کو نظر انداز کیا اور گویا ہوا۔ ''میرا قیاس تھا کہ حسیب کی نظر جب دوبارہ چیس بورڈ پر پڑیں گی تو وہ بوکھلائے بغیر نہیں رہے گا اور ہمارے مطلب کی کوئی نہ کوئی بات اس کے منہ سے ضرور نکلے گی۔ خادم شاطر کی نفسیات سے خوف واقف ہے۔'' شہزاد فردی مسکرایا۔ ''ہمیں مطمئن کرنے کے لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہی کہہ گیا۔''

''آخری سوال۔'' شہزاد فردی نے سونیا کو مخاطب کیا۔ ''آپ کے شوہر سفید مہروں سے کھیل رہے تھے؟''

''ہونہہ...'' سونیا نے مردہ آواز میں جواب دیا۔

''حسیب صاحب بھی ادھورے کھیل میں بساط پر لگے مہروں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔''

''جو بکواس کرنی ہے... کر ڈالو۔'' سونیا پھٹ پڑی۔

''کوئی شاطر دونوں فیل ایک قطار میں نہیں رکھ سکتا کبھی نہیں رکھ سکتا... یہ ناممکن ہے... اور آپ نے گرا ہوا کالا فیل بھی سفید خانے میں رکھ کر لاعلمی میں فاش غلطی کی۔''

شہزاد فردی نے اُداس نظروں سے باری باری حسیب اور سونیا کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔

امکانات و تغیرات کے بغیر کچھ ممکن نہیں... یہ امکانات و تغیرات کبھی حسین ہوتے ہیں اور کبھی اذیت و ایذا کا سبب بن جاتے ہیں... نوجوانی کے جوش و جذبوں میں وہ طوفانی تُندی و تیزی ہوتی ہے... کہ سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی... جب طوفان گزر جاتا ہے... لہریں ہموار اور سُبک ہو جاتی ہیں تو ہر بات آئینے کی طرح صاف و شفاف نظر آنے لگتی ہے... زندگی کے ابتدائی موڑ پر بچھڑ جانے والے محبت کے پروانے... جب ملے تو سلگتی چنگاری ایک بار پھر بھڑک اٹھی...

بازیِ عشق میں دغابازی کی ملاوٹ کا تلخ و کسیلا واقعہ

حساب برابر

لبنیٰ زبیر

چالیس سالہ ایس پی شرافت فتح خان لنچ سے فارغ ہوا تھا اور اس وقت کسی قدر غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ لنچ کے بعد اکثر تھانوں میں سستی کا راج ہوتا ہے۔ رات بھر کی محنت مشقت اور صبح سویرے آنے والوں کو نمٹاتے ہوئے اہلکار دوپہر تک خاصے نڈھال ہو چکے ہوتے ہیں اور اس پر مرغن لنچ سونے پر سہاگا کا کام کرتا ہے اس لیے دوپہر کا وقت تھانے میں سکون اور امن کا وقت ہوتا ہے لیکن شرافت فتح خان اول تو تھانے میں نہیں تھا، وہ انویسٹی گیشن میں تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور ہیڈ کوارٹر میں براہِ راست ڈی آئی جی کے ماتحت تھا۔ دوسرے اسے لنچ کے بعد سونے کی عادت نہیں تھی۔ برسوں سے اس کا معمول تھا۔ وہ صبح چھ بجے اٹھ جاتا اور اس کے بعد بارہ بجے سے پہلے بستر پر نہیں جاتا تھا۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہ معمول برقرار رہا تھا۔ ایکسر سائز اور معمولات کی باقاعدگی نے اسے فٹ رکھا ہوا تھا۔

شرافت خان کے خاندان میں پولیس والوں کی بھرمار تھی۔ اس کا باپ خود ریٹائرڈ ڈی ایس پی تھا۔ اس کے دو بھائی پولیس میں تھے۔ چاچاؤں اور ماماؤں میں بھی پولیس والوں کی کمی نہیں تھی۔ پیچھے سے کھاتا پیتا آیا تھا اور ملازمت میں آنے کے بعد بھی شرافت خان نے کھانے پینے میں کوتاہی نہیں کی تھی لیکن وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کا عادی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس ملک میں کسی پولیس والے کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا۔ جس سال اس کی شادی ہوئی، اسی سال وہ انسپکٹر بنا اور اب اس کے چار بچے تھے۔ اس کی بیوی سارہ شادی کے دس سال بعد بھی خوب صورت تھی اور اس کے ہوتے ہوئے شرافت خان کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ماضی میں اس کے روابط کئی خوب صورت عورتوں سے رہے تھے۔ البتہ شادی کے بعد اس نے یہ ڈگر چھوڑ دی تھی اور صرف اپنی بیوی کا ہو کر رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اب موقع نہیں رہا تھا۔ مواقع تو ایس پی بننے کے بعد بے حساب ہو گئے تھے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا کہ کم سے کم اس معاملے میں قدم نہیں بہکنے چاہئیں۔

چاق و چوبند ہونے کے لیے شرافت خان نے چائے منگوائی اور کمپیوٹر پر انویسٹی گیشن کے لیے آنے والی کچھ درخواستیں دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے کمپیوٹر اسکرین سے نظر ہٹا کر موبائل دیکھا۔ ایک اجنبی نمبر تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں آ گئیں۔ وہ عام طور سے اجنبی نمبر سے آنے والی کالز ریسیو نہیں کرتا تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی اور گھنٹی بج کر بند ہو گئی۔ اس کے ایک منٹ بعد ایس ایم ایس ٹون بجی اور اس بار اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ ایس ایم ایس اسی نمبر سے تھا۔ اس نے پڑھا جہاں ایک سطر میں لکھا تھا۔

''شرافت! آئی ایم شیبا... پلیز پک مائی کال۔''

شرافت خان کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گیا۔ اس کا ذہن ماضی کے ان گوشوں میں چلا گیا جب وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ کوایجوکیشن کالج تھا اور شیبا اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ شرافت آج بھی سرخ و سفید رنگ کا وجیہہ آدمی تھا۔ اس وقت اس کی خوش روئی دیکھنے والی تھی۔ لڑکیاں اسے کالج کا خوب صورت ترین لڑکا کہتی تھیں۔ اسی طرح شیبا کا شمار کالج کی خوب صورت ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ دوسروں نے ان کے علم میں لائے بغیر ان کی جوڑی بنا دی تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہ بات ان تک بھی پہنچ گئی تو وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس وقت شرافت شیبا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ اس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے ہے۔ وہ صبح ایک شاندار کار میں آتی تھی۔ ڈرائیور اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولتا تو وہ نیچے قدم رکھتی تھی۔

اس کے بدن پر یونیفارم قیمتی کپڑے کا ہوتا تھا اور اس کے نازک پیروں میں مہنگے ترین سینڈلز ہوتے تھے۔ جیولری اور میک اپ پر پابندی تھی لیکن وہ اس کے بغیر بھی سب سے حسین نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ شرافت کو پتا نہیں چلا کہ چار سال کیسے گزرے۔ صرف شیبا کی خاطر وہ روز کالج جاتا تھا ورنہ اسے پڑھنے لکھنے سے بہت زیادہ شغف نہیں تھا۔ فائنل ہوئے اور پھر اسے پتا چلا کہ اب وہ اور شیبا روز نہیں مل سکیں گے۔ جس دن آخری پرچہ تھا، اس دن وہ ایک ریستوران میں ملے۔ یہ پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ وہ کہیں باہر ملے تھے۔ اس ملاقات میں شرافت نے کھل کر اس سے حالِ دل کہا۔ اس کا خیال تھا کہ شیبا اس کے اظہارِ محبت کو قبول کر لے گی لیکن وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنک پیتی رہی۔ جب شرافت کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تو وہ بولی۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔''

شرافت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ گزشتہ چار سالوں میں شیبا کی ایک ایک ادا اور بے شمار جملوں نے اسے بارہا یقین دلایا تھا کہ اس کے دل میں بس وہی ہے اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ''کیوں... کیوں... شیبا؟''

''کیونکہ میں ایک طوائف زادی ہوں۔'' شیبا نے اسی سکون سے کہا۔ ''میں اس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں جس میں نسب ماں سے چلتا ہے اور باپ کو کوئی نہیں جانتا۔''

یہ شرافت کے لیے زیادہ بڑا شاک تھا۔ اس نے ناقابلِ یقین لہجے میں کہا۔ ''تم غلط کہہ رہی ہو... مذاق کر رہی ہو۔''

''شرافت! تمہارے خیال میں کوئی لڑکی اس قسم کا مذاق کر سکتی ہے؟ [illegible] لیے بھیجا تھا کہ میں

بھی سیکھ سکوں، یہ سب آئندہ میرے کام آئے گا۔''

یہ شرافت کے لیے ایک اور ناقابلِ یقین بات تھی۔

''تم صرف اسی لیے کالج میں آئی تھیں؟''

''ہاں... ورنہ اور کس لیے آتی؟'' شیبا نے اپنے ریشمی بال سنوارے۔ ''ہمارے پیشے میں اصل اہمیت تو جسم اور خوب صورتی کی ہوتی ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔ البتہ تعلیم اور دوسری چیزوں سے مارکیٹ اچھی ہو جاتی ہے۔''

شرافت کو بڑی مشکل سے یقین آیا اور جب آیا تو اس نے شیبا سے درخواست کی۔ ''ٹھیک ہے، تم نے اچھا کیا جو مجھے حقیقت بتا دی مگر اس سے میری محبت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تمہارے خاندان سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

شیبا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''حیرت ہے تم اب بھی نہیں سمجھے۔ میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ آج ہماری آخری ملاقات ہے، کل سے مجھے اس دنیا میں داخل ہونا ہے جہاں میری نظر محبت کو نہیں صرف روپوں کو دیکھے گی۔ میری ہر رات ایک نئے پنچھی کے ساتھ گزرے گی۔''

''شیبا! تم میرے ساتھ عزت کی زندگی گزارو گی۔''

وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔ ''عزت... یہ کس چڑیا کا نام ہے شرافت خان صاحب... ہم اس چیز سے ناآشنا ہیں۔ اور یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ تم سے شادی کر کے مجھے کوئی عزت ملے گی۔ دوسروں کو چھوڑو، خود تمہارے خاندان والے مجھے منہ نہیں لگائیں گے۔ میں ابھی پاکباز ہوں، کسی مرد نے مجھے نہیں چھوا لیکن میں تیس چالیس سال بعد بلکہ مرتے دم تک طوائف ہی کہلاؤں گی۔ مجھے کیا ملے گا تم سے شادی کر کے... ذلت ہی کمانی ہے نا تو بندہ اپنی مرضی سے کمائے۔''

شرافت نے جان لیا کہ وہ شیبا کو قائل نہیں کر سکے گا، الٹا اس نے شرافت کو قائل کر لیا۔ اس ملاقات کے بعد ان کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں اور آج اس بات کو بیس سال گزر چکے تھے۔ ان بیس سالوں میں شرافت نے کبھی شیبا کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو ایک دن میں سب معلوم کر سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ ذرا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ اسے صرف کسی ایس ایچ او کو کہنا پڑتا۔ شہر کی نوّے فیصد ہائی کلاس کال گرلز کو وہ چہرے سے پہچانتا تھا مگر ان میں شیبا شامل نہیں تھی۔ اس نے اسے اپنے ذہن سے نکال دیا مگر آج [illegible] یکھ کر شرافت [illegible] یتا آیا تھا، وہ کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ دوبارہ گھنٹی بجی تو وہ چونکا اور شیبا کا نمبر دیکھ کر اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

''شرافت۔'' شیبا نے کہا۔

''بات کر رہا ہوں۔''

''سنو، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ بلا تمہید بولی۔ ''آج میں بہت مشکل میں ہوں اور تمہارے سوا کوئی مجھے اس مشکل سے نہیں نکال سکتا۔''

شرافت جو ذرا جذباتی ہو رہا تھا، شیبا کی بات پر اس کے اندر کا پولیس مین بیدار ہو گیا۔ ''معاملہ پولیس کا ہے؟''

''ہاں لیکن میں پولیس کے پاس نہیں جا سکتی۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس کے کھلنے پر میں مرنے کو ترجیح دوں گی۔''

''میں تو سمجھتا تھا کہ تمہاری زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔'' شرافت نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم میرے دفتر آ جاؤ۔''

''میں نہیں آ سکتی... پلیز شرافت! تم زحمت کر لو۔''

اس نے سوچا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں، اپنا پتا بتاؤ۔''

☆☆☆

ڈیفنس کی یہ شاندار کوٹھی اپنے منہ سے اپنے مکینوں کی امارت کا حال بتا رہی تھی۔ گیٹ پر دو باوردی گارڈز تھے۔ شرافت اپنی ذاتی کار میں آیا تھا، یہ اس حد تک ذاتی تھی کہ اس پر پولیس یا سرکاری نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ شرافت نے اپنا چہرہ سی سی ٹی وی کیمرے کے سامنے کیا تو اندر شیبا نے تصدیق کی اور گارڈز نے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔ کوٹھی کم سے کم چار کنال پر تھی اور عمارت کا طرزِ تعمیر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شرافت حیران ہوا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ شیبا اتنی شاندار کوٹھی کی مالکن ہو گی۔ پورچ میں ایک ملازم اس کا منتظر تھا۔ اس نے شرافت کی راہنمائی کی اور وہ اندر ایک خوب صورت مگر چھوٹے کمرے میں پہنچا۔ یہاں دبیز قالین کے ساتھ دو چھوٹے صوفے اور درمیان میں گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کمرا دو افراد کی نشست کے لیے مخصوص ہے۔ ملازم نے جانے سے پہلے اس سے پانی یا کسی اور چیز کا پوچھا۔ شرافت نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شیبا نے اسے کس معاملے میں مدد کے لیے بلایا ہے؟

چند منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور شیبا اندر آئی۔ شرافت نے اسے بیس سال بعد دیکھا تھا۔ وہ اس سے ایک برس چھوٹی یعنی انتالیس برس کی تھی۔ لیکن اس وقت جو شیبا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ کہیں سے انتالیس برس کی نہیں لگ رہی تھی۔ وہی متناسب بدن جواب متناسب ترین ہوگیا تھا۔ چمکتی دمکتی جلد اور چہرے کے دلکش نقوش سے وہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے میکسی نما لباس پہن رکھا تھا جو سرسراتے ہوئے اس کے جسم پر ڈھلک رہا تھا۔ وہ ہلکورے لیتی اس کے پاس آئی تو شرافت کھڑا ہوگیا۔ اس نے شیبا کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم نے اتنی ترقی کی ہوگی لیکن ذاتی طور پر تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔''

''تھینک یو شرافت۔'' شیبا نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''شکر ہے تم نے میری بات رکھ لی۔''

''ہمارا تعلق ختم ہوا تھا، دوستی نہیں۔'' شرافت نے کہا۔ ''دوستی ملنے جلنے اور تعلق سے مشروط نہیں ہوتی، دوست پچاس سال بعد ملے تب بھی دوست ہوتا ہے۔''

''اور محبت...'' شیبا نے آہستہ سے پوچھا۔

''وہ تعلق مانگتی ہے۔'' شرافت نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ختم محبت بھی نہیں ہوتی لیکن اگر تعلق نہ ہو تو پھر پہلے جیسی نہیں رہتی۔''

''باتیں ہوتی رہیں گی، یہ بتاؤ کیا پیو گے؟''

''میں سب پیتا ہوں لیکن ابھی میں صرف تمہارے کہنے پر آیا ہوں۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟''

شیبا نے گہری سانس لی۔ ''شرافت! میری کچھ ذاتی چیزیں چوری ہوگئی ہیں۔''

''ذاتی چیزیں؟'' شرافت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس بار بولتے ہوئے شیبا ہچکچائی۔ ''کچھ جیولری تھی شاید پانچ چھ لاکھ کی ہوگی۔'' اس نے یوں کہا جیسے پانچ چھ روپے کہہ رہی ہو۔ ''کچھ کیش تھا پانچ لاکھ سے اوپر ہوگا۔ لیکن اصل چیز چند تصویریں تھیں۔ مجھے زیور اور رقم کی پروا نہیں ہے لیکن وہ تصویریں ہر قیمت پر واپس چاہئیں۔''

شرافت غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''خاص تصویریں تھیں؟''

شیبا کا گلابی چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''میری تھیں... کسی وقت میں ملک صاحب نے لی تھیں۔''

''ملک صاحب کون؟''

شیبا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نہیں جانتے؟ میں ملک ہدایت اللہ کی بات کر رہی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے شادی کی تھی۔''

شرافت حیران ہوا۔ وہ کیا... ملک ہدایت اللہ کو سارا ملک جانتا تھا۔ وہ وسطی پنجاب سے تعلق رکھنے والا سیاست داں تھا اور اس کا شمار ان چند سیاست دانوں میں ہوتا تھا جو کبھی وزیر، مشیر یا کسی عوامی عہدے پر نہیں رہے لیکن سیاسی پارٹیاں اس کی محتاج ہوتی تھیں۔ اس سے قطع نظر ہدایت اللہ کی سیاست کا وہی انداز تھا جو ملک میں رائج ہے۔ وہ الیکشن سے پہلے اپنا مفاد دیکھ کر اگلی پارٹی کا تعین کرتا تھا۔ اس کی سیٹ پکی ہوتی تھی اور کیونکہ وہ وزارت یا کوئی عہدہ بھی نہیں مانگتا تھا اس لیے ہر پارٹی میں مقبول تھا۔ ہر پارٹی کی کوشش ہوتی تھی کہ ہدایت اللہ اس سے مل جائے۔ ہدایت اللہ جدی پشتی جاگیردار تھا۔ سیاست کے چالیس برسوں کے دوران میں اس کی زمینیں بڑھتی گئیں۔ صرف زمینیں ہی نہیں، اس نے بے شمار صنعتوں اور کاروبار میں بھی ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ ملک کے ہر اہم شہر میں اس کے کاروباری دفاتر اور عالی شان کوٹھیاں تھیں۔

لیکن یہ شرافت کے لیے اطلاع تھی کہ ہدایت اللہ نے شیبا سے شادی کی تھی۔ اس شاک سے سنبھل کر اس نے سوال کیا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''کل رات...''

''میں تمہاری اور ملک صاحب کی شادی کی بات کر رہا ہوں۔'' شرافت نے اس کی بات کاٹی۔

''اوہ... اسے تو بارہ سال ہو چکے ہیں۔'' شیبا نے کہا۔

''لیکن بیس سال پہلے تمہارے خیالات کچھ اور تھے۔''

''اس وقت میں ناتجربے کار تھی اور میرے منہ میں میری ماں کی زبان بولتی تھی۔ وہ کب چاہتی کہ میں شادی کر لوں اور ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔'' شیبا کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ ''آٹھ سال... پورے آٹھ سال میں اس کے ہاتھوں کھیلتی رہی اور پھر مجھے عقل آئی۔''

''یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ تمہیں ملک صاحب مل گئے۔''

''تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔'' شیبا کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ ''لیکن یہ سچ ہے کہ میں ذلت کی زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ اگر ملک صاحب نہ ملتے تب بھی میں سب چھوڑ دیتی اور بھاگنا پڑتا تو بھاگ جاتی۔''

''اوکے، میں مان لیتا ہوں تم تنگ آگئی تھیں اور تم نے اسی لیے ملک صاحب سے شادی کی اور یہ شادی بارہ سال قائم رہی۔''

شیبا افسردہ بول رہی ہوں

صاحب کے ساتھ مجھے جو سکھ ملے، وہی میری زندگی کا حاصل ہیں۔ انہوں نے مجھے سب دیا لیکن سب سے انمول چیز ان کی محبت اور ان کا اعتماد تھا۔ میں نے ان کے منہ سے ایک بار بھی کبھی اپنے ماضی کا طعنہ نہیں سنا۔ وہ عمر میں مجھ سے تیس سال بڑے تھے مگر یہ فرق بھی کبھی آڑے نہیں آیا۔ چند مہینے پہلے وہ دنیا سے گئے تو مجھے لگا میری تو کائنات ہی لٹ گئی ہے۔''

شرافت نے ہاتھ پھیلائے۔ ''یہ کوٹھی بھی ملک صاحب کی ہے؟''

''نہیں، یہ انہوں نے شادی کے کچھ عرصے بعد میرے نام کر دی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ میرے نام کیا۔ میں اور میرے بچے بہت آرام سے گھر بیٹھ کر ساری عمر کھا سکتے ہیں۔''

شرافت پھر چونکا۔ ''بچے... تمہارے بچے ہیں؟''

''کیوں، کیا میرے بچے نہیں ہو سکتے؟''

وہ جھینپ گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ آئی مین تم دیکھنے میں کہیں سے بچوں کی ماں لگتی نہیں ہو۔''

''میرے تین بچے ہیں۔ سب سے بڑا گیارہ سال کا راحت ہے، اس سے چھوٹا نو سال کا فرحت ہے اور چھ سال کی بیٹی اریبا ہے۔'' شیبا نے بتایا اور پھر ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ ''یہ تصویریں ملک صاحب نے راحت کی پیدائش کے بعد لی تھیں۔''

''اتنے عرصے سے تم نے یہ تصویریں سنبھال کر رکھی تھیں، اب ایسی کیا بے پروائی کی جو...''

''میں نے بے پروائی نہیں کی۔'' شیبا اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''تصویریں، زیورات اور رقم کے ساتھ سیف میں تھیں۔ چور نے اسے کھولا اور دوسری چیزوں کے ساتھ تصویریں بھی لے گیا۔'' کہتے ہوئے شیبا روہانسی ہو گئی۔ ''پلیز شرافت... کچھ کرو ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔''

''میرا خیال ہے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تم ہدایت اللہ کی بیوی تھیں۔ ویسے میری معلومات کے مطابق ان کی دو بیویاں اور بھی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں ہی تو ان کی تیسری بیوی ہوں۔ پہلی خاندان سے ہے، وہ اور اس کے بچے اب ملک صاحب کے وارث شمار ہوں گے۔ زمینوں کے بھی اور سیاسی اسلام بھی تھی۔ وہ

جارج بش پریشان تھے کہ ان کی مقبولیت میں روز بروز کمی آرہی ہے اور امریکی انہیں احمق تک کہنے لگے ہیں۔ انہوں نے ملکہ معظمہ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ بش کو اپنے معتمد ساتھیوں میں ذہین لوگوں کو شامل کرنا چاہیے۔ اپنی کارکردگی جتانے کے لیے ملکہ نے ٹونی بلیئر کو بلایا اور پوچھا۔ ''تمہارے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے نہ بہن... بتاؤ وہ کون ہے؟''

ٹونی نے برجستہ کہا۔ ''وہ میں خود ہوں۔''

بش نے بات گرہ میں باندھ لی۔ ڈک چینی کو بلا کر بش نے وہی سوال کیا۔ ڈک چینی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے کہا۔ ''بڑا مشکل اور ٹیڑھا سوال ہے۔ میں ابھی جواب پتا کر کے آتا ہوں۔''

ڈک چینی بھاگا بھاگا کولن پاول کے پاس گیا۔ کولن پاول نے وہ سوال سنتے ہی کہا۔ ''وہ میں ہی ہوں۔''

ڈک چینی الٹے قدموں لوٹ گیا۔ اس نے بش کو آگاہ کیا۔ ''سر! وہ بچہ کولن پاول ہے۔''

بش نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم نرے گھامڑ اور بے وقوف ہو... کولن نہیں، وہ بچہ ٹونی بلیئر ہے... ٹونی! اس نے ملکہ کے سامنے یہی بتایا تھا۔''

(دبئی سے آباد اظہار کی برجستگی)

مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔ بچے نہیں ہیں اور اس کی پی آر بہت ہے۔ جلد اسے کوئی دوسرا مل جائے گا۔ ویسے ملک صاحب نے بھی اسے بہت کچھ دیا ہوگا۔''

''لالا تو تمہیں بھی بہت کچھ ہے۔''

''کہاں... صرف بالائی ہے، اصل دودھ تو اصل وارثوں کو چلا گیا۔'' شیبا کے منہ سے جیسے اچانک نکلا اور پھر وہ یک دم چپ ہوگئی۔

''ٹھیک ہے، مجھے دکھاؤ۔'' شرافت کھڑا ہوگیا۔ ''چوری کہاں ہوئی اور چور کہاں سے آیا۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' شیبا نے کہا اور اسے کوٹھی کے اندرونی حصے میں لائی۔ یہاں بیڈ رومز تھے اور ان میں ایک بیڈ روم اس کا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین حد تک پُرتعیش تھا۔ شرافت نے پُرخیال انداز میں اس کا جائزہ لیا اور بولا۔

''ملک صاحب اس عمر میں بھی شوقین مزاج آدمی تھے۔''

شیبا جھینپی۔ ''ہاں، اللہ نے صحت اور دولت دے رکھی تھی تو شوقین کیوں نہ ہوتے۔ پھر کوئی گناہ تو نہیں کیا نا۔''

''میں نے کب کہا۔'' شرافت بولا۔ ''لیکن اب یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سب یہاں سے ہٹادو۔'' اس نے تصویروں اور مجسموں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک طرف بار بھی تھا۔ ''تمہارے بچے ہیں، کیا وہ یہاں نہیں آتے؟''

''ملک صاحب کی زندگی میں انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے بعد میں نے یہ کمرا بند کردیا۔ اب میں دوسرے کمرے میں سوتی ہوں۔ بچے اب بھی یہاں نہیں آتے ہیں۔''

''سیف کہاں ہے؟''

شیبا نے دیوار پر لگی ایک دیہاتی لڑکی کی پینٹنگ ہٹائی، وہ پٹ کی طرح کھل گئی۔ اس کے پیچھے چھوٹی سی فولادی تجوری تھی۔ یہ چابی سے کھلنے والی تجوری تھی۔ کسی نے ڈرل کی مدد سے اس کا سوراخ بڑا کر کے اندر سے لاک کو ناکارہ بنا کر تجوری کھول لی تھی۔ بڑا آسان طریقہ تھا لیکن کام کرنے والا اپنے کام میں ماہر تھا۔ شرافت نے جھک کر دیکھا اور پھر اپنے موبائل کی بیم لائٹ سوراخ پر مرکوز کر کے دیکھی۔ دھات چمک رہی تھی۔ یہ گن میٹل تھا جو یقیناً اتنی آسانی سے نہیں کٹتا۔ شرافت نے پوچھا۔ ''چوری اندازاً کس وقت ہوئی؟''

''میں یقین سے بتا سکتی ہوں، کل رات دس سے بارہ کے درمیان یہ کام ہوا ہے۔ میں بچوں کو لے کر آئس کریم کھلانے ... گئی تھی۔ کچھ دیر ہم نہر کے کنارے ڈرائیو بھی کرتے رہے تھے اس لیے واپسی تک بارہ بج گئے۔ میں نے واپس آکر بچوں کو ان کے کمروں میں بھیجا اور اپنا کچھ زیور یہاں رکھنے آئی تو سیف کو کھلا دیکھا۔''

''گھر میں اس وقت کوئی نوکر یا ملازمہ تھی؟''

''نہیں، نوکر اور ملازمائیں رات نو بجے کے بعد یہاں نہیں ہوتے ہیں۔ میں تمام دروازے کھڑکیاں اندر سے بند کرلیتی ہوں۔''

''کل رات جاتے وقت بھی تم نے تمام دروازے کھڑکیاں بند کی ہوں گی؟''

''بالکل، یہ میری عادت ہے۔''

''تب چور کہاں سے اندر آیا؟''

شیبا نے اسے پرانے طرز کے ونڈو ایئر سی کا ڈک دکھایا۔ کیونکہ بعد میں یہاں اسپلٹ اے سی لگ گیا تھا اس لیے اس ڈک کو اندر سے لکڑی کا خوب صورت پینل لگا کر بند کردیا گیا اور باہر لوہے کا کھانچہ پہلے ہی لگا ہوا تھا جس پر اے سی لگایا جاتا ہے۔ چور نے آری سے دیوار کے ساتھ لگے اس کے چاروں اسکرو کاٹ دیے تھے اور پھر لکڑی کا پینل ہٹا کر اندر گھس آیا تھا۔ کیونکہ یہ حصہ سرونٹ کوارٹر سے بھی دور تھا اور مین گیٹ سے بھی اس لیے اگر شور ہوا تو بھی کسی نے نہیں سنا اور چور آرام سے اپنا کام مکمل کر کے عقبی دیوار پھلانگ کر واپس چلا گیا۔ وہ آیا بھی اسی طرف سے تھا۔ گوٹھی سنگل پٹی پر تھی یعنی اس کے دونوں طرف گلی تھی البتہ اس طرف والی گلی سنسان اور آمدورفت سے خالی تھی۔ شرافت نے اپنا معائنہ مکمل کر کے پوچھا۔

''یہاں کتنے ملازم اور ملازمائیں ایسی ہیں جو اندر آتے ہیں؟''

''گارڈ اور مالی تو باہر ہی رہتے ہیں۔ تین ملازمائیں ہیں اور تینوں ماں بیٹیاں ہیں۔ مالی کی بیوی اور بیٹیاں ہیں۔ یعنی ایک ہی خاندان ہے۔ بس وہی اندر آتی ہیں۔ کبھی کبھی کچھ منگوانا ہو تو مالی خود آجاتا ہے۔ ڈرائیور یہاں نہیں رہتا۔ وہ صبح سے رات تک ہوتا ہے۔ اسی طرح گارڈز بھی کمپنی کے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے تو اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔''

''گویا یہاں صرف مالی اور اس کی فیملی رہتی ہے؟''

''ہاں لیکن یہ ان کا کام نہیں ہے۔ یہ تین برس سے یہاں ہیں اور ملک صاحب کے گاؤں کے ہیں۔ ہم ان پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے ہیں۔''

''تم لوگ یقیناً کرتے ہو لیکن پولیس اگر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے لگے تو کوئی کیس ہی نہ حل ہو اور نہ کوئی مجرم پکڑا جائے۔ ننانوے فیصد کیسز میں مجرم سب سے قریبی آدمی ہی نکلتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو کیونکہ یہ پیشہوروں کا کام لگ رہا ہے۔ بہرحال، میں دیکھتا ہوں۔''

شیبا نے پاس آکر اس کا بازو تھام لیا اور ملتجی لہجے میں بولی۔ ''کوشش نہیں شرافت، پلیز یہ کام ہونا چاہیے۔ مجھے چور کی گرفتاری بھی نہیں چاہیے۔ میں اس سے کچھ واپس نہیں مانگوں گی۔ بس مجھے وہ تصویریں دے دے۔''

شیبا اتنے قریب آگئی تھی کہ شرافت اس کی مہک اور بدن کی گرمی بھی محسوس کرسکتا تھا۔ شیبا اس سے تقریباً لگ گئی تھی۔ شرافت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے واضح پیغام نظر آیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر شیبا سے بازو چھڑا لیا۔ اس کی آنکھوں کا پیغام بجھ گیا اور وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شاید تمہارے دل میں میرے لیے

شرافت نے اس سے ملک ہدایت اللہ کے بارے میں پوچھا تو نعیم ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔ شرافت غور سے سن رہا تھا۔ درمیان میں وہ سوالات بھی کرتا رہا۔ شرافت کا خیال تھا کہ وہ ملک ہدایت اللہ کے بارے میں جانتا ہے لیکن نعیم کی معلومات سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ تو دس فیصد بھی نہیں جانتا۔ نعیم نے بڑے انکشافات کیے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے اسے واپس مرنگ چھوڑا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا خرچہ ضائع نہیں گیا۔ نعیم نے اترتے ہوئے پیشکش کی تھی کہ اگر اسے ملک ہدایت اللہ یا اس کے لواحقین کے بارے میں مزید معلومات درکار ہیں تو وہ معلوم کرسکتا ہے، تب شرافت کو خیال آیا اور اس نے کہا۔ ''ہاں، کچھ معلومات مل جائیں تو بہتر ہوگا...''

نعیم اس کی بات غور سے سن رہا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ''مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو اپنے لہور کی بات ہے آپ کہو تو میں ملک ہدایت اللہ کے گاؤں پہنچ جاؤں؟''

''نہیں اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے کام تو یہیں کا ہے۔''

''میں آپ کو کل کسی وقت کال کروں گا اور جو معلوم ہوا گوش گزار کردوں گا۔''

شرافت وہاں سے نکلا تب بھی اس کا رخ گھر کی جانب نہیں تھا بلکہ وہ ڈیفنس کی حدود سے لگنے والے تھانے پہنچا۔ وہاں کا ایس ایچ او سبحان کاظمی، شرافت کے ساتھ کام کر چکا تھا اور اس کا نیاز مند تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔

''سر... سر! آج نصیب کھل گئے۔ آپ آئے ہیں۔''

''کام سے آیا ہوں یار۔''

''سر! یہ بھی تو نصیب ہی ہوئے نا کہ آپ کو ہم جیسے نکمے لوگوں سے کام پڑا ہے ورنہ ہم تو ترستے ہیں کہ آپ کچھ حکم کریں اور ہم تعمیل کریں۔''

اس کے منع کرنے کے باوجود سبحان نے اس کے لیے اسپیشل چائے منگوائی۔ چائے آنے تک شرافت نے اسے بتایا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور اسے ہر قیمت پر مطلوبہ شخص چاہیے۔ سبحان کاظمی غور سے سنتا رہا اور اپنے سامنے رکھے کاغذ پر نوٹ لکھتا رہا۔ جب شرافت نے بات مکمل کی تو اس نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گیا سر! آپ بس چوبیس گھنٹے کی مہلت دیں اور کل اسی وقت زحمت کریں یا آپ جہاں کہیں میں وہاں آجاؤں سب کو لے کر...''

''نہیں، میں یہیں آؤں گا مگر خیال رہے کوئی شور شرابا نہ ہو۔ مطلب سب خاموشی سے اور اندر ہی اندر ہو۔ سے کہا۔ ''جیسے تمہاری شادی ہوئی اور اب بچے ہیں، ایسے ہی میری شادی بھی ہوگئی اور میرے بیوی بچے بھی ہیں۔''

''تمہاری بیوی یقیناً خوب صورت ہوگی؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن وہ مجھے دنیا کی سب سے خوب صورت عورت لگتی ہے۔'' شرافت نے اعتراف کیا۔ ''شیبا! میں پوری کوشش کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں وعدہ کرتا ہوں تو اسے نبھاتا بھی ہوں۔''

شیبا نے سر ہلایا۔ ''میں جانتی ہوں۔''

''مجھے اجازت دو۔ جیسے ہی کوئی بات علم میں آئی، میں تمہیں بتاؤں گا۔'' شرافت نے کہا۔ ''اور ہاں، مجھے مالی اور اس کی بیوی اور بیٹیوں کی تصاویر چاہئیں۔''

''ان کا کیا کرو گے؟'' شیبا نے پوچھا۔ شرافت نے جواب نہیں دیا تو اس نے اپنے پاس موجود ان چاروں کی فائل تصاویر لا دیں۔ یہ سب کی حالیہ تصاویر تھیں۔ شرافت انہیں لے کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ عام طور سے شرافت پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتا تھا، ہاں اگر کوئی میٹنگ ہوتی یا کوئی اہم معاملہ ہوتا تو وہ رک جاتا تھا۔ شیبا کے گھر سے نکلتے ہوئے اسے دیر ہوگئی تھی اور وہ واپس دفتر پہنچا تو چھ بج رہے تھے۔ اس نے پہلے گھر کال کر کے روبی کو بتایا کہ وہ آج لیٹ آئے گا اور ممکن ہے کھانا بھی باہر کھائے۔ پھر اس نے ریکارڈ روم سے کچھ فائلیں منگوائیں اور انہیں دیکھتا رہا۔ آٹھ بجے اس نے ایک صحافی نعیم کو کال کی۔ نعیم اخبار نکالنے والا صحافی تھا۔ یوں تو اس کے پاس دنیا جہان کی معلومات رہتی تھیں لیکن اگر اسے کہیں سے متوقع لفافہ نہیں ملتا تو وہ خاص طور سے ایسے شخص کی کھوج میں لگ جاتا اور اس کا سارا کچا چٹھا کھود لاتا تھا۔

شرافت کی آواز سن کر وہ چہکا۔ ''کیا بات ہے سر جی... بہت دنوں بعد یاد کیا؟''

''مرنگ فوڈ اسٹریٹ جا رہا ہوں... اگر ابھی کہیں سے دعوت نہیں ہے تو وہاں آجاؤ۔''

''سر جی! آپ کے لیے تو صدر وزیراعظم کی دعوت چھوڑ دیں جی، میں آتا ہوں۔''

آدھے گھنٹے بعد وہ شرافت کے سامنے بیٹھا تھا۔ شرافت نے اس کی پسندیدہ چیزیں منگوائی تھیں۔ کھانے پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ ''حکم کرو سرکار۔''

''یہاں نہیں۔'' شرافت نے ایک بڑا نوٹ جو یقیناً بل سے زیادہ تھا، میز پر رکھا اور لڑکے کو اشارہ کیا تو وہ تیر کی طرح لے گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بندے بے شک سو پکڑو پر زیادتی کسی کے ساتھ نہ ہو اور نہ مار پیٹ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"آپ کے کہنے سے پہلے سمجھ گیا ہوں سر۔" سبحان نے مستعدی سے کہا۔ "آخر اتنے عرصے آپ کے ساتھ رہا ہوں، آنکھ کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ آپ کو شکایت ہو تو بے شک میری کھال اتار کر ہاتھ میں رکھ دینا۔"

"نہیں یار! تم ماتحت نہیں ہو دوست ہو اور دوستوں کے کام آیا جاتا ہے یا ان سے کام کہا جاتا ہے۔"

سبحان کاظمی خوش ہو گیا۔ "یہ بھی عزت ہے سر میری کہ آپ نے دوست کہا۔ بس مجھے کل تک مہلت دیں۔"

اگلے دن وہ دفتر آیا تو شیبا کی کال آ گئی۔ "شرافت! کچھ معلوم ہوا؟"

"نہیں لیکن میں نے جال پھیلا دیا ہے۔ اب دیکھو اس میں کتنی مچھلیاں آتی ہیں اور ان میں مطلوبہ مچھلی ہوتی ہے یا نہیں۔"

"پلیز ایسا نہ کہو..." شیبا روہانسی ہو گئی۔ "تم سوچ نہیں سکتے کہ میں کتنی ٹینس ہوں۔ اگر اس نے ان تصویروں کا غلط استعمال کر لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" شرافت نے نرمی سے کہا۔ "ایک بار مطلوبہ شخص ہاتھ آ گیا تو سمجھ لو ایسا ہر راستہ بند ہو جائے گا کیونکہ وہ صرف سچ بولے گا اور اگر اس نے کچھ آگے کیا ہوگا تو وہ بھی میری گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔"

شیبا خوش ہو گئی۔ "شرافت! میں نے اسی لیے تم سے رابطہ کیا اور مجھے یقین ہے کہ تم وہ تصویریں تلاش کر لو گے۔ اگر تم نے یہ کام کر لیا تو شیبا کی جان بھی مانگو گے تو وہ خوشی سے دے دے گی۔"

"مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم خوش رہو میرے لیے یہی کافی ہے۔" شرافت نے کہا۔ "او کے، میں ذرا کچھ کام نمٹا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں شام کو کال کروں گی۔"

"نہیں، میں خود کروں گا۔" شرافت نے اسے منع کیا۔

"اچھا، آج رات ڈنر میرے ساتھ کرو نا... کچھ پرانی یادیں تازہ کریں گے۔"

"نہیں... یہاں سے میں تمہارے کام کے لیے جاؤں گا اور نہیں معلوم کہ اس میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، پر کام ہونے کے بعد تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔" شیبا نے خاص انداز میں کہا۔

"پہلے کام تو ہو جانے دو۔" شرافت نے بغیر کسی ردِعمل کے کہا۔ "او کے بائے۔"

موبائل رکھ کر اس نے فائلیں اپنی طرف کیں اور کام میں لگ گیا۔ اس کی عادت تھی کہ روز کا کام روز نمٹاتا تھا۔ اس وجہ سے بعض اوقات اسے یہ سہولت بھی ہوتی تھی کہ وہ بغیر اطلاع کے چھٹی کر جاتا تھا۔ کیونکہ دوسروں کی طرح کام جمع کر کے اسے خود کو بہت مصروف ظاہر کرنے کی عادت نہیں تھی، اسی وجہ سے ساتھی افسران اس سے چڑتے بھی تھے۔ اپنے ماتحتوں سے عزت سے پیش آتا تھا اور ممکن حد تک انہی کا فیور کرتا تھا۔ ان کے کاموں کی ذمے داریاں لیتا تھا اور آج تک اس نے کسی ماتحت پر ذمے داری نہیں ڈالی تھی جیسا کہ دیگر افسران کا وتیرہ تھا کہ وہ اپنا کیا دھرا بھی ماتحتوں کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو جاتے تھے۔ دوسرے معاملات میں بھی وہ ان کے کام آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دل سے شرافت کی عزت کرتے تھے اور جب کہیں اور چلے جاتے، تب بھی اسے یاد رکھتے تھے۔ جیسا کہ سبحان کاظمی کو وہ یاد تھا حالانکہ شرافت تین سال بعد اس سے ملا تھا مگر وہ ایک اشارے پر دل و جان سے اس کے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ دفتر میں اسے نعیم کا فون آیا اور اس نے شرافت کو کچھ نئی معلومات مہیا کیں۔

شام کو پہلے وہ گھر گیا۔ گزشتہ رات وہ تاخیر سے پہنچا تھا، بچے سو چکے تھے اور اس کی چھوٹی بیٹی اس سے ناراض تھی۔ شرافت نے اسے منایا، ڈنر کیا اور بچوں کو نزدیکی آئس کریم پارلر لے جا کر آئس کریم کھلائی اور پھر تیار ہو کر روانہ ہوا۔ روبی کو اس نے پہلے بتا دیا تھا کہ شاید آج دیر ہو جائے۔ روبی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شرافت ایک پولیس افسر ہے اور اسے دن کے علاوہ بھی ڈیوٹی پر جانا پڑتا ہے۔ اس نے کبھی شرافت کے اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ وہ تھانے پہنچا تو سبحان کاظمی اس کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔ "سر! پہلے ٹھنڈا گرم کر لیتے ہیں۔"

"نہیں۔" شرافت نے انکار کیا۔ "یہ معاملہ زیادہ ضروری ہے، ٹھنڈا گرم بعد میں دیکھا جائے گا۔"

سبحان کاظمی نے پہلے رپورٹ دی۔ "سر! آپ نے جو بتایا تھا اس کی روشنی میں ہماری نظر میں سات بندے ہیں ان میں سے دو جیل میں ہیں، ایک یہ کام چھوڑ چکا ہے اور اس کی تالے چابی کی دکان ہے۔ باقی چار ابھی دھندے میں ہیں۔ لیکن میں نے بانچوں کو بلا لیا ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہا ہے بس بند کیا ہوا ہے۔"

"ایک جگہ؟"

"نہیں سر! آپ کا شاگرد ایسی حماقت کر سکتا ہے... سب الگ الگ ہیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ہے۔" سبحان کاظمی نے فخر سے کہا۔

شرافت خوش ہو گیا۔ "یہ کیا نا تم نے کام۔"

"آپ کہیں تو انہیں باری باری لاؤں؟"

"ہاں، پہلے اسے لاؤ جس نے کام چھوڑ دیا ہے۔ اسے کہاں سے اٹھایا تھا؟"

"صبح دکان کی طرف جا رہا تھا، میں نے بلا کے موبائل میں بٹھا لیا، کسی کو پتا نہیں چلا۔ اسے کہا کہ اپنے گھر والوں کو بتا دے اور ان سے کہے کہ وہ خاموش بیٹھیں، تم واپس آ جاؤ گے۔"

شرافت نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ چند منٹ بعد ایک عمر رسیدہ شخص اس کے سامنے تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور چار خانے کی لنگی باندھ رکھی تھی۔ سر اور خشخشی داڑھی کے بال سفید ہو رہے تھے۔ شرافت نے اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی قدر حیرت کے ساتھ کرسی پر ٹک گیا۔ شرافت نے اس سے چند سوالات کیے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کام میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ وہ ان معدودے چند مجرموں میں سے تھا جو صرف خوفِ خدا کی وجہ سے جرم کی راہ چھوڑتے ہیں۔ اس نے سبحان کو بلایا اور کہا۔ "بابا کو گاڑی میں جہاں یہ کہیں چھڑوا دو۔"

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "نہیں سرکار! زحمت نہ کریں۔ میں خود چلا جاؤں گا۔"

"تمہیں گاڑی میں لائے تھے، اب گاڑی میں ہی واپس جاؤ گے۔"

سبحان نے اسے ایک موبائل میں روانہ کیا۔ شرافت نے دوسرا آدمی بلانے سے پہلے اس سے کہا۔ "آئندہ اسے کسی معاملے میں مت بلانا۔ یہ اب سدھر گیا ہے۔"

"پتا ہے سر! ہمیں نہیں پتا ہوگا تو اور کسے پتا ہوگا کہ کون سدھرا ہوا ہے اور کون مزید بگڑ گیا ہے۔ اسے تو بس گریبی میں بلوا لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، دوسرے کو بھیجو۔"

دوسرا ایک تیز طرار شخص تھا۔ وہ حال ہی میں چھ مہینے کی سزا کاٹ کر آیا تھا۔ شرافت نصف گھنٹے تک اس سے بات کرتا رہا اور اس نے خاص انداز میں گھما پھرا کر بار بار سوالات کیے اور اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کام میں ملوث ر بیٹیوں کی

ہوشیار شوہر

گھریلو جھگڑے کے بعد بیوی نے اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیے۔

شوہر نے پوچھا۔ "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" بیوی نے جواب دیا۔ "اپنی ماں کے گھر۔"

تھوڑی دیر کے بعد شوہر نے بھی اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیا۔

جس پر بیوی نے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟" شوہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اپنی ماں کے گھر۔"

بیوی نے سوال کیا۔ "اور بچوں کا کیا ہوگا؟" شوہر نے جواب دیا۔

"جب تم اپنی ماں کے یہاں جا رہی ہو اور میں اپنی ماں کے یہاں تو میرا خیال ہے کہ بچے بھی اپنی ماں کے یہاں جائیں گے۔"

لاٹری

پانچ بچوں کے باپ نے لاٹری میں ایک مہنگا کھلونا جیتا اور خوشی خوشی گھر لے آئے۔ سارے بچوں کو جمع کر کے کہا۔ "وہ بچہ یہ کھلونا حاصل کرے گا جو بہت ہی فرماں بردار ہو اور کبھی اپنی ماں کو جواب نہ دیتا ہو۔ چاہے وہ کچھ بھی کہے۔"

جس پر پانچوں بچوں نے کچھ دیر سوچا اور ایک ساتھ کہا۔ "ابو! آپ جیت گئے... یہ کھلونا آپ کا ہوا۔"

وفادار کتا

بیوی نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس جو کتا ہے، وہ بہت ہوشیار اور چالاک ہے۔ یہ ہر روز صبح باہر سے اخبار اٹھا کر لاتا ہے۔"

شوہر نے کہا۔ "یہ تو ہے مگر زیادہ تر پالتو کتے یہ کام روز ہی اپنے مالک کے لیے کرتے ہیں۔"

بیوی بولی۔ "مگر ہم نے تو کبھی بھی کسی اخبار کا بل نہیں دیا۔ یہ دوسروں کے اخبار ہمارے لیے لاتا ہے۔"

(امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاروبار

مرزا شہر کی مشینی زندگی سے اکتا کر ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک دیہاتی سے دو ہزار روپے میں بکری خرید لی۔ دیہاتی نے رقم لے کر انہیں اگلے دن بکری دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ اگلے دن گئے تو دیہاتی نے منہ لٹکا کر انہیں اطلاع دی کہ بکری تو اچانک مر گئی۔ مرزا نے اپنی جمع پونجی کی واپسی کا مطالبہ کیا تو دیہاتی نے سادگی سے بتایا کہ مرزا رقم دے چکے تھے اس لیے دیہاتی کی نہیں، ان کی بکری مری تھی اور یہ اللہ کی مرضی تھی۔

مرزا نے مری ہوئی بکری کا مطالبہ کیا۔ دیہاتی حیران تھا کہ وہ ایک مردار کا کیا کریں گے۔ مرزا نے اس سے التجا کی کہ وہ اس سودے اور بکری کی موت کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے۔ دیہاتی نے پکا وعدہ کر لیا۔

مرزا نے گاؤں میں سو روپے میں بکری کی لاٹری کا اعلان کر دیا۔ لالچ میں لوگ دھڑا دھڑ آنے لگے۔ مرزا نے چند گھنٹوں میں ستر خود ساختہ پرچیاں بیچ ڈالیں۔

دیہاتی کو جب پتا چلا کہ گاؤں میں کوئی ہنگامہ ہوا نہ فساد تو وہ مرزا کے پاس پہنچ گیا۔ ”تم نے مری ہوئی بکری کا ڈراما کیا اور کوئی کچھ نہ بولا۔ یہ کیا چکر ہے؟“

”میں نے اس پر ساڑھے چار ہزار کمائے ہیں۔“ مرزا نے فخر سے بتایا۔ ”ستر پرچیوں کے ساتھ ہزار ملے۔ دو ہزار میں، میں نے تم سے مری ہوئی بکری لی تھی...“

”اور کسی نے کوئی شکایت نہیں کی؟“ دیہاتی نے ان کی بات کاٹ کر حیرت سے پوچھا۔

”جس کے نام بکری نکلی، اس نے شکایت کی تھی۔ میں نے اس کے سو کے بدلے اسے پانچ سو لوٹا دیے اور وہ خوش ہو گیا۔ یوں مجھے ساڑھے چار ہزار بچ گئے۔“

مرزا شہر لوٹ آئے۔ آج وہ تین کاٹن فیکٹریوں، پیٹرول پمپ اور آئل مل کے مالک ہیں۔

(فرحان شیخ، کراچی، پاک کالونی)

جھلک رہی تھی۔ شرافت اس سے بھی سوالات کرتا رہا اور وہ سوچ کر جواب دیتا رہا۔ اسی دوران میں شرافت نے جان بوجھ کر چاروں تصاویر اس کے سامنے میز پر یوں رکھ دیں کہ وہ انہیں دیکھ سکتا تھا... فوراً ہی اس کے چہرے پر تغیر نمودار ہوا۔ وہ بار بار چاروں میں سے ایک خاص تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ شرافت نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے اسے بھی واپس بھیج دیا اور ایک گھنٹے میں باقی دو کو بھی نمٹا دیا پھر اس نے سبحان کو بلایا۔

”دوسرا نوجوان، کیا نام ہے اس کا...؟“

”سلیم شاہ سر۔“

”ہاں، یہ کم عمر ہے۔“

”جی سر لیکن گنوں کا پورا ہے سر۔“

”مجھے اس پر شک ہے۔“

”حکم فرمائیں سر... زبان کھلوانے کا بندوبست ہے۔“

”نہیں، میں اس سے دوبارہ بات کروں گا۔ اسے یہاں لاؤ۔“

سلیم شاہ دوبارہ آیا تو اس بار وہ خوفزدہ تھا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر شک کیا جا رہا ہے اس لیے آتے ہی اس نے رونا دھونا اور دہائیاں دینی شروع کر دیں کہ وہ بے قصور ہے اور اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ مگر شرافت نے اس کے دادیلے کا اثر لیے بغیر اسے ہتھکڑیاں لگانے کا اشارہ کیا۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ شرافت کھڑا ہو گیا۔ اس نے سلیم کی زنجیر کا سرا تھاما اور اسے اپنے ساتھ کار تک لایا۔ اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور سبحان سے کہا۔ ”میں ایک گھنٹے میں واپس آ سکتا ہوں، اگر نہیں آیا تو کال کر دوں گا۔“

”یس سر۔“ اس نے اٹینشن ہو کر کہا۔

سلیم سہما ہوا تھا۔ کار تھانے سے نکلی تو اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”سرکار! کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”ہم ایک ڈرائیو پر جا رہے ہیں۔ اس کے بعد یا تو تم آزاد ہو کر اپنے گھر چلے جاؤ گے اور کوئی دوبارہ تمہیں نہیں پکڑے گا یا پھر تم واپس تھانے جاؤ گے۔ تم پر غیر قانونی اسلحہ، منشیات رکھنے، راہزنی اور ڈکیتی کے ایسے کیس بنیں گے جن میں تم تین چار سال تو عدالتوں میں دھکے کھاؤ گے اور اس کے بعد اگر آزاد بھی ہوئے تو باہر آتے ہی تم پر دوبارہ کیس بن جائیں گے۔“

”میرا قصور

”ملک ہدایت اللہ کی کوٹھی میں تم نے نقب لگائی اور تجوری توڑ کر اس سے زیور، نقدی اور کچھ تصاویر نکال لی تھیں۔“

”نہیں جی...“ سلیم نے کمزور لہجے میں تردید کرنا چاہی۔

”میری بات غور سے سنو... میں الزام نہیں لگا رہا۔ میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔ مجھے صرف تمہیں ملک ہدایت اللہ کے مالی کی بیٹی کے سامنے لے جا کر کھڑا کرنا ہوگا اور وہ خود تمہیں شناخت کرے گی۔ لیکن میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ میرے لیے یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ تمہیں تھانے میں لے جا کر الٹا لٹکا دوں اور صبح تک تم ساری عمر کا کھایا پیا اگل چکے ہو گے۔ اس لیے اب انکار کر کے خود کو عذاب میں مت ڈالنا۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور پھر سوچ کر جواب دو۔ تم نے تجوری سے جو نکالا تھا، وہ سب اپنے پاس رکھو ایک چیز بھی واپس مت کرو، سوائے ان تصویروں کے۔ اب تمہارے پاس دو منٹ ہیں۔ اگر دو منٹ میں تم نے جواب نہیں دیا تو میں کار واپس تھانے کی طرف موڑ دوں گا۔“

سلیم کانپنے لگا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ اقرار کرے یا نہ کرے۔ اسے دونوں صورتوں میں جان بچنی مشکل لگ رہی تھی لیکن پھر اس نے شرافت کی بات پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دو منٹ سے پہلے سر ہلایا۔ ”میں تیار ہوں جی۔“

”گڈ! تصویریں کہاں ہیں؟“

”میرے گھر پر ہیں جی۔“

”تم نے کسی کو دکھائیں؟“

”جی، کچھ دوستوں کو دکھائیں۔“ اس نے اقرار کیا۔

”ان کی کوئی کاپی یا کوئی تصویر لی؟“

”نہیں جی، میں نے بس ایسے ہی رکھی تھیں۔“ سلیم ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”میں قسم کھاتا ہوں جی کہ جان کر نہیں لایا ایک لفافہ رکھا تھا، میں نے ایسے ہی اٹھا لیا کہ اس میں بھی کچھ رقم یا کوئی پرائز بونڈ ہوگا، پر گھر لایا تو اس میں سے تصویریں نکلیں۔“

”کتنی تصویریں تھیں؟“

”سات جی... پرانی تھیں۔“

شرافت سلیم کو لے کر اس کے گھر پہنچا۔ وہ ڈیفنس کے پاس ہی ایک عام سی بستی میں رہتا تھا۔ کار سے اترتے [illegible] ”اگر

نادرنامہ

میاں بیوی ایک بڑے میلے کی سیر کو گئے جہاں دوسری تفریحات کے ساتھ ایک چھوٹا جہاز بھی موجود تھا جس میں سوار ہو کر چار ہزار روپے میں شہر کا ایک فضائی چکر لگایا جا سکتا تھا۔

دونوں وہاں رک کر حسرت سے جہاز کو دیکھنے لگے۔ شوہر نے کہا۔ ”ہوائی سفر کا کتنا عمدہ موقع ہے۔ پتا نہیں اگلے میلے تک ہم ہوں یا نہ ہوں... کاش ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے۔“

”دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے مگر ہم دونوں کے آٹھ ہزار روپے... کاش! ہمارے پاس اتنی رقم ہوتی...“

پائلٹ ان دونوں کی حسرت بھری باتیں سن رہا تھا۔ ان کے قریب آ کر بولا۔ ”میں تم دونوں کو ایک شرط پر جہاز میں سیر کرا سکتا ہوں کہ دورانِ پرواز تم بالکل خاموش رہو گے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بولا تو آٹھ ہزار روپے دینے پڑیں گے۔“

انہوں نے خوشی خوشی آپس میں مشورہ کیا اور تیار ہو گئے۔

پائلٹ نے جہاز اڑایا۔ رفتار خوب تیز کی۔ جہاز کو ترچھا گیا، قلابازی کھلائی، الٹا کر کے اڑایا، کئی غوطے کھلائے مگر پیچھے بالکل خاموشی رہی۔ پائلٹ نے ہوابازی کے سارے کرتب دکھائے پھر انہیں دہرایا مگر سکوت نہ ٹوٹا۔

آخر کار اس نے جہاز اتار لیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”تم دونوں جیت گئے۔ واقعی تم بہت دلیر ہو۔ میں تمہیں خوف زدہ کر کے چیخنے پر مجبور نہیں کر سکا۔“

”ہمارے پاس رقم نہیں تھی۔“ پیچھے سے شوہر کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔ ”تم نے غوطہ مار کر میری بیوی کو جہاز سے نیچے گرایا تو میں نے بمشکل اپنی چیخ روکی تھی۔“

(ریاض سے عذرا ریاض کی آتشِ شوق)

بھاگنے کا شوق ہو تو یہ بھی پورا کر لینا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تم مجھ سے تیز نہیں بھاگ سکو گے۔“

”نہیں سر جی! آپ نے مجھے مرید کر لیا ہے۔“ سلیم نے عاجزی سے کہا۔ ”اگر آپ کی جگہ کوئی سپاہی بھی ہوتا تو میں اس وقت تھانے میں الٹا لٹکا ہوتا جی... آپ تو بادشاہ ہو۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلیم اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس نے تصویریں اپنے ٹرنک میں لاک کر کے رکھی تھیں۔ اس نے تصویروں والا لفافہ نکال کر شرافت کے حوالے کیا تو اس نے پہلے تصویروں کا معائنہ کیا، یہ کُل سات تھیں۔ گیارہ سال پرانی ہونے کی وجہ سے ان کا کاغذ خستہ ہو رہا تھا اور معیار بھی بہت اچھا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ملک صاحب نے خود ہی ڈیولپ بھی کی تھیں کیونکہ اس قسم کی تصاویر وہ کسی شاپ سے ڈیولپ کیسے کرا سکتے تھے۔ شرافت نے شیبا کو کال کی اور پوچھا۔ ''تصاویر کتنی ہیں؟''

وہ خوش ہوگئی۔ ''کیا مل گئی ہیں؟''

''ہاں... جواب دو۔''

شرافت کے کان میں چہکاری گونجی اور پھر شیبا نے کہا۔ ''کُل سات ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ان کی پیک پر کچھ لکھا ہوا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ کچھ نہیں لکھا ہے۔''

تصاویر کی پشت صاف تھیں لیکن شرافت مزید تصدیق چاہ رہا تھا۔ شیبا سے بات کر کے اس نے موبائل رکھا اور سلیم کی طرف دیکھا۔ ''تم نے اپنی ہڈیاں اور کھال بچالی ہے لیکن میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔ ایک یہ کہ تمہیں ملک ہدایت اللہ کے بیڈروم میں موجود تجوری کا کیسے پتا چلا؟''

''ثمینہ نے بتایا تھا۔'' سلیم نے جھجک کر کہا۔ ثمینہ مالی کی بیٹی تھی۔

''وہ بھی تمہارے ساتھ شامل ہے؟''

''نہیں سرکار! وہ تو بس مجھ سے پیار کرتی ہے۔ اس نے ایسے ہی باتوں باتوں میں ذکر کر دیا تھا۔''

''اور تم نے موقع سے فائدہ اٹھالیا۔'' شرافت نے اسے گھورا۔ ''اب تم اس سے نہیں ملو گے۔''

''سرکار! میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''

''آدمی جن سے محبت کرتا ہے، ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیتا۔ تم ایک بار یہ کام کر چکے ہو اس لیے اب ناقابلِ اعتبار ہو بہرحال میں تمہیں خبردار کر رہا تھا کیونکہ میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تم اس سے ملو گے اور ادھر مجھے خبر ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری معافی ختم ہو جائے گی۔ تھانے جاؤ گے اور سارا کھایا پیا بھی اگلنا پڑے گا۔''

سلیم لرز گیا۔ ''بالکل نہیں ملوں گا جی... اب ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔''

''یہ سمجھ داری ہوگی۔'' شرافت نے کہا۔ ''ایک بات اور ہے، اگر تم نے یا کسی اور نے ان تصاویر کی موبائل یا کسی اور کیمرے سے تصویر لی ہے تو مجھے بتا دو۔ میں وہ ضائع کرا دوں گا۔''

''میں قسم کھا کر...''

''قسم مت کھاؤ، بس اتنا یاد رکھنا کہ اگر ان کا کوئی پرنٹ کہیں نظر آیا یا انٹرنیٹ پر آیا تو میں اسے تمہارے کھاتے میں ڈالوں گا۔ اس کا حساب تمہیں دینا ہوگا۔''

''میں پکا بتا رہا ہوں، ان تصاویر کی کوئی تصویر نہیں لی گئی ہے نہ میں نے اور نہ میرے دوستوں نے ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔''

''یہ اچھا کیا تم نے اپنے حق میں۔'' شرافت نے کہا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔ جیسے ہی وہ باہر آیا شیبا کی کال آگئی۔

''تم کہاں ہو؟ تصویریں کب میرے پاس لے کر آؤ گے؟''

''کچھ دیر لگے گی۔'' شرافت نے کہا۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے آفس جانا ہے، ہوسکتا ہے کچھ دیر لگ جائے لیکن میں آج ہی آؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گی۔'' شیبا نے کہا تو اس کا لہجہ بوجھل ہوگیا۔ ''تصویروں کا نہیں، تمہارا انتظار کروں گی۔''

شرافت نے شیبا سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ دفتر پہنچا اور اس نے پولیس لیب کے انچارج کو بلایا۔ ''تم سے ایک کام ہے لیکن تم کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کہیں گے تو ذکر نہیں کریں گے جی۔''

لیب انچارج پڑھا لکھا اور کیمسٹری سائنس میں ماسٹر تھا اور اسی وجہ سے وہ اس عہدے پر تھا۔ شرافت اس کے ساتھ لیب میں آیا اور اس نے تصویروں والا لفافہ نکال کر اسے دیا اور اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ''لیکن خیال رہے، تصویروں کو کوئی نقصان نہ ہو۔''

انچارج نے لفافے سے تصویریں نکال کر انہیں دلچسپی سے دیکھا۔ ''چیز تو اچھی ہے۔''

''بس تو کام بھی اسی معیار کا ہونا چاہیے۔''

پولیس لیب انچارج کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ آئے دن اس قسم کی تصویریں دیکھتا تھا اس لیے ابتدائی دلچسپی کے بعد وہ [illegible]

شرافت نے کہا۔ ''سر! تقریباً ایک گھنٹا لگے گا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' شرافت نے وہیں نشست سنبھال لی۔ رات کے وقت ہیڈ کوارٹر میں بس وہی افراد تھے جن کی ڈیوٹی تھی اور لیب میں سوائے انچارج کے کوئی نہیں تھا۔ شرافت نے اسی لیے یہ وقت منتخب کیا تھا اور وہ اپنے سامنے یہ کام کرانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لیب انچارج اچھا آدمی ہے لیکن وہ اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے اپنے سامنے کام کرا رہا تھا۔

خلافِ توقع کام آدھے گھنٹے میں نمٹ گیا اور لیب انچارج نے نتیجہ شرافت کے سامنے رکھا۔ اس نے بہ غور دیکھا اور مطمئن ہو کر بولا۔ ''گڈ ورک...''

''شکریہ سر۔'' انچارج خوش ہو کر بولا۔

شرافت نے تصویریں اور ان کی لی ہوئی اضافی تصویریں لفافے میں ڈال کر اپنی جیب میں رکھیں۔ ''تم نے سچ مچ اچھا کام کیا ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔''

''مسئلہ تو کوئی نہیں ہے لیکن میری پروموشن فائل آپ کے پاس آنے والی ہے۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ۔'' شرافت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

چند منٹ بعد وہ شیبا کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ رات کے گارڈز نے اسے پوری طرح چیک کیا اور جب تک شیبا نے اجازت نہیں دی انہوں نے گیٹ نہیں کھولا۔ وہ عام گارڈز نہیں تھے بلکہ ریٹائرڈ فوجی تھے اور خودکار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے ان کے پاس واضح ہدایات ہوتی تھیں۔ وہ انہی ہدایات کے تحت عمل کرتے تھے، انہیں پروا نہیں تھی کہ یہاں آنے والا کون تھا۔

شرافت کی کار اندر آئی۔ پورچ میں خود شیبا موجود تھی۔ وہ بے تابی سے شرافت کو اندر لے آئی اور واضح طور پر یہ بے تابی تصویروں کے لیے تھی۔ وہ شرافت کو اسی چھوٹی سٹنگ میں لائی۔ کوٹھی میں خاموشی اور سناٹا تھا۔ ملازم یقیناً اپنے کوارٹرز میں تھے اور بچے سونے کے لیے جا چکے تھے کیونکہ رات کے دو بج رہے تھے۔ باہر شیبا نے شال لی ہوئی تھی لیکن اندر آتے ہی اس نے شال اتار دی۔ نیچے اس نے نائٹی پہن رکھی تھی۔ یہ گلے سے ٹخنوں تک تھی لیکن کپڑا اتنا ہلکا تھا کہ اس کا بدن جھلک رہا تھا اور یہ یقیناً شرافت کو دکھانے کے لیے پہنی گئی تھی۔ اس نے شرافت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر

بندوبست

سمندر کے کنارے تین امریکی نوجوان بنیاں ڈالے اطمینان سے مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو ذرا دور تک چلی گئیں۔

ایک نے بتایا۔ ''میرے گھر میں بہت بری طرح آگ لگی تھی۔ گھر کے ساز و سامان کے ساتھ سارے نوادرات اور ڈالر بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ انشورنس والوں نے میرا سارا نقصان پورا کر دیا... اب بے فکری اور عیش ہی عیش ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''عجب اتفاق ہے... میرے گھر کی گیس لائن میں دھماکے کے ساتھ آگ لگی اور میرا سب کچھ چاٹ گئی۔ انشورنس سے بھاری معاوضہ ملا اور میرے دن پھر گئے۔''

تیسرا ایک آہ بھر کر بولا۔ ''خوفناک سیلاب میرے گھر سمیت ہر چیز کو بہا لے گیا۔ غنیمت ہے کہ انشورنس سے رقم مل گئی اور میں اب پہلے سے بہتر زندگی گزار رہا ہوں۔''

دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر پہلے نے تحیر زدہ انداز میں تیسرے سے کہا۔ ''گھر کو آگ لگانا تو خیر آسان سا کام ہے۔ تھوڑی سی ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے... یہ بتاؤ کہ تم نے سیلاب کا بندوبست کیسے کیا تھا؟''

کنزیٰ یونس، کراچی

''آج پینے سے انکار نہیں کرو گے تم؟'' یہ سوال سے زیادہ حکم تھا۔

شرافت نے سر ہلایا تو وہ اس کے لیے گلاس بنا لائی۔ وہ اس نے شرافت کو تھمایا تو اس نے پوچھا۔ ''تم نہیں پیتیں؟''

''نہیں، میں نے آج تک نہیں پی۔'' وہ بولی۔ ''اس وقت بھی نہیں جب میں پیٹے میں تھی۔''

شرافت کا بھی یہی اندازہ تھا۔ اگر شیبا پیتی تو اب تک اس کی جوانی ڈھلک چکی ہوتی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح حسین

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور دلکش تھی۔ نائٹی سے جھلکتے جسم کا تناسب نظر آرہا تھا۔ شرافت نے گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ یہ غیر ملکی وائن تھی۔ اس نے تعریف کی تو شیبا خوش ہوگئی۔

''اس میں سات تصاویر ہیں، تم نے بھی اتنی ہی بتائی تھیں لیکن تم پھر بھی چیک کرلو۔''

شیبا نے تیزی سے لفافہ اٹھایا اور تصویریں نکال کر دیکھیں۔ فوراً ہی اس کے چہرے پر سکون نظر آیا۔ اس نے چمک کر کہا۔ ''پوری ہیں اور وہی سب ہیں لیکن...'' وہ متفکر ہوگئی۔ ''کہیں چور نے ان کی تصویر نہ لے لی ہو۔''

''میں پورا اطمینان کرکے آیا ہوں۔ ان کی تصاویر نہیں لی گئی ہیں، تم بالکل بے فکر رہو۔''

شیبا مسکرانے لگی۔ شرافت نے محسوس کیا کہ تصاویر کی تصویریں لینے کے بارے میں اس کی تشویش میں حقیقت کا عنصر کم تھا اور بناوٹ زیادہ تھی۔ اس نے میز پر رکھے گلاس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے تو ابھی ایک بھی گلاس ختم نہیں کیا ہے۔''

''یہ بھی کافی ہے، آج کل میں احتیاط کرنے لگا ہوں۔ بس اتنی لیتا ہوں کہ طلب مٹ جائے۔''

''آج میں اتنی پلاؤں گی کہ ہوش کھو دو گے۔'' شیبا نے لگاوٹ سے کہا۔

''نہیں، تم نے ایک ہی بار میرے ہوش اڑائے تھے اور جب ہوش ٹھکانے آئے تو اس کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے ہوش وحواس اپنے ہاتھ میں رکھوں گا۔''

شرافت کی بات اور لہجے پر شیبا کا رنگ ذرا پھیکا ہوا مگر وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی عورتوں میں سے نہیں تھی۔ ''کم سے کم آج رات کے لیے تمہیں یہ فیصلہ بدلنا ہوگا۔''

شرافت نے جواب میں اپنا گلاس اٹھایا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''تمہاری کوٹھی بڑی خوب صورت ہے اور یہاں نوملازمین ہیں، یقیناً اس کا خرچ بہت زیادہ ہوگا۔''

''ہاں، تقریباً دس لاکھ روپے مہینے کا۔'' وہ یوں بولی جیسے دس لاکھ روپے اس کے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔

''ملک صاحب یقیناً اتنا چھوڑ کر گئے ہوں گے کہ تم یہ خرچ افورڈ کرسکو؟''

''آں... ہاں۔'' وہ محتاط ہوگئی۔ ''ملک صاحب بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ ذرا احتیاط کروں۔''

''اسی لیے تم نے باہر جانے کا فیصلہ کیا؟'' شرافت نے کہا تو وہ چونک گئی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''شیبا! تم شاید اب بھی مجھے کالج والا سیدھا سادہ شرافت سمجھ رہی ہو اور بھول گئی ہو کہ میں ایس پی ہوں۔ میں یقیناً دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں اور کوئی بھی بات جاننا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔''

شیبا کچھ دیر سکتے میں بیٹھی رہی پھر اس نے بہ مشکل پوچھا۔ ''کیا جانتے ہو تم؟''

''یہی کہ تم دبئی منتقل ہو رہی ہو۔ وہاں ملک صاحب نے تمہارے نام سے ایک بزنس کمپنی کھولی تھی اور ایک عالی شان اپارٹمنٹ بھی لیا تھا۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟''

''ٹھیک کہا تم نے۔''

''میرا خیال ہے کہ اگر تم یہ کوٹھی بیچ دو تو اتنی رقم ضرور مل جائے گی کہ تم اسے انویسٹ کرکے دبئی میں بھی... پُرآسائش زندگی گزار سکتی ہو۔ وہاں تمہیں گھر اور ملازموں پر اتنا خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔''

''یہ درست ہے، یہاں میں اس اسٹینڈرڈ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میرے بچے بھی اس کے عادی ہیں پھر میرے سر پر ملک صاحب کا سایہ نہیں رہا ہے، وہ میرے محافظ تھے۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''کس سے... ملک صاحب کی پہلی بیوی اور بچوں سے؟''

''ان سے بھی اور حالات سے بھی۔'' شیبا بولی پھر ایک گہری سانس لی۔ ''میں بھول گئی کہ میں ایک طوائف خاندان سے ہوں لیکن میرے خاندان والے نہیں بھولے ہیں۔ ماں کے بعد میری سب سے بڑی بہن خاندان کی سربراہ ہے اور اس نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ میں واپس خاندان میں آجاؤں۔''

''صرف پیغام بھیجا ہے؟''

''نہیں دھمکی بھی ہے میرے بچوں کے حوالے سے۔'' شیبا نے گہری سانس لی۔ ''میں ان پر ذرا بھی رسک نہیں لے سکتی۔''

''اسی لیے تم نے بچوں کو باہر بھیج دیا ہے؟''

شیبا ایک بار پھر حیران ہوئی۔ ''تم یہ بھی جانتے ہو؟''

''ہاں، تم کہو تو میں آج شام کی اس فلائٹ کا نمبر بھی بتا دوں جس سے تمہارے بچے باہر گئے ہیں اور ان کے ساتھ تمہارا ڈرائیور ہے۔''

شیبا

آدمی ہے۔ ملک صاحب بھی اس پر آنکھ بند کرکے بھروسا کرتے تھے۔''

''لیکن میرا مشورہ ہے کہ ملک صاحب کے دور کے کسی ملازم پر آنکھ بند کرکے بھروسا مت کرو۔ ایسا کرنا تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔''

شیبا فکرمند ہوگئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، یہاں سے جانے کے بعد میں اسے بھی فارغ کردوں گی۔''

''وہاں تمہیں ملازم کی ضرورت ہوگی تو بے شمار بنگالی، سری لنکن اور فلپائنی ملازم مل سکتے ہیں۔ وہ زیادہ محنتی ہوتے ہیں اور کم تنخواہ میں بھی مان جاتے ہیں۔ جب تم یہاں سے جا رہی ہو تو بہتر ہے کہ یہاں کے کسی آدمی پر بھروسا یا انحصار بھی مت کرو۔''

شیبا نے سر ہلایا۔ ''میں ایسا ہی کروں گی۔''

شرافت نے خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوٹھی کا سودا ہوگیا ہے؟''

شیبا اب مجبور تھی۔ ''سوری شرافت! تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہیں استعمال کیا ہے۔ بس میں ہر بات کھل کر نہیں بتا سکتی تھی۔''

وہ مسکرایا۔ ''اگر تم نے استعمال کیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ کالج میں بھی تمہیں ایک سہارا درکار تھا جو دوسروں سے تمہیں محفوظ رکھتا اور وہ میری صورت میں مل گیا۔ بہرحال، مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ میں نے جو کیا خلوص سے کیا تھا۔''

''اب بھی تو تم نے خلوص سے کیا ہے۔'' شیبا جلدی سے بولی تو شرافت نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا پھر اس نے کہا۔

''اب میں چلوں گا، دوراتوں سے تمہارے چکر میں اپنی بیوی کو وقت نہیں دے پا رہا۔''

شیبا بجھ گئی۔ ''آج رات رک نہیں سکتے؟''

شرافت نے گہری سانس لی۔ ''شیبا! تمہاری پیشکش کا شکریہ... کسی وقت میں انتظار کرتا تھا اور تم نے کہا نہیں۔ اب میں کسی اور کا ہوں اس لیے تمہاری پیشکش کا جواب نہیں دے سکتا۔''

وہ باہر آئے۔ شیبا نے پھر شال اوڑھ لی تھی۔ شرافت نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے کہا۔ ''امید ہے کل تک تم بہ خیریت اپنے بچوں کے پاس پہنچ جاؤ گی۔ میں نے مقامی تھانے میں کہہ دیا ہے۔ ایک موبائل کوٹھی کے پاس یہ تمہیں وہاں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

تک چھوڑ کر آئے گی۔"

شیبا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر وہ کہہ نہ سکی اور شرافت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

لاہور ائرپورٹ پر شیبا اپنے سامان کے ساتھ لاؤنج میں دبئی جانے والی فلائٹ کی بورڈنگ کا انتظار کر رہی تھی اور شرافت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے معاملے میں سچ مچ شریف ثابت ہوا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ شیبا نے اس سے بہت کچھ چھپایا ہے، اس سے جھوٹ بھی بولا ہے اس کے باوجود وہ اس کے کام آیا۔ یہ کام اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شیبا کو ایک بار بھی نہیں جتایا، نہ اسے شرمندہ کیا۔ اس نے تو شیبا کی کھلی پیشکش ٹھکرا دی جو اس نے پورے دل و جان سے کی تھی۔ یہ سچ تھا کہ شیبا نے اسے کالج لائف میں بھی استعمال کیا تھا اور اب بھی استعمال کیا تھا بلکہ کر رہی تھی اور شرافت نہیں جانتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شیبا کو خلوص سے مشورہ دیا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس پر عمل کرے گی اور دبئی جاتے ہی ڈرائیور کو فارغ کر کے واپس بھیج دے گی۔ اب وہ کسی ہم وطن پر بھروسا نہیں کرے گی۔ وہاں دوسرے ملکوں کے سستے ملازموں کی کمی نہیں تھی۔

اچانک کوئی اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ شرافت تھا۔ "تم جانے والی تھیں، میں نے سوچا ایک آخری ملاقات کر لی جائے۔"

"میں بھی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"یہی نا کہ بالآخر میں ہی بے وقوف ثابت ہوا؟" شرافت کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ شیبا گڑبڑائی۔

"نہیں تو... میں ایسا نہیں سوچ رہی..."

"افسوس کہ تمہاری سوچ آج بھی وہی ہے جو آج سے بیس سال پہلے تھی۔ حالانکہ میں نے تمہیں خبردار کیا کہ میں بیس سال پہلے والا شرافت نہیں ہوں۔ تمہیں ایک چانس دیا کہ تم سچ بول دو اور مجھ پر اعتماد کرو جس کا میں مستحق ہوں مگر تم نے یہ چانس ضائع کر دیا۔ اب تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔"

شیبا نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "کیا مطلب؟"

شرافت نے جیب سے چند تصویریں نکالیں۔ یہ شیبا کی تصویروں سے لی گئی تھیں لیکن سامنے کے رخ سے نہیں بلکہ پیچھے کے رخ سے جو سادہ ہوتا ہے۔ "شیبا! مقدرت کے ساتھ... تیرہ سال ایک آدمی کی بیوی رہ کر بھی تم اندر سے وہی رہیں... آج بھی عزت اور نسوانی حرمت کی تمہارے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تم اسے مالِ تجارت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں جیسے کل رات تم نے معاوضے میں خود کو مجھے پیش کر دیا تھا۔"

"یہ غلط ہے، میں نے تمہیں اپنا محبوب جان کر..."

"یہ بات تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتی شیبا۔" شرافت کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "تم جانتی ہی نہیں ہو کہ محبت کیا ہوتی ہے اور محبوب کسے کہتے ہیں۔ تم نے آخری حد تک مجھے استعمال کیا۔" اس نے تصویریں شیبا کی گود میں پھینک دیں۔ "انہیں دیکھو... ان پر نظر آنے والے نمبرز اور دوسری تفصیلات سوئس اکاؤنٹس کی ہیں جہاں ملک صاحب نے ملک کو لوٹ کر کروڑوں ڈالرز جمع کرائے تھے۔ تم نے چالاکی سے یہ سب ان سے حاصل کیے یا انہوں نے خود تمہیں دے دیے اور تم نے انہیں ان تصویروں کی پشت پر ایسی سیاہی سے لکھ لیا جو صرف الٹرا وائلٹ روشنی میں دکھائی دیتی ہے۔"

"ملک صاحب نے خود یہ اکاؤنٹس میرے حوالے کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ میرے بچوں کا حق ہیں۔" شیبا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اس راز کو چھپانا تمہارا حق تھا، معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے۔ لیکن شیبا تم نے ہمیشہ کی طرح مجھے استعمال کر کے اس حق کو کھو دیا جو میری محبت نے تمہیں دیا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں سزا دوں گا تاکہ تمہیں بھی احساس ہو کہ جب آدمی کا اعتماد ٹوٹتا ہے تو وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔ اس میں سے ایک اکاؤنٹ میں اب کچھ نہیں ہے کیونکہ اس کی رقم جو میں تمہیں نہیں بتاؤں گا انٹرنیٹ کے ذریعے ایک دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کر کے اسے وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔"

شیبا بپھر گئی۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا کر چکا ہوں۔" شرافت کھڑا ہو گیا۔ "شیبا! تم نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا، آج میں نے اٹھا لیا۔ برسوں کا حساب برابر ہو گیا اور تم پر کوئی بار نہیں رہا۔ آئندہ جب مدد کی ضرورت ہو تو تم بلا جھجک مجھے پکار سکتی ہو۔" وہ کہتے ہوئے لاؤنج سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا اور شیبا بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

حرص کی ہوس حاکم بننے پر مجبور کر دیتی ہے... حاکمیت کے تصور سے مغلوب بعض افراد پر ممکن کوشش کے باوجود ذہنی طور پر محکوم ہی رہتے ہیں... ایک ایسے ہی کوتاہ اندیش کی خوش فہمی سے لبریز کتھا جو ہر صورت اپنی نصف بہتر کو شکست خوردہ اور زیرِ نگیں دیکھنے کا خواہش مند تھا...

زندگی کی بازی ہار کے اپنی بالادستی ثابت کر دینے والے فاتح کا احوال

بالادست

بابر نعیم

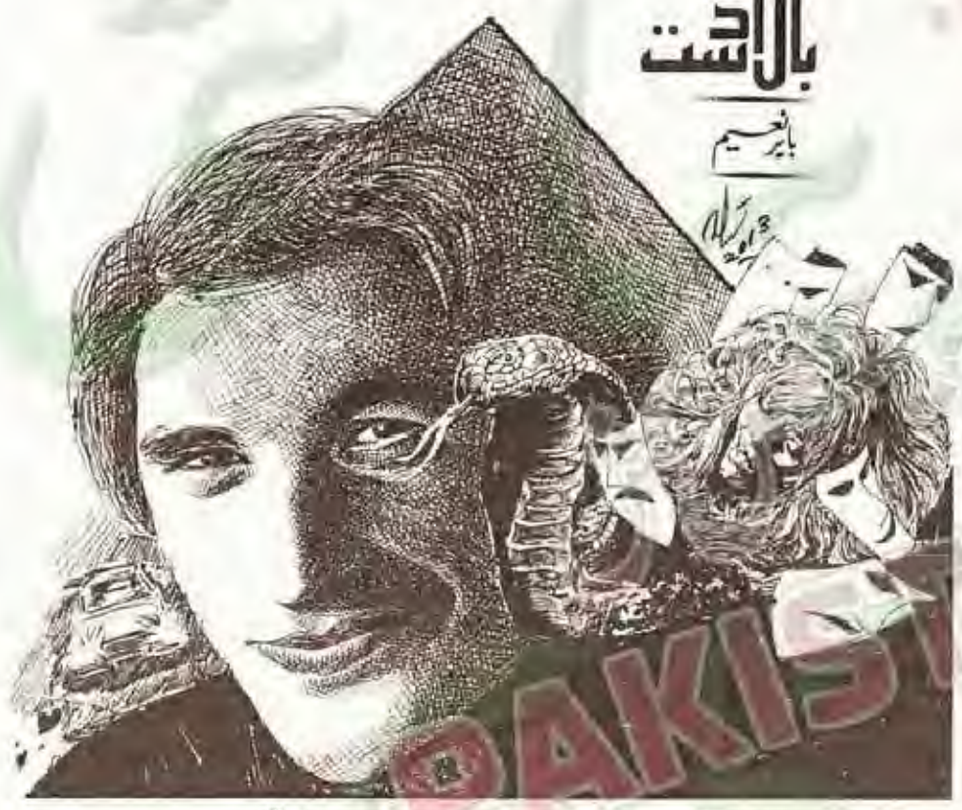

سام لیونگ روم کے فرش پر پڑے اپنی بیوی کے بے جان جسم کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس نے وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور اس قطرے کو پونچھنے لگا جو اس کے ہونٹ کے کنارے سے نیچے ٹپک گیا تھا۔

"مارگریٹ! اب بتاؤ بارا کون ہے؟"

اپنی نکتہ چیں اور دولت کو کنٹرول کرنے والی بیوی کو قتل کرنا ایک ایسی بات تھی جو اسے پانچ سال قبل کر لینی چاہیے تھی۔ اس نے دولت کی خاطر مارگریٹ سے شادی کی تھی جو عمر میں اس سے دس سال بڑی تھی۔

مارگریٹ ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ وہ سام کے میٹھی لچھے دار باتوں کے دام میں آ گئی تھی۔

بدقسمتی سے سام کو جلد ہی پتا چل گیا کہ مارگریٹ اخراجات پر قابو رکھنے کے فن سے بہ خوبی واقف ہے۔ اس نے سام کی مہنگی شراب نوشی کی عادت کو موقوف کر دیا تھا لیکن سام اسے بدھو بنانے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکالتا رہا اور یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی نشے میں دھت رہنے کی عادت نے اسے مشکل میں پھنسا دیا۔

مارگریٹ نے جو پیار کی بھوکی تھی، اپنا ناتا کہیں اور جوڑ لیا۔ اسے ایک اور کم عمر نوجوان مل گیا اور اس نے سام سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ سام اپنے معاش کا ذریعہ ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس نے یہ رشتہ برقرار رکھنے کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور دوسرے ہاتھ سے اس روشنی سے بچنے لگا جو اس کی آنکھوں کو چکاچوند کرتی ہوئی نزدیک آتی جارہی تھی۔

''کیا آپ کو کوئی مدد درکار ہے، سر؟'' ایک زنانہ آواز سنتے ہی سام کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اسے علم تھا کہ وہ اپنی لچھے دار گفتگو سے اس صورتِ حال سے نمٹ لے گا۔ سام نے ہاتھ پھیر کر اپنے بالوں کو سیدھا کیا اور سانس میں خوشبو پیدا کرنے والی پودینے کی میٹھی گولی منہ میں ڈال لی پھر اپنے پورے چھ فٹ چار انچ کے وجود کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''گڈ ایوننگ، آفیسر...''

''گلوریا۔''

''بس نائٹ فلیٹ ہوگیا ہے، آفیسر گلوریا۔ مجھے اسے تبدیل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' سام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے امید تھی کہ اس کی آواز بھرائی ہوئی لگی ہوگی۔

''کیا آپ کو کوئی اوزار درکار ہے؟'' آفیسر گلوریا نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''نہیں، میرے پاس گاڑی میں پیچھے سب کچھ موجود ہے۔'' سام نے کار کے عقبی حصے کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سہارے کے لیے کار پر ایک ہاتھ پھسلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

کار کے عقبی ڈبلی دروازے کو اس نے پہلے ہلکے سے کھول کر دیکھا کہ کہیں مارگریٹ کی لاش عقبی نشستوں کے نیچے سے پھسل کر باہر تو نہیں آگئی۔ لاش تو باہر نہیں آئی تھی البتہ سڑک پر اچھلنے اور کار کے ادھر اُدھر ڈولنے سے اس کا ایک ہاتھ ایک بار پھر کمبل کے اندر سے نکل کر باہر لٹک گیا تھا۔

سام نے پُرسکون رہتے ہوئے لاش کو ڈسٹرب کیے بغیر جیک باہر نکالا اور دروازے کو تیزی سے بند کردیا۔

سام نے جیک عقبی بمپر کے نیچے رکھا اور اسے پمپ کرتے ہوئے پہیے کو زمین پر سے اوپر اٹھادیا۔ اس دوران میں اس کا حلق خشک ہوچکا تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ وہسکی کا ایک گھونٹ بھر لے لیکن آفیسر کی موجودگی میں اس کی جرأت نہیں ہورہی تھی۔

سام چاہ رہا تھا کہ وہ پولیس آفیسر اپنی بیزار کردینے والی تیز روشنی اس کے چہرے پر سے ہٹادے لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر لانے سے قاصر تھا۔

''دیکھو آفیسر۔'' سام نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ہر چیز میرے کنٹرول میں ہے۔ تمہیں یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کام نمٹاتے ہی یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔''

''تو پھر آپ فلیٹ ٹائر کیوں بدل رہے ہیں؟'' اس خاتون پولیس آفیسر نے پوچھا۔ سام پر سکتہ طاری ہوگیا۔

''کیا آپ پیے ہوئے ہیں، سر؟''

سام نے کچھ مناسب سا جواب سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن سُن ہورہا تھا۔

''میں آپ کا لائسنس اور رجسٹریشن دیکھنا چاہوں گی، سر۔'' خاتون پولیس آفیسر نے کہا۔

سام کی انگلیاں اپنا پرس ٹٹولنے لگیں۔ اس نے مطلوبہ کاغذات نکالے اور انہیں پولیس آفیسر کی جانب بڑھادیا۔

''یہیں پر انتظار کریں اور کسی قسم کی حرکت کی کوشش مت کریں۔'' یہ کہہ کر وہ خاتون پولیس آفیسر اپنی پولیس پٹرول کار کی جانب چل دی۔

نشے میں دھت ہوکر ڈرائیونگ کرنے کا جرم، قتل کے جرم کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ سام نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اب مجھے اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے وہسکی کے گھونٹ بھرنے کی خاطر مزید کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔

''یہ رات تو مجھ پر بہت ہی زیادہ بھاری ثابت ہورہی ہے۔'' سام سوچ میں پڑگیا۔

سام نے تھک ہار کر اپنا بدن کار سے ٹکادیا۔ اس کے بھاری بھرکم بدن سے کار جیک پر سے پھسل گئی اور اس کا عقبی حصہ نرم مٹی کے پشتے سے کھسکتا ہوا شاہ بلوط کے ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گیا اور کار کا عقبی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

آواز میں سنتے ہی خاتون پولیس آفیسر کار کی جانب متوجہ ہوگئی۔

اس دوران میں کار کے کھلے ہوئے عقبی دروازے سے مارگریٹ کا ہاتھ ایک بار پھر باہر لٹک گیا۔

یہ منظر دیکھتے ہی سام گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہوچکی تھیں۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپالیا۔ اب وہ چکنی چپڑی باتوں سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ زندگی میں تو مارگریٹ ہمیشہ اس پر اپنی بالادستی قائم رکھتی تھی۔ اب مرنے کے بعد بھی اس نے اپنی بالادستی قائم رکھی تھی۔

اس دوران میں خاتون پولیس آفیسر مزید کمک کے لیے اپنے ریڈیو فون پر رابطہ قائم کررہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنا سروس ریوالور نکال کر سام پر تان لیا۔

کمک چند منٹ میں پہنچ گئی۔ سام کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہسکی کے چند مزید گھونٹ حلق سے نیچے اتار لے لیکن اس کے ہاتھوں میں تو اب ہتھکڑیاں پڑ چکی تھیں۔ وہ بے بسی سے وہسکی کے فلاسک کو دیکھتا ہوا پولیس پٹرول کار میں جا بیٹھا۔

مرد پر عورت کی بالادستی ایک بار پھر ثابت ہوچکی تھی۔

سرورق کی پہلی کہانی

خواب

نجمہ مودی

مصنف و ادیب معاشرے کے نباض ہوتے ہیں... انہیں ایسے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر طرح کا کام انجام دے سکیں... تاکہ اس نے جو کچھ دیکھا... سنا اور پڑھا... اس میں سے سچ اور جھوٹ کو الگ کر سکے... کھوٹے اور کھرے سونے میں فرق کر سکے... اسے ذہانت اور علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے... ذہانت اور علم کے بغیر کوئی انسان ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتا... جن کا مشاہدہ اس کی آنکھیں کرتی ہیں... صلاحیت اور قیادت کے حامل ایک ایسے ہی مصنف کا احاطہ کرتی کہانی... قدرت نے اسے انسان کی ان گنت نفسیاتی و ذہنی الجھنوں کو سمجھنے کا فن عطا کیا تھا... قتل کے ایک کیس کی انوکھی روداد... ادیب کے مشاہدے اور تجربے کا ناقابلِ فراموش کارنامہ...

سرابوں اور خوابوں کے سلسلے پر محیط ایک خوفی و پُرتجسس سرورق کہانی...

''کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں'' یہ وہ مصرع تھا جو..... نامور ادیب اور ڈراما نگار مقصود احمد مقصودی کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس مصرع کے ذیل میں کسی کہانی کا پلاٹ انہیں کچھ لکھنے یا کم از کم سوچنے پر مجبور کررہا ہو بلکہ اس حد درجہ معروف مصرع کا آموختہ اس لیے جاری تھا کہ مقصود احمد مقصودی صاحب اپنے نام آنے والی ڈاک دیکھ رہے تھے جو انہیں ماہنامہ ''ٹ'' کی معرفت موصول ہوئی تھی۔ ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی معرفت دنیا بھر سے آنے والے زیادہ تر خطوط ان کے پرستاروں کے ہوتے تھے جو اپنے محبوب مصنف کو اپنی تحریر میں خراجِ عقیدت و خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے تھے۔ چند خطوط ایسے بھی ہوتے تھے جن میں نئے اور نوآموز رائٹرز ان سے مشورے اور راہنمائی کی درخواست کرتے تھے۔ تاہم ان تمام خطوط میں ایک بات مشترک ہوتی تھی کہ مقصودی صاحب اپنے ذاتی پتے سے خط بھیجنے والے کو ضرور آگاہ کریں۔

مقصودی صاحب بیشتر خطوط کے جواب دے دیا کرتے تھے مگر پتے کے بارے میں معذرت کے ساتھ... وہ سوچتے تھے کہ اگر سب کو پتا دے دیا تو وہ صرف اپنے پرستاروں اور چاہنے والوں سے ہی مل کر اپنا وقت صرف کردیں گے اور ان کے پاس تخلیقی کام کرنے کے لیے وقت نہیں بچے گا۔ یہی ہدایت انہوں نے ڈائجسٹ کے مدیر کو بھی دی ہوئی تھی کہ ان کا پتا اور فون نمبر کسی کو بھی کسی صورت نہ بتایا جائے۔

اسی دوران میں ان کی نظر ایک لفافے پر پڑی جو عام ڈاک کے بجائے معروف کوریئر کمپنی کے ذریعے بھجوایا گیا تھا۔ انہوں نے اسے اٹھا لیا۔ اس پر ان کا نام اور ڈائجسٹ کی معرفت پتا لکھا ہوا تھا۔ مقصود احمد مقصودی نے الٹ پلٹ کر لفافے کا جائزہ لیا۔ وہ کاروباری ڈاک میں استعمال ہونے والا لفافہ تھا تاہم اس پر کسی ادارے یا کمپنی کا نام و پتا درج نہیں تھا۔ البتہ ایک کونے پر نوید علی اور ایک فون نمبر درج تھا جو شاید ڈیلیور نہ ہو سکنے کی صورت میں واپس اطلاع دینے کے لیے کام آتا۔

انہوں نے پیپر نائف اٹھایا اور لفافے کو چاک کیا۔ اندر سے امپورٹڈ کاغذ پر چھپا ہوا ایک معروف کمپنی کا لیٹر ہیڈ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا:

محترم مقصود احمد مقصودی صاحب!

السلام علیکم!

آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو آپ کی تحریروں، افسانوں، کہانیوں اور ڈراموں کی وجہ سے اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیے گا مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا ہے۔ محض اسی بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں آپ کا کتنا پرانا قاری رہا ہوں گا۔

اس وقت ایک الجھن درپیش ہے اور اس سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری معروضات کو غور سے پڑھیں گے اور ایک مشکل مسئلے کو سلجھانے میں ضرور معاونت فرمائیں گے۔

میں تو بچپن سے ہی آپ کا باقاعدہ قاری ہوں مگر میرے لیے یہ بات حد درجہ فخر و انبساط کا باعث ہے کہ میرے موجودہ باس یعنی ''ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز'' کے مالک جناب اظفر عالم بھی آپ کی تحریروں کے باقاعدہ قاری ہیں اور وہ تمام رسالے، ڈائجسٹ اور اخبار بڑے شوق سے پڑھتے ہیں جن میں آپ کے افسانے اور کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔

میں نے ان کی ہدایت پر ماہنامہ تجسس کے دفتر فون کر کے آپ کا پتا یا فون نمبر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر شاید آپ کی ہدایت کے مطابق وہاں سے مجھے کوئی مدد نہ مل سکی، البتہ وہاں سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ مصنفین کے نام آنے والی ڈاک بلا تاخیر مصنفین کو بھجوا دی جاتی ہے۔

اگر یہ اطلاع درست ہے تو یقیناً اس وقت آپ میرا یہ خط پڑھ رہے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ سے مخاطب ہونے کے باعث شاید کچھ ایکسائٹڈ ہو رہا ہوں اور خطرہ ہے کہ ان باتوں میں الجھ کر کہیں اصل بات کرنے سے نہ رہ جاؤں اس لیے میں اس خط کو مختصر کرتے ہوئے صرف یہ لکھوں گا کہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے مالک جناب اظفر عالم ایک ذاتی معاملے کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں اور انہوں نے ہدایت کی ہے کہ اگر آپ اکتیس دسمبر کو شام پانچ بجے انہیں شرفِ ملاقات عطا کرنے ان کے دفتر تشریف لا سکیں تو وہ آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گے۔ ان کے دفاتر فیکٹری ہی کی چار دیواری میں ہیں۔

مسئلے کی تفصیل خط میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے مگر اظفر صاحب کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ میرے پاس کی ایک الجھن کو سلجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوں گے۔

اگر آپ کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکتے ہوں تو صرف اسی صورت میں درج بالا ٹیلی فون نمبرز پر مجھے مطلع فرما دیجیے گا۔ بہ صورتِ دیگر حسبِ دعوت جناب اظفر عالم آپ کے منتظر ہوں گے۔

والسلام

آپ کا ادنیٰ پرستار

محمد آصف

سیکریٹری ٹو چیف ایگزیکٹو

ہاؤ

یہ عجیب و غریب خط پڑھ کر مقصودی صاحب الجھن میں پڑ گئے۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر کیلنڈر کو دیکھا۔ وہاں ستائیس کا ہندسہ پلاسٹک کے مربع خانے کے اندر جگمگا رہا تھا۔ گویا ابھی چار دن باقی تھے اور اس کے بعد نئے سال کا آغاز تھا۔

اظفر عالم اور ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا نام انہوں نے سن رکھا تھا مگر انہیں ان دونوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے ان کے دل میں خیال آیا کہ لیٹر ہیڈ پر درج فون نمبرز پر رابطہ کر کے وہ اپنے ادنیٰ پرستار سے بات کریں مگر دوسرے ہی لمحے خط کا آخری جملہ یاد آتے ہی انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ابھی چار دن باقی تھے۔ اس دوران میں اظفر عالم، اس کی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز اور سیکریٹری ٹو چیف ایگزیکٹو محمد آصف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی... اور پھر دستیاب معلومات کی روشنی میں اس دعوت کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اندرونی طور پر وہ اس دعوت کو قبول کر چکے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس کے نتیجے میں انہیں کوئی اچھی کہانی مل سکتی تھی۔

انہوں نے اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد باقی ڈاک دیکھنا شروع کر دی پھر انہوں نے کاغذ قلم اٹھایا اور ''قابلِ جواب'' خطوط کے جواب لکھنا اور جن خواتین و حضرات نے جوابی لفافہ ساتھ بھجوایا تھا ان کو خصوصاً جواب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

تمام خطوط کے جواب لکھنے کے بعد انہوں نے انگڑائی لی اور ملازم کو اچھی سی چائے کا حکم دیا۔ اتنی دیر میں وہ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو چکے تھے۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ان کا دھیان اظفر عالم کی طرف چلا گیا۔

نہ جانے کیسا ہو گا یہ شخص جو ایک گروپ آف انڈسٹریز کا مالک ہونے کے باوجود مجھ سے اس طرح پراسرار انداز میں ملنا چاہتا ہے؟ انہیں یہ بھی خیال آیا کہ شاید وہ اسی قسم کا عام سا سرمایہ دار ہو گا جو اپنے پیسے کے بل پر دنیا کی ہر شے کو خریدنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، بس انہیں علم ہو جائے کہ وہ شے ان کے اسٹیٹس کے لیے ضروری ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنے دوستوں [illegible] ادیب اور خط لکھوا کر

بلوا سکتا ہے۔

انہوں نے وہ لفافہ دوبارہ اٹھایا اور اس میں سے خط نکال کر دیکھا۔ اس پر فیکٹری کا پتا لکھا ہوا تھا جو کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع تھی۔ کورنگی انڈسٹریل ایریا کراچی کا معروف صنعتی علاقہ تھا۔ اس میں سائٹ کراچی جتنی فیکٹریاں تو نہیں تھیں مگر جس رفتار سے یہاں صنعتیں قائم ہو رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت جلد یہ ایک عظیم صنعتی شہر کی صورت میں ابھرے گا۔ گو کہ پہلے سے موجود صنعتوں اور ان کے گرد و پیش کی حالت اچھی نہیں تھی۔

اس سے پہلے کبھی ان کا اس علاقے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور ان کی زیادہ تر معلومات اخباری خبروں پر مشتمل تھیں جو وقتاً فوقتاً اس انڈسٹریل ایریا کے بارے میں چھپتی رہتی تھیں۔ اس علاقے کے بارے میں سوچتے ہوئے انہیں اظفر عالم کا خیال آیا اور انہوں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

ایک لمحہ ذہن پر زور دے کر انہوں نے ایک ٹیلی فون نمبر یاد کیا اور پھر ان کی انگلی مختلف ہندسوں کو پنچ کرنے لگی۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ٹیلی فون اٹھائے جانے پر انہوں نے کہا۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ آواز سے ظاہر تھا کہ فون کسی بزرگ نے اٹھایا تھا۔

''ندیم صاحب موجود ہیں؟'' مقصودی صاحب نے وعلیکم السلام کے جواب میں دریافت کیا۔

''آپ کون...؟'' دوسری طرف سے ان کے سوال کے جواب کو گول کر کے پوچھا گیا۔

''میرا نام مقصود احمد مقصودی ہے اور میں ندیم کا دوست ہوں۔'' اس بار مقصودی صاحب نے اپنا تعارف کرا دیا۔

''ایک منٹ ہولڈ کریں۔ میں بلاتا ہوں۔'' دوسری طرف سے جواب آیا اور پھر ٹیلی فون کا ریسیور میز پر رکھنے کی آواز آئی۔

مقصودی صاحب نے گہرا سانس لیا اور بے دھیانی میں دیوار گیر گھڑی پر نظریں جما دیں۔ اس طرح شاید وہ ایک منٹ کو پورا ہوتا دیکھنا چاہ رہے تھے۔ تاہم سیکنڈ کی سوئی نے اپنا چکر مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک ہشاش بشاش چہکتی ہوئی آواز ان کے کانوں میں آئی۔

''ہاں... بولو مقصودی! کیا حال ہیں؟'' یہ ندیم کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

آواز تھی جو ایک معروف روزنامے میں رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

''یہ اظفر عالم کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' مقصودی صاحب نے کسی قسم کی رسمیات میں پڑے بغیر براہِ راست پوچھا۔

''اظفر... عا... لم!'' ندیم کی آواز پُرسوچ ہوگئی تھی۔ ''یہ کون ذات شریف ہیں؟''

''یہ جاننا تو تمہیں فون کرنے کا خرچہ کیوں کرتا؟'' مقصودی صاحب نے ذرا چڑنے کا انداز اختیار کر کے کہا۔ ''بہرحال اتنا جانتا ہوں کہ یہ صاحب ایک گروپ آف انڈسٹریز کے مالک ہیں... شاید ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز...''

''یہ ہاف مون کیوں...'' ندیم نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''فل مون کیوں نہیں؟ ویسے میں ان صاحب کو نہیں جانتا...''

''تو پھر کون جانتا ہوگا؟ اور تمہارے اتنے بڑے اخبار میں کام کرنے کا کیا فائدہ ہے؟'' مقصودی صاحب نے بھی اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر کہا۔

''بڑے اخبار میں کام کرنے کے کیا فائدے ہیں؟ اس پر تو ایک مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔'' ندیم نے جواب دیا۔ ''مگر اس وقت اس موضوع پر بات نہیں ہو رہی۔ ویسے تم خود بھی کئی پرچوں کے مدیر رہ چکے ہو۔ تم سے زیادہ اچھی طرح بھلا کون جانے گا کہ اخبار کے رپورٹر ہونے میں کیا فائدہ ہے...''

''ابھی تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ یہ موضوع زیرِ گفتگو نہیں ہے پھر بھی اسی کی ٹانگ کھینچنے میں لگے ہوئے ہو۔'' مقصودی صاحب نے اس کی گفتگو کو لمبا ہوتا دیکھ کر درمیان میں مداخلت کی۔ ''اور دوسرے تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں شوبز اور پھر ذرا ادبی قسم کے جرائد کا مدیر رہا ہوں اور...''

''آہ...!'' دوسری طرف سے ندیم نے ایک سرد آہ بھری۔ ''کیا یاد دلا دیا... بلکہ کیا ذکر چھیڑ دیا... شو... بز...! جگ مگ کرتے ستارے اور ان ستاروں سے حال احوال پوچھتے اپنے مدیر صاحب... تم نے بھی اس فیلڈ میں کم مزے نہیں لوٹے ہوں گے۔'' اس کا لہجہ رشک آمیز ہوگیا تھا۔

''لگتا ہے کہ اس وقت تم سے کوئی کام کی بات کرنا ممکن نہیں ہے۔'' مقصودی صاحب واقعتاً جھنجلانے لگے تھے۔ ''میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اظفر عالم کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''اور تمہارے اس سوال کا جواب میں دے چکا ہوں... ایک مرتبہ پھر سن لو کہ نہیں... اور جہاں تک بات ہے اخبار میں کام کرنے کی... تو ہر شخص اپنے شعبے کے حوالے سے تو انسائیکلوپیڈیا ہوسکتا ہے مگر کسی اور کے بارے میں...''

''اور آج کل تمہارا شعبہ کیا ہے؟'' مقصودی صاحب نے پھر اسے بریک لگایا۔

''میری بیٹ شروع ہی سے کرائم کی رہی ہے۔'' ندیم نے مزید کوئی ہیر پھیر کیے بغیر سیدھا جواب دیا۔ ''اور اس اظفر عالم کے بارے میں کامرس والا بندہ کچھ بتا سکے گا۔''

''سخت فضول آدمی ہو تم۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔ ''یہ بات تم مجھے شروع میں بھی بتا سکتے تھے۔ خوامخواہ میں نے اپنا اتنا وقت ضائع کیا۔''

''اپنی تعریفیں سننے کو تم وقت ضائع کرنا کہتے ہو۔'' ندیم نے ایک نئی کہانی شروع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تمہاری کہانی تمہیں یاد دلا رہا تھا... ایک قاری کی حیثیت سے یہ تمہیں خراجِ تحسین تھا جو شاید تمہیں راس نہیں آیا۔ ٹھیک ہے بھئی... نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔''

''تم اور تمہارا خراجِ تحسین... دونوں گئے بھاڑ میں۔'' مقصودی صاحب نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ ''میں فرخ سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ مجھے اس کے بارے میں بتا دے گا۔''

''ہاں، یہ بندہ اس کام کے لیے نہایت مناسب ہے۔'' ندیم نے بھی تائید کی۔ ''مگر یہ یاد رکھنا کہ وہ اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں لگے گا جتنی آسانی سے تم نے میرا اتنا وقت برباد کر دیا ہے۔''

مقصودی صاحب نے مزید ایک لفظ کہے بغیر فون بند کر دیا اور دوسرا نمبر ڈائل کرنے کے لیے ہندسوں کو دبانے لگے۔

''ہیلو... فرخ! میں مقصودی بول رہا ہوں۔'' دوسری جانب سے شناسا آواز سنتے ہی انہوں نے کہا۔

''سائیں کیا حال ہیں؟'' فرخ کی آواز میں گرم جوشی تھی۔ ''میہ... نو... ا... کا...''

''ایک

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوں۔'' فرخ نے خوش دلی سے کہا۔ ''یہ سیٹھ اظفر عالم کاروباری حلقے میں ایک پراسرار شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کا بزنس صرف پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ کئی بار اس کی کمپنیوں کو مختلف ایوارڈز مل چکے ہیں اور اس کا گروپ آف انڈسٹریز بلاشبہ بہت اچھی ساکھ کا حامل ہے مگر ان سب کے باوجود اظفر عالم کو کسی تقریب میں نہیں دیکھا گیا۔ ہر بار... حتیٰ کہ کئی مرتبہ تو صدر یا وزیراعظم کے ہاتھوں ملنے والے ایوارڈز یا ٹرافی کو وصول کرنے بھی اس کا کوئی خاص ملازم ہی آیا۔ یہ خود بھی نہیں آیا۔ اسی طرح مختلف فیڈریشنز وغیرہ میں بھی اس کے نمائندے ہی ممبرشپ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ وہی اس گروپ کے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اظفر عالم اپنے حلقے میں ایک پراسرار شخص کی حیثیت سے معروف ہے۔ ایسی شخصیت کہ کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ بہت کم لوگوں نے اس کی شکل دیکھی ہے۔ اس کے باوجود وہ کاروباری دنیا کی خاصی مشہور ہستی ہے...''

فرخ دوسری طرف سے بول رہا تھا اور مقصودی صاحب خاموشی سے سن رہے تھے۔ فرخ اظفر عالم کا ذکر کرتے ہوئے جتنا ایکسائٹڈ ہو رہا تھا، اس سے مقصودی صاحب کو اندازہ ہوا کہ فرخ کو ان کے سوال پر خاصی حیرت ہوئی ہوگی کہ اس درجے کے پراسرار آدمی کے بارے میں ایک ادیب اور ڈراما نگار کیوں استفسار کر رہا ہے؟ وہ سمجھ گئے تھے کہ اپنی بات ختم کر کے وہ مقصودی صاحب کے پیچھے پڑ جائے گا کہ اسے بتایا جائے کہ انہوں نے اظفر عالم کے بارے میں یہ معلومات کس وجہ سے حاصل کی ہیں۔

''... میرا خیال ہے کہ اب آپ کو بخوبی معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں اظفر عالم کا سن کر کیوں چونکا تھا۔'' دوسری طرف سے فرخ کہہ رہا تھا۔ ''اور اب اتنی تفصیل بتانے کے بعد آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

مقصودی صاحب کیونکہ پہلے ہی اس کا اندازہ لگا چکے تھے اس لیے انہوں نے اس کا جواب بھی سوچ رکھا تھا۔ وہ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ اظفر عالم کے سیکریٹری نے انہیں اظفر عالم سے ملاقات کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس صورت میں تو یہ خبر شاید اگلے دن کے کامرس پیج پر جلی سرخی میں شائع ہوتی۔

لہٰذا انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیتے

جواب دیا۔ ''تم سناؤ کام دھندا کیسا چل رہا ہے؟''

''سائیں نوکری کر رہے ہیں اور وقت کو دھکا دے رہے ہیں۔'' فرخ نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''یہ بتاؤ، آج کل کس بیٹ پر ہو؟'' انہوں نے ازراہِ احتیاط اس سے پہلے ہی اس کے شعبے کے بارے میں پوچھا۔

''سائیں... وہی کاروباری دنیا کے کالے گورے دھندے ہیں۔'' فرخ نے جواب دیا۔ ''صبح سے شام تک بینکوں اور سرمایہ داروں کی خبریں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔''

''ڈھونڈتے پھرتے ہیں یا سونگھتے پھرتے ہیں؟'' مقصودی صاحب نے ہلکے سے قہقہے کے درمیان کہا۔

''بابا! آپ بڑے لوگ ہو جو دل چاہے کہو، ہمیں کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ ویسے سائیں! آج کل کہاں ہیں؟ بہت دنوں سے دیدار نہیں کرایا اور ادھر ٹی وی شی وی پر کوئی شیا ڈراما بھی نہیں چل رہا۔ سائیں کہیں تھک تو نہیں گئے؟'' آخر میں اس کا لہجہ کچھ معنی خیز ہوگیا تھا۔ ''یا کوئی نئی مصروفیت تو نہیں ڈھونڈ لی؟''

''ارے نہیں یار! بس سب چل رہا ہے۔ آج کل ایک سیریل کی تیاری میں ہوں اس لیے ادھر ادھر آنے جانے کا موقع بھی کم مل رہا ہے...'' مقصودی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا پھر ذرا سنجیدگی سے بولے۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ اظفر عالم کو جانتے ہو؟''

''کون... وہی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا چیف ایگزیکٹو... آپ اسی اظفر عالم کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا تو مقصودی صاحب کو محسوس ہوا کہ اس نام نے اسے چونکا دیا تھا۔

''ہاں وہی اظفر عالم... میں اسی کے بارے میں کچھ معلومات چاہتا ہوں۔'' انہوں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کے بارے میں یقیناً جانتے ہوگے؟''

''ارے نہیں سائیں... وہ تو کوئی پاگل یا خبطی سیٹھ ہے۔'' فرخ نے نیم مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔ ''مگر آپ یہ بتاؤ کہ آپ کو اس کے بارے میں جاننے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟''

''پہلے سوال میں نے کیا ہے اس لیے پہلے مجھے جواب ملنا چاہیے۔'' مقصودی صاحب نے تادیبی انداز اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ''تمہارے سوالوں کے جواب بعد میں ہوں گے۔''

ہی اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے کہا۔ ''یار! تم تو جانتے ہو میں چھوٹا موٹا رائٹر ہوں۔ تمہارے اس اظفر عالم کے بارے میں مجھے کچھ اسی طرح کی خبریں ملی تھیں اور مجھے ان پر یقین نہیں آیا تھا کہ بھلا ایک بڑا کاروباری شخص کس طرح اتنا پراسرار ہوسکتا ہے؟ بس اس کی تصدیق کے لیے تمہیں فون کیا تھا کیونکہ اس کے بارے میں سن کر ایک کہانی کا پلاٹ میرے ذہن میں کلبلانے لگا تھا...''

''ٹھیک ہے سائیں! آپ ہمیں بھی گولی دے رہے ہو۔'' دوسری طرف سے فرخ نے ایک بار پُرلہجہ بدلتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم بھی اخباری دنیا کے آدمی ہیں مگر یاروں کے یار ہیں۔ ابھی جو کچھ آپ نے کہا ہے، میں نے اس پر یقین کرلیا مگر سائیں! ایک وعدہ کرو... کہ اگر آپ کو اس اظفر عالم کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہوجائے جس سے خبر بن سکتی ہو تو وہ مجھے ضرور بتادینا۔''

مقصودی صاحب بہ خوبی سمجھ گئے تھے کہ فرخ ان کے ٹالنے کے انداز سے سمجھ گیا ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے تاہم انہوں نے اس کے خیالات کی تائید یا تصدیق کیے بنا صرف اتنا کہا۔ ''یار فرخ! تم اطمینان رکھو... اگر کوئی خبر مجھے ملی تو وہ میں صرف تمہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے سائیں... آپ نے کہا اور ہم نے مانا۔'' فرخ نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ ''اور کوئی حکم؟''

''نہیں... شکریہ...'' مقصودی صاحب اس کا شکریہ ادا کر کے فون بند کرنا چاہتے تھے کہ اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔ ''سنو! یہ بتاؤ کہ کیا واقعی اظفر عالم نامی کسی شخصیت کا وجود ہے بھی... ایسا تو نہیں کہ اس نام کے پردے میں کوئی اور چھپا بیٹھا ہو یا...؟''

''چھپی بیٹھی ہو!'' ان کا جملہ فرخ نے اچکا اور اسے مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''جو آپ سوچ رہے ہو، ایسا نہیں ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اظفر عالم موجود ہے البتہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کو سات... بلکہ چودہ پردوں میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔''

''اس کی فیملی لائف کے بارے میں کیا خبریں ہیں؟'' مقصودی صاحب نے نکتہ نکالا۔

''اس بارے میں بھی کوئی کنفرم اطلاع نہیں ہے۔'' فرخ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی فیملی کے حوالے سے بھی متضاد اطلاعات مارکیٹ میں گردش کرتی رہی ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اس نے شادی ہی نہیں کی اور یہ قول راوی... وہ ان لوگوں میں سے ہے جو دودھ کی خاطر بھینس نہیں پالتے بلکہ جب دودھ درکار ہوتا ہے، بازار سے خرید لاتے ہیں مگر ایک ایسی بھی خبر کاروباری حلقے میں گردش کرتی رہی تھی کہ اظفر عالم نے کئی شادیاں کیں مگر اسے اولاد کسی بھی بیوی سے نہیں ملی... اب میں کیا بتاؤں سائیں کہ ایک اطلاع تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ بھی پھیلی تھی کہ اس نے صرف ایک شادی کی اور اس کی بیوی غالباً دوسرے یا تیسرے بچے کی ولادت کے دوران انتقال کر گئی تھی مگر سائیں! بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی خبر یا افواہ کی کوئی تصدیق نہیں ہوسکی۔ اس کے ملازمین اس کے بارے میں اپنی زبانیں سختی سے بند رکھتے ہیں۔ اس لیے کبھی کسی خبر کی تصدیق نہیں ہوسکی... بس یا اور کچھ؟'' اس نے سوالیہ انداز میں اپنی بات ختم کی۔

''بس ایک دو باتیں اور... مگر اس سے پہلے یہ تعریفی تبصرہ بھی ضروری ہے کہ تمہیں اس کی پراسراریت کے باوجود اس کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔''

مقصودی صاحب نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''بس سائیں، ابھی اور شرمندہ نہیں کرو۔'' فرخ نے انکشاف کے ساتھ کہا۔ ''یہ تو وہ عام سی باتیں ہیں جو اس کے بارے میں تقریباً سب ہی جانتے ہیں۔ آپ بتاؤ آپ کو کیا پوچھنا ہے؟''

''یار! تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ آج جبکہ انسان مریخ کی خبر لا رہا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ کراچی جیسے شہر میں ایک انتہائی دولت مند شخص خود کو اس طرح چھپا کر رکھے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا چہرہ دیکھا ہو اور لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں؟'' مقصودی صاحب نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''سائیں! یہ نہیں ہے کہ لوگ اسے نہیں جانتے۔ وہ خوب اچھی طرح جانا جاتا ہے۔ شہر میں اس کے کئی فلاحی ادارے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خود اس کے نام سے بہت سے طالب علموں کو تعلیمی وظائف وغیرہ دیے جاتے ہیں۔'' فرخ نے اظفر عالم کی شخصیت کا ایک اور پہلو مقصودی صاحب پر عیاں کیا۔ ''بس خود اسے پردوں میں رہنے کا شوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے اور وہ اس طرح خود کو چھپا کر رکھنے میں لطف محسوس کرتا ہے۔''

''بہرحال، کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا چیف ایگزیکٹو اظفر عالم ایک پراسرار شخصیت۔

لے کر کہا۔ ''میں نے تمہارا اتنا وقت لیا، اس کے لیے شکریہ...!''

''سائیں! ابھی مجھے جوتا تو نہ مارو۔'' دوسری طرف سے فرخ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یہ شکریے کا لفظ ادا کر کے آپ مجھے جوتا تو مار رہے ہو... سائیں! ہم تو آپ ادیبوں، دانشوروں کے خادم ہیں اور ان کی خدمت بجالانا اپنے لیے خوشی کا سبب بنتا ہے۔''

''تمہاری مہربانی ہے کہ تم ایسا سمجھتے ہو۔'' مقصودی صاحب نے ممنون ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں، تم بے فکر رہو... اگر مجھے اظفر عالم کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہوئی جو خبر بن سکتی ہوئی تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔''

''میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔'' فرخ نے دوسری طرف سے کہا اور مقصودی صاحب نے فون بند کردیا۔

فون بند کر کے انہوں نے ایک مرتبہ پھر انگڑائی لی اور پھر گھڑی پر نگاہ پڑتے ہی چونک اٹھے۔

''اوہ! اتنا وقت گزر گیا اور مجھے احساس ہی نہیں ہو سکا۔'' انہوں نے خود کلامی کی اور پھر اٹھ کر تیار ہونے لگے۔ انہیں یاد تھا کہ اس دن آرٹس کونسل میں ایک معروف ادیبہ کی تازہ ترین تخلیق کی ''رونمائی'' ہونے والی تھی۔ تخلیقات تو ان محترمہ کی بس ایویں ہی ہوتی تھیں مگر بذات خود ادیبہ صاحبہ خاصے کی چیز تھیں اور مقصودی صاحب پر خاصی مہربان بھی تھیں اس لیے اس تقریب میں شرکت ضروری تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس بہانے وہاں اور بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہوجاتی تھی۔

اس تقریب رونمائی سے مقصودی صاحب کی واپسی گویا گیارہ بجے تک ممکن ہوسکی۔ تقریب خاصی رنگین ہونے کے باوجود حسبِ توقع خشک تھی۔ رنگین اس اعتبار سے کہ مدعوئین میں زیادہ تعداد رنگین آنچلوں والی شخصیات کی تھی۔ محترمہ ادیبہ صاحبہ ایک پرائیویٹ کالج بھی چلا رہی تھیں اور شاید انہوں نے وہاں پڑھانے والی استانیوں کے ساتھ ساتھ طالبات کو بھی اس تقریب میں شرکت کا پابند کردیا تھا اس لیے آرٹس کونسل میں خاصی بہار دکھائی دیتی رہی تھی۔

مقصودی صاحب کی موجودگی کی اطلاع نے وہاں موجود حاضرین میں خاصا جوش پیدا کردیا تھا جن میں استانیوں اور طالبات کی خاصی بڑی تعداد پیش پیش تھی۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ مقصودی صاحب کا پتی پرنپل حب کے

ہمراہ تصویر بنوانے کو ترجیح دے رہی تھیں۔

اس جاں فزا ماحول میں بھی مقصودی صاحب مسلسل اظفر عالم کے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ اس کا خط انہیں اب پراسرار محسوس ہو رہا تھا۔ فرخ سے بات کرنے کے بعد ایک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ آصف کو فون کر کے دعوت قبول کرنے سے معذرت کرلیں مگر دوسرے ہی لمحے ان کے اندر کے رائٹر نے انہیں مشورہ دیا کہ اس طرح وہ ایک کہانی سے بھی محروم ہوسکتے ہیں۔ اس لیے انہیں وہاں ضرور جانا چاہیے اور ایک ایسی پراسرار ہستی کو دیکھنا چاہیے جسے بہت سے لوگ کوششوں کے باوجود نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

گھر واپس آکر انہوں نے چائے پی اور پھر کاغذ قلم سنبھال کر لکھنے میں مصروف ہوگئے۔ اب انہیں رات کو دیر تک کہانی لکھنی تھی۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹ رہے تھے، تب انہیں خیال آیا کہ انہوں نے فرخ سے اظفر عالم کی رہائش کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ صبح بیدار ہونے کے بعد فرخ سے ضرور رابطہ کریں گے۔

رات کو دیر سے سونے کے باعث صبح ان کی آنکھ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کھلی اور ناشتا کرتے کرتے ساڑھے بارہ کا وقت ہوگیا۔ یہ تو برنچ ہوگیا۔ انہوں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ برنچ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ چائے پینے کے دوران اخبار کی سرخیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی ورق گردانی کے دوران وہ بے خیالی میں کامرس کا صفحہ دیکھنے لگے۔ اچانک ان کی نظر ایک خبر پر پڑی اور وہ چونک اٹھے۔

آنے والے بجٹ کے حوالے سے ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے چیف ایگزیکٹو اظفر عالم کا بیان جلی سرخی کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ مقصودی صاحب بے اختیاری کے عالم میں پوری خبر پڑھتے چلے گئے۔ اپنے بیان میں اظفر عالم نے ملکی معیشت کے حوالے سے خاصی تفصیلی گفتگو کی تھی اور کئی ایک مثبت تجاویز بھی پیش کی تھیں۔

مقصودی صاحب نے دیگر اخبار بھی دیکھے۔ تقریباً تمام ہی انگریزی اور اردو اخبارات نے اظفر عالم کے اخباری بیان کو مناسب اہمیت دی تھی۔ اس سے اس کی شخصیت کے وزن کا اندازہ ہو رہا تھا۔

چائے پیتے پیتے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے دفتر کا جائزہ لے لیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گے تاکہ تین دن بعد پتا ڈھونڈتے میں وقت ضائع نہ ہو۔

کورنگی انڈسٹریل ایریا ان کی توقع سے زیادہ گنجلک ثابت ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا دفتر مرکزی سڑک پر ہوگا جو گودام چورنگی سے شروع ہو کر داؤد چورنگی تک جارہی تھی اور اسی خیال کے تحت وہ انڈسٹریل ایریا کا پل عبور کر کے سیدھے ہی چلتے چلے گئے۔ داؤد چورنگی کے آثار نظر آنے تک ان کی نظریں اپنے دونوں اطراف میں واقع فیکٹریوں اور کارخانوں کا جائزہ لیتی رہی تھیں مگر انہیں کہیں بھی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز یا ہاف مون انڈسٹری کا بورڈ نظر نہیں آیا۔

داؤد چورنگی تک کا فاصلہ خاصا تھا اور سڑک بھی ایسی تھی کہ بس الاماشاء اللہ...! ڈرائیونگ کے دوران سڑک کے گڑھوں سے کار کو بچانے کی جدوجہد میں خود ان کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا اور ابھی واپسی کا سفر بھی باقی تھا۔

اب کیا کریں؟ انہوں نے خود سے سوال کیا پھر کسی پی سی او کی تلاش میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اس وقت تک پاکستان میں موبائل فون دستیاب نہیں تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ہاف مون انڈسٹریز کے فون پر رابطہ کر کے وہاں سے ایڈریس سمجھ لیں گے اور اس کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنا نام اور مقصد بھی بتاتے۔

چند قدم کے فاصلے پر انہیں ایک دکان میں کئی ٹیلی فون اور باہر لگا پی سی او کا بورڈ نظر آ گیا۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ''ملکی اور غیر ملکی کالوں کا مرکز!'' انہوں نے اسے پڑھا اور ان کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ کار سے اتر کر پی سی او کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے وہ ہاف مون انڈسٹریز کے سیکریٹری چیف ایگزیکٹو کا خط گاڑی سے اٹھانا نہیں بھولے تھے۔ اسی پر تو ٹیلی فون نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ پی سی او خالی پڑا تھا اور پینٹ شرٹ والا ایک نوجوان ڈائجسٹ کے مطالعے میں مصروف تھا۔ ان کی آمد کا احساس ہونے پر اس نے ڈائجسٹ اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ مقصودی صاحب نے دیکھا، وہ ماہنامہ ''تجسس ڈائجسٹ'' کا تازہ شمارہ تھا۔

''جی سر!'' انہیں دکان میں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے مہذبانہ انداز میں کہا۔ ''لوکل کال ہے یا کسی دوسرے شہر فون کرنا ہے؟''

''مجھے تو لوکل کال کرنی ہے مگر پہلے ایک بات بتاؤ۔'' مقصودی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنے دیسی کالے تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ نے غیر ملک سے بھی کالے ہی منگوائے ہیں تو بڑا ظلم کیا ہے۔ وہاں سے گورے یا کم گوریاں بلوائی تھیں۔''

''جی...!'' اس غیر متعلق اور انتہائی غیر متوقع بات کو سن کر نوجوان چونک اٹھا۔

''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آپ نے بورڈ پر لکھا ہے۔ 'ملکی اور غیر ملکی کالوں کا مرکز!' مگر یہاں تو مجھے کوئی ملکی کالا بھی نظر نہیں آرہا کیونکہ آپ تو ماشاء اللہ خاصے گورے ہیں۔'' مقصودی صاحب نے باہر رکھے بورڈ کی طرف اشارہ کر کے وضاحتی انداز میں کہا تو نوجوان کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''دراصل یہ انگریزی کال کی اردو میں جمع بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے 'کالیں' ہوگئی ہے ورنہ اصل میں تو کالز لکھا جانا چاہیے تھا۔'' نوجوان نے محظوظ ہوتے ہوئے وضاحتی انداز میں کہا۔ ''ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس جملے کی یہ تشریح آج تک کسی نے نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کوئی ادیب یا دانشور قسم کی شخصیت ہیں جب ہی تو آپ نے ایک عام سی غلطی سے ایسی زبردست بات نکال لی۔''

مقصودی صاحب کو اس کے قیاس پر حیرت ہوئی مگر انہوں نے انکساری کے ساتھ کہا۔ ''نہیں بھئی، میں کوئی دانشور یا ادیب نہیں ہوں بس اسے دیکھتے ہی ایک بات ذہن میں آئی اور میں نے اس کا اظہار کر دیا۔ اچھا، اب یہ باتیں چھوڑو اور مجھے ایک نمبر ملا کر دو۔'' انہوں نے اپنے مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

''بالکل... بالکل۔'' نوجوان مستعدی سے بولا اور ایک ٹیلی فون ان کی طرف کھسکا کر بولا۔ ''آپ خود ملالیں۔''

مقصودی صاحب نے شکریہ کہتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے خط پر لکھے فون نمبرز میں سے ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ تین گھنٹیاں بجنے کے بعد اچانک ایک بیپ کی آواز آئی اور آنسرنگ مشین میں ریکارڈ شدہ پیغام سے سنائی دینے لگا۔

''یہ محمد آصف، سیکریٹری ٹو چیف ایگزیکٹو جناب اظفر عالم کا نمبر ہے۔ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ آپ اپنا پیغام مع نام اور ٹیلی فون نمبر اس بیپ کے بعد ریکارڈ کرا سکتے ہیں۔'' یہی پیغام انگ [illegible] آواز ابھری اور ٹیپ

دوبارہ بیپ کی آواز آئی اور پھر ''نو میسج ریکارڈڈ'' کے مختصر پیغام کے بعد ایک مرتبہ پھر پہلے والا پیغام دہرایا جانے لگا۔

مقصودی صاحب نے کریڈل دبا کر کال منقطع کر دی۔ وہ بھلا کیا پیغام ریکارڈ کرا سکتے تھے؟ انہوں نے بقیہ نمبر بھی ٹرائی کیے مگر سب پر یہی ریکارڈنگ لگی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا سر؟'' نوجوان نے ان کی مسلسل خاموشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا؟''

''ہاں، بس ایسی ہی بات ہے۔'' مقصودی صاحب نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ غیر متعلق افراد کے ٹیلی فون سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اب فون کرنے والا اپنا مدعا اور نام و پتا وہاں ریکارڈ کروا دیتا اور بعد میں ان ریکارڈنگز کو سن کر یہ فیصلہ کر لیا جاتا کہ کس سے بات کرنی ہے اور کس سے نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اظفر عالم کا سیکریٹری وہیں موجود ہو اور ہر کال کی ریکارڈنگ کے بعد اسے سن رہا ہو۔ احتیاط کا یہ انداز دیکھ کر مقصودی صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہیں اب مزہ آنے لگا تھا۔ ''یہ اظفر عالم تو خاصی دلچسپ شے ثابت ہوتی نظر آرہی ہے۔'' انہوں نے خود سے کہا اور بٹوے میں سے ٹیلی فون کالز کی رقم نکال کر نوجوان کی طرف بڑھائی۔

''یہ کس بات کے؟'' نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کا تو کوئی نمبر اٹینڈ ہی نہیں ہوا۔''

''رکھ لو۔'' مقصودی صاحب نے وضاحت کیے بغیر کہا۔ ''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فون اٹینڈ نہ ہونے کے باوجود کال ہو جاتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ سیکریٹو ٹنٹی تھری کس طرف ہوگا؟'' انہوں نے فون پر پتا معلوم کرنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد اب اس طرح کوشش کی۔

''سیکریٹو ٹنٹی تھری!'' نوجوان نے دہرایا۔ اس نے ٹیلی فون کالز کی رقم وصول کر لی تھی۔ ''کورنگی یا لانڈھی؟'' اس نے سوال کیا۔

''کورنگی انڈسٹریل ایریا۔'' مقصودی صاحب نے جواب دیا۔

''کورنگی انڈسٹریل ایریا۔'' نوجوان نے پُرسوچ انداز میں دہرایا۔ ''سیکریٹو ٹنٹی تھری... اوہ! ہاں... مگر وہ تو یہاں سے بہت دور ہے... آپ یہاں سے واپس ہو جائیں اور پھر چلتے چلے جائیں۔ یہاں سے چھٹی چورنگی سارا علاقہ

مقصودی صاحب کو ایک لمحے کے لیے لرزہ سا آ گیا۔ وہ جو صعوبت برداشت کرتے کے بعد اس مقام تک پہنچے تھے، اس کو دوبارہ برداشت کرنے کے بارے میں سوچتے ہوئے انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ خوامخواہ اس مہم پر تنہا کیوں نکل آئے تھے اور کسی کو نہیں تو وہ کامران ایڈووکیٹ کو تو بلا ہی سکتے تھے جس کی گفتگو میں ان کا وقت اچھا گزر جاتا۔

''اچھا!'' انہوں نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے آپ کو یقین ہے کہ سیکریٹو ٹنٹی تھری اسی طرف ہے؟'' انہوں نے یقین دہانی چاہی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ نوجوان اپنی رائے پر نظر ثانی کر لے اور انہیں بتا دے کہ ''اوہ! ہاں... میں غلطی پر تھا۔ سیکریٹو ٹنٹی تھری تو وہ سامنے والا علاقہ ہے۔ بتائیے آپ کو کہاں جانا ہے؟'' مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور نوجوان نے وثوق سے اپنا سر ہلایا۔

''میں آپ کو مس گائیڈ نہیں کر رہا، مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ گودام چورنگی کا علاقہ سیکریٹو ٹنٹی تھری میں آتا ہے۔''

اس کے انداز نے مقصودی صاحب کو یقین دلا دیا کہ انہیں اسی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ایک مرتبہ پھر ڈرائیونگ کرنی ہوگی اور کار کے ساتھ ساتھ اپنے بھی انجر پنجر ڈھیلے کرانے ہوں گے۔

وہ واپسی کے لیے مڑے اور اظفر عالم اور اس کے سیکریٹری کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

گودام چورنگی کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے ایک چھپر ہوٹل کے مالک سے ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا پتا معلوم کرنا چاہا تو اس نے ہوٹل میں کھانا کھاتے ایک بابو ٹائپ بندے کو تکلیف دی۔ وہ بھی کوئی نیک انسان تھا۔ کھانا چھوڑ کر اس نے مقصودی صاحب کو آگاہ کیا کہ اس چورنگی سے بائیں طرف مڑنے والی سڑک پر چل کر وہ دوبارہ بائیں طرف مڑیں گے تو اسی اطراف میں انہیں ان کا مطلوبہ پتا مل جائے گا۔

مقصودی صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان سے گزرتی سڑک پر روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہیں زیادہ نہیں پھرنا پڑا۔ مرکزی سڑک کے متوازی سڑک پر دو تین ذیلی سڑکوں کے بعد انہیں ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کا بڑا سا بورڈ نظر آ گیا جس پر تیر بنا کر منزلِ مقصود کی نشاندہی کی گئی تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ ذرا اندر کی طرف واقع ہاف

WWW.PAKSOCIETY.COM

مون گروپ آف انڈسٹریز کا صدر دفتر خاصی شان دار عمارت میں واقع تھا۔ وہ سہ منزلہ عمارت تھی جس کے عقب میں کوئی فیکٹری وغیرہ ہوگی کیونکہ انہیں وہاں بہت بڑے بڑے شیڈز اور ایک بلند چمنی بھی نظر آرہی تھی۔ فیکٹری غالباً بند تھی اس لیے چمنی سے دھوئیں کا اخراج رکا ہوا تھا۔

انہوں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ عمارت کے سامنے رخ پر ایک فیکٹری کی عقبی دیوار واقع تھی۔ دیوار غیر معمولی بلند تھی اور انہیں اس پر بجلی کے تار بندھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فیکٹری نہ ہوئی کوئی جیل ہوگئی، انہوں نے سوچا اور واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ان کے لیے آج کا کام ختم ہوگیا تھا۔

انہیں خوشی تھی کہ وقت سے پہلے مطلوبہ مقام کو دیکھ لینے کا خیال درست تھا وگرنہ وہ دعوت کے مطابق یہاں آتے تو شاید وقت پر نہ پہنچ پاتے اور بھٹکتے ہی رہ جاتے۔

اظفر عالم کے اس دعوتی رقعے کی وصولیابی کے بعد سے ان کا اشتیاق مسلسل بڑھتا ہی جارہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں جس قدر جاننے کے لیے بے چین تھے، اسی قدر اس کی ذات پردوں میں لپٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اور اب اظفر عالم کے سیکریٹری کو فون کرنے سے انہیں اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بھی کچھ کم پراسرار شخصیت نہیں تھا۔ ٹیلی فون آنسرنگ مشین کا ایسا استعمال انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

واپسی کے سفر میں انہیں پھر کامران کا خیال آیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر پہنچ کر اسے ضرور ٹیلی فون کریں گے۔ وہ اس سے اپنے تجربات و مشاہدات کو شیئر کرنا چاہتے تھے۔

دوپہر کے قیلولے کے بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے کامران کو فون کیا۔ وہ کورٹ سے دھکے کھا کر اسی وقت اپنے چیمبر میں پہنچا تھا۔ مقصودی صاحب کی آواز سنتے ہی وہ گویا کھل گیا۔ وہ لمبی گفتگو پر آمادہ تھا مگر مقصودی صاحب نے رات کے کھانے کی دعوت دے کر فون بند کردیا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے معمول کے کام نمٹائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اظفر عالم کے سیکریٹری کی طرف سے موصول ہونے والے دعوت نامے سے لے کر اس کا پتا تلاش کرنے کی صعوبت تک کے تمام واقعات بھی قلم بند کردیے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ ایک نئی کہانی کی بنیاد رکھی جارہی ہے جسے بعد میں وہ کوئی بھی موڑ دے سکیں گے۔

رات کو آٹھ بجے کامران کا فون آگیا۔

''او بھائی! کھانا کہاں کھلا رہے ہو؟'' مقصودی صاحب کی ہیلو کے جواب میں اس نے کہا۔ ''مجھے تو ابھی سے بھوک لگنی شروع ہوگئی ہے اور تمہارے جواب دیتے دیتے تو یہ بھوک شدید ہوجائے گی۔''

''گھر آجاؤ۔ بیٹھیں کچھ کر لیتے ہیں۔'' مقصودی صاحب نے اسے چھیڑتے کی غرض سے کہا۔

''آہ! میں مرگیا۔'' کامران کی بلبلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''اور میرا خون ناحق میرے دوست اور عظیم رائٹر مقصودی کی گردن پر ہے جس نے ایک وقت بھوکا رکھ کر مجھے مار ڈالا... اوہ... ہائے... ارے اسٹینو، ادھر آؤ، میرا وصیت نامہ لکھ لو...'' کامران کی صدا کاری شروع ہوگئی تھی۔

''تو تم مر رہے ہو؟'' مقصودی صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کرو کہ مُردے ڈھوتے والوں کو بتا دو کہ وہ تمہارا جنازہ شیرٹن پہنچا دیں، میں وہیں تمہاری فاتحہ کا بندوبست کررہا ہوں۔''

''قبلہ عظیم رائٹر صاحب! آپ مُردے کی فاتحہ تو شیرٹن میں کررہے ہیں اور مجھ زندہ کو کھانے پر گھر بلا رہے تھے؟ بہرحال میں شیرٹن کے لیے روانہ ہورہا ہوں، تم وہیں آجاؤ۔''

''میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ تمہیں بھی اتنا ہی وقت لگے گا۔'' مقصودی صاحب نے اسے جواب دیا اور ٹیلی فون بند کرکے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں پہلے سے اندازہ تھا کہ کامران رات کے کھانے کے لیے شیرٹن سے کم پر راضی نہیں ہوگا اس لیے وہ پہلے سے تیار تھے۔ اگر اس کا فون نہ آتا تو وہ خود فون کرکے اسے وہاں بلانے والے تھے۔

شیرٹن کے چائنیز ریسٹورنٹ میں ڈنر کرکے کامران نے پیٹ پر طمانیت بھرے انداز میں ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''ہاں تو پیارے! اب بتاؤ کہ اس وقت یہ نظرِ عنایت کس غرض سے کی گئی ہے؟''

''پہلے کافی کا ایک ایک کپ ہوجائے پھر بات کریں گے۔'' مقصودی صاحب نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔

''تو چلو لابی میں چلتے ہیں، وہاں کی رونق بھی دیکھتے ہیں اور باتیں بھی
بات معقو

کھڑے ہوئے۔

''ہاں، بس اب شروع ہوجاؤ کہ تمہارا ہیرو کہاں پھنس گیا ہے اور اب تمہیں میری کیا مدد درکار ہے؟'' کافی کا آرڈر دینے کے بعد اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہیرو تو کہیں نہیں پھنسا، البتہ میں خود ایک الجھن میں مبتلا ہوں۔'' مقصودی صاحب نے اسے جواب دیا۔

''بھائی! میرا مطلب بھی یہی ہے کیونکہ میرے لیے تو تم ہیرو ہو۔ اصلی تے وڈے ہیرو!''

جواب میں مقصودی صاحب نے اظفر عالم کا دعوت نامہ ملنے... اور پھر اس کے بعد کے تمام واقعات کی تفصیل کامران کو سنا دی۔

''تو اس میں الجھن کی کیا بات ہے؟'' ساری کہانی سن لینے کے بعد اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ تو سامنے کی بات ہے۔ وہ اظفر عالم کسی نہ کسی سے تو ملتا ہوگا اور ہر ایک کے لیے اس نے کچھ نہ کچھ طریقے وضع کررکھے ہوں گے۔ تم سے ملنے کے لیے بھی اس نے یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری طرح دیگر کئی افراد بھی اس کی خواہش پر اس سے ملاقات کرچکے ہوں گے مگر انہوں نے اس کا تذکرہ کہیں نہیں کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم سے ملاقات کے بعد وہ تم سے بھی یہی درخواست کرے گا کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم بھی اس کی اس خواہش کا احترام کرو گے۔''

''تم شاید... بلکہ یقیناً میری بات نہیں سمجھ سکے ہو۔'' مقصودی صاحب نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا۔ ''میری الجھن یہ ہے کہ آج بیسویں صدی میں جبکہ انسان دوسرے سیاروں کی خبریں لا رہا ہے، ایک شخص کو آخر اتنا پردے میں رہنے کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کوئی معمولی شخصیت بھی نہیں ہے۔ فرخ نے بتایا ہے کہ اس کا کاروبار کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے مگر کوئی اسے صحیح طور پر نہیں جانتا...''

''بے وقوفی کی باتیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔'' کامران نے مقصودی صاحب کا جملہ اچک لیا۔ ''تم یہ قطعاً نہیں کہہ سکتے کہ اظفر عالم کو کوئی نہیں جانتا... میرا تو خیال ہے کہ وہ خود کو اس طرح زیادہ مشہور کرانے میں کامیاب رہا ہے... اگر وہ اس طرح کا رویہ اختیار نہ کرتا تو تم سوچو کہ کیا تم اس طرح اس کے بارے میں تجسس کا شکار ہوتے؟ قطعاً
وں میں ان
رو یکھو کہ وہ

کتنا کامیاب ہے۔''

مقصودی صاحب ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئے پھر سر اٹھا کر بولے۔ ''تمہاری بات میں وزن ہے۔ اب میں اس معاملے کو تمہاری رائے کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں تو مجھے محسوس ہورہا ہے کہ اپنی اس رازداری کی وجہ سے وہ زیادہ مقبول اور مشہور ہے جتنا کہ شاید وہ عام حالات میں نہ ہوتا لیکن پھر بھی میں بہرحال یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ چیز کیا ہے؟ کاروبار کے علاوہ اس کے اور مشاغل کیا ہیں؟ اس کی گھریلو زندگی، ازدواجی معاملات وغیرہ وغیرہ...''

''یار مقصودی! تم ادیب ہو، ڈراما نگار ہو اور بہت کچھ ہو مگر اخباری رپورٹر ہرگز نہیں ہو۔ اس لیے ان چکروں میں کیوں پڑتے ہو؟ اس نے تمہیں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔'' کامران نے اکتانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہاری مرضی ہے کہ تم اس سے ملنے جاتے ہو یا نہیں... میرا خیال ہے کہ یہ کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تمہیں اپنے سوالوں کے جواب حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع مل رہا ہے، اس سے فائدہ اٹھالو اور بعد میں مجھے بھی اس کی تفصیل بتا دینا۔''

''چلو ٹھیک ہے، اس موضوع پر لعنت بھیجو۔'' مقصودی صاحب نے کامران کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''جو ہونا ہوگا وہ بلد بنا چل جائے گا۔''

''اب کی نا تم نے عقل مندی کی بات۔'' کامران نے کہا تو مقصودی صاحب چونک اٹھے۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں اس سے پہلے بے وقوفی کی باتیں کررہا تھا؟'' انہوں نے تنک کر پوچھا۔

''نہیں... نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' کامران نے فوراً ہی مصالحانہ انداز میں جواب دیا۔

''تو پھر تمہارا کیا مطلب تھا؟'' مقصودی صاحب نے غرانے کی صدا کاری کی۔

''میرا مطلب یہ تھا کہ اتنی حسین رات ہے... ہر طرف رنگینیاں بکھری نظر آرہی ہیں اور تم ایسی خشک اور بے ہودہ باتیں لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔'' کامران نے جواب دیا۔ ''اپنے آس پاس دیکھو اور ماحول سے لطف اندوز ہو۔''

''یہ سب ثانوی باتیں ہیں۔'' مقصودی صاحب نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''بہرحال اور کچھ ہو یا نہ ہو، مجھے تو اس دعوت نامے سے ہی ایک خوب صورت اور اچھی کہانی کا پلاٹ مل گیا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے مقصودی صاحب کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں، بالکل۔'' مقصودی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور شکر ادا کیا کہ انہوں نے وہ دعوتی رقعہ گھر سے نکلتے وقت اٹھا کر رکھ لیا تھا ورنہ شاید انہیں مایوس لوٹنا پڑتا۔

گارڈ نے وہ خط لیا۔ اس کی تہیں کھول کر اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔

''آیئے صاحب!'' اس نے یکا یک مؤدبانہ انداز اختیار کرلیا۔

مقصودی صاحب نے دیکھا کہ سامنے ہی ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے دفاتر بنے ہوئے تھے جہاں تک جانے کے لیے ٹائلز سے مزین راستہ بنا ہوا تھا اور اس کے اطراف ایستادہ ستونوں پر نیم خزدلی چھت بھی ڈالی ہوئی تھی۔ ایک طرف وسیع کار پارکنگ تھی اور دوسری طرف تارکول کی پختہ سڑک نظر آرہی تھی جو گھوم کر انتظامی بلاک کے عقب میں غائب ہورہی تھی۔ اس طرف یقیناً فیکٹری تھی۔

مقصودی صاحب گارڈ کے ساتھ انتظامی بلاک کی طرف چلنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ مقصودی صاحب کے آنے کے بعد گارڈ نے ذیلی دروازہ بند کردیا تھا اور اب اسے صرف اندر سے ہی کھولا جاسکتا تھا۔

وہ دونوں عمارت کے اندر داخل ہوئے جہاں ہر طرف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ تمام کمرے بند تھے اور بند دروازوں کے پیچھے اندھیر امحسوس ہورہا تھا۔

''کیا آج دفتر میں چھٹی ہے؟'' مقصودی صاحب اپنے تجسس سے مجبور ہوکر پوچھ بیٹھے۔

''چھٹی؟'' گارڈ نے الجھتے ہوئے دہرایا۔ شاید وہ بھی اظفر عالم کی طرح سنکی تھا جو ہر بات کو دہرانے کے بعد ہی سمجھتا تھا۔ ''نہیں جناب! آج تو چھٹی نہیں تھی۔''

''تو پھر یہ سب دفتر بند کیوں ہیں؟''

''بند کیوں ہیں؟'' اس نے اپنی عادت کے مطابق الجھتے ہوئے دہرایا پھر گویا ان کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ دفاتر کے ٹائم صبح سات بجے سے دوپہر دو بجے تک ہیں اس لیے ڈھائی بجے تک یہاں سناٹا ہو جاتا ہے۔''

مقصودی صاحب کو اس جواب سے حیرت ہوئی تھی۔ ''بھلا کراچی جیسے شہر میں صبح سات بجے کسی دفتر میں کام کا آغاز ہوا کرتا ہے؟ یہ اظفر عالم واقعی کوئی کھسکی ہوئی شے ہے۔'' مقصودی صاحب نے خود سے کہا اور گارڈ کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گئے جو انہیں لے کر اوپر کی طرف روانہ ہوگئی۔ لفٹ پینل پر پانچ بٹن تھے' سب سے نچلے پر انگریزی حرف 'بی' اور سب سے اوپر والے بٹن پر 'آر' کندہ تھا جبکہ بقیہ تین پر ایک، دو اور تین کے ہندسے لکھے نظر آرہے تھے۔

گارڈ نے تین نمبر کا بٹن دبایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تیسری منزل کی طرف جارہے تھے۔ 'بی' سے مراد بیسمنٹ اور 'آر' کا مطلب روف رہا ہوگا۔

ایک گنگناتی ہوئی ''ٹرنگ'' کے ساتھ دروازہ کھلا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ تیسری منزل پر پہنچ چکے تھے۔

گارڈ مقصودی صاحب کو لے کر دائیں طرف مڑا اور راہداری کے آخری سے پہلے ایک بند دروازے پر ٹھہر گیا۔ مقصودی صاحب نے دیکھا کہ اس پر سیکریٹری ٹو چیف ایگزیکٹو کی تختی آویزاں تھی۔ تاہم اس پر کوئی نام لکھا ہوا نہیں تھا۔

گارڈ نے انگلی سے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور پھر مقصودی صاحب کے لیے دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

مقصودی صاحب نے دروازے کے اندر قدم رکھا تو اس نے اندر موجود کسی شخص کو مخاطب کر کے قدرے بلند آواز مگر انتہائی مؤدب انداز میں کہا۔ ''آپ نے جنہیں بلایا تھا، وہ مہمان آگئے ہیں۔''

یہ کہتے ہی گارڈ نے مقصودی صاحب کے عقب میں دروازہ بند کردیا۔ اب مقصودی صاحب تھے اور اندر کا کمرا تھا۔ وہ کوئی کانفرنس روم معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کے تقریباً وسط میں مہاگنی سے بنی قیمتی اور غیر معمولی طویل و عریض میز رکھی ہوئی تھی۔ وہ کوئی عام میز نہیں تھی کہ جس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے والے مہمانوں کے گھٹنے میز سے ٹکراتے رہتے۔

کمرا بھی خاصا کشادہ تھا اور بیک وقت اندھیرے اور روشنی میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ جہاں مقصودی صاحب کھڑے تھے، وہ حصہ روشنی میں تھا جبکہ میز کا نصف اور اس کے بعد والا حصہ نیم تاریکی میں تھا۔ انہیں میز کے پیچھے بلند پشت والی کرسی پر ایک ہیولا بیٹھا نظر آرہا تھا جو یقیناً اظفر عالم کا سیکریٹری رہا ہوگا۔

''مقصود ا
کھر کھراتی ہوئی آ

کہ ان سے ان کے نام کی تصدیق کی جارہی تھی۔

''جی...!'' مقصودی صاحب نے جواب دیا۔ ''اور آپ یقیناً آصف صاحب ہیں... اظفر عالم صاحب کے سیکریٹری!''

جواب میں ایک بلغمی قہقہہ کمرے کی فضا میں بلند ہوا۔ مقصودی صاحب کو وہ قہقہہ آسیبی سا لگا۔ اس سے پہلے وہ اپنی کہانیوں میں ہیرو ہیروئنز کو ایسے قہقہے بارہا سنوا چکے تھے مگر اب خود اس قہقہے کو سن کر انہیں محسوس ہوا کہ آسیبی قہقہوں کو سننا ہی بڑے دل گردے کا کام ہے۔

''میں آصف نہیں اظفر عالم ہوں۔'' قہقہہ جس طرح بلند ہوا تھا اسی طرح اچانک تھم گیا اور کھر کھراتی ہوئی آواز میں میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ہیولے نے اپنا تعارف کرایا تو مقصودی صاحب کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''مگر باہر تو سیکریٹری کی تختی لگی ہوئی ہے۔'' انہوں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے کہا کیونکہ ابھی تک اظفر عالم یا جو بھی کمرے میں تھا، اس نے انہیں بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی تھی۔ انہیں اپنے کھڑے رہنے پر کچھ بے عزتی کا احساس بھی ہورہا تھا۔

''آیئے بیٹھیے۔'' شاید دوسری شخصیت نے ان کے خیالات پڑھ لیے تھے۔ ''باہر تختی کسی کے بھی نام کی ہو مگر یہ سارا دفتر بلکہ یہ ساری عمارت اور اس کے پیچھے بنا ہوا کارخانہ... یہ سب میرا ہے۔ میں جہاں چاہوں وہاں بیٹھ سکتا ہوں۔'' مقصودی صاحب کے نشست سنبھالنے پر اظفر عالم نے ان کی الجھن کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ اب اس کی آواز کا کھر کھراپن کم ہوگیا تھا لیکن لہجہ اب بھی کچھ غیر فطری سا محسوس ہورہا تھا۔ مقصودی صاحب کو لگا تھا کہ وہ شاید اپنی اصل آواز کو چھپانے کی خاطر کسی مصنوعی طریقے کو استعمال کر کے بول رہا تھا۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا؟'' مقصودی صاحب نے ہیولے پر نظر جما کے دریافت کیا۔ اب غور سے دیکھنے پر انہیں کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ اظفر عالم اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ انہیں صاف طور پر دکھائی دیا کہ وہ درمیانی جسامت کا شخص تھا جس کی آنکھوں پر غیر معمولی موٹے شیشوں والی عینک لگی ہوئی تھی۔ ایسے چشموں کے پیچھے سے انسان کی آنکھ کئی گنا بڑی نظر آتی ہے۔ نیم تاریکی کے باعث انہیں آنکھیں نظر نہیں آسکی تھیں۔ مقصودی صاحب کو کمرے کا
ان کا تجسس

بھی ابھر آیا تھا۔

وہ اس ہستی کے روبرو موجود تھے جس کے بارے میں کوئی صحیح طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے اپنی عینک اتاری، انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ یہ کام بے خیالی میں کررہے ہوں، اس کے بعد انہوں نے میز پر رکھے ٹشو پیپر کے ڈبے میں سے ایک ٹشو نکالا اور عینک کے شیشے صاف کرنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے اس بظاہر لاشعوری عمل کو میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے اظفر عالم نے گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

عینک کے شیشوں کو صاف کر کے مقصودی صاحب نے اسے دوبارہ اپنی آنکھوں پر لگا لیا۔ انہیں اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا اس لیے انہوں نے جواب طلب نظروں سے اندھیرے میں دیکھا۔

''ہاں۔'' اظفر عالم نے ان کے سوال کو بھانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ وقت اگرچہ ان رسمی باتوں کا نہیں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کا پرانا فین ہوں اور آپ کے بارے میں خاصی معلومات جمع کرتا رہتا ہوں...''

''آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟'' مقصودی صاحب نے اس رسمی گفتگو سے الجھن محسوس کرتے ہوئے براہِ راست سوال کیا۔ مقصودی صاحب ان لوگوں میں سے نہیں جنہیں ان کے منہ پر کی گئی تعریف خوشی فراہم کرتی ہو۔

مقصودی صاحب نے دیکھا کہ ان کے براہِ راست سوال پر اظفر عالم نے پہلو بدلا تھا اور اس دوران ایک لمحہ یا اس سے بھی کچھ کم عرصے کے لیے اس کا چہرہ ہلکی سی روشنی کی زد میں آیا تھا۔ انہوں نے اس قلیل وقت میں یہ دیکھ لیا کہ جسم کے مقابلے میں وہ چہرہ بھرپور اور توانا تھا اور سب سے نمایاں چیز اس کی ناک تھی۔ طوطے کی چونچ کی طرح خم کھائی ہوئی ناک۔ انہیں بخوبی اندازہ ہوگیا کہ اظفر عالم لیڈی کلر ٹائپ مرد ہوگا۔

''میں اپنے پسندیدہ رائٹر سے ملنا چاہتا تھا۔'' اظفر عالم نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے بھی بڑی ایک اور وجہ ہے...'' وہ شاید سسپنس پھیلانا چاہتا تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔

مقصودی صاحب بھی خاموش بیٹھے رہے۔ انہیں اس کا ٹائپ سمجھ میں آگیا تھا۔ اس لیے وہ منتظر تھے کہ وہ خود ہی اپنا مدعا بیان کرے تو بہتر رہے گا۔

چند لمحے اسی طرح گزرے پھر شاید اظفر عالم نے مقصودی صاحب کی خاموشی سے اکتا کر خود ہی بولنا شروع

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑتی ہے جہاں ٹھیک تین بج کر بیالیس منٹ ہوئے ہوتے ہیں۔ گھڑی کو دیکھتے ہی میرے ذہن کو ایک انجانا سا جھٹکا لگتا ہے اور میں بے اختیار ہو کر اپنی دراز سے ایک ریوالور نکال لیتا ہوں۔ میری نگاہ گھڑی کی چھوٹی سوئی پر ہوتی ہے جو مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھے ہوتی ہے۔ میں اٹھتا ہوں اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا ہوں پھر میرا داہنا ہاتھ ریوالور کو تھامے ہوئے میری کنپٹی پر آتا ہے۔ میں اس کی نال اپنی کنپٹی پر ٹکاتا ہوں۔ اسی وقت سیکنڈ کی سوئی بارہ کے ہندسے کو چھوتی ہے اور میں ریوالور کا ٹریگر دبا دیتا ہوں۔ ایک زوردار دھماکا ہوتا ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس وقت میرا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور سانس کی رفتار بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ابتدائی دنوں میں یہ خواب ایک رات میں صرف ایک مرتبہ دکھائی دیتا تھا مگر پھر اس کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اب گزشتہ کئی راتوں سے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پایا ہوں کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے اپنے دفتر کا منظر دکھائی دینے لگتا ہے۔''

وہ اچانک اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اسے وہ خواب کھلی آنکھوں سے نظر آنے لگا ہو۔

''...آپ میری کیفیت سمجھ سکتے ہیں نا؟ بے خوابی اور اس خواب کے خوف نے میرے ذہن پر بُرے اثرات مرتب کیے ہیں اور میں ایک عجیب سے عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیسی مدد؟'' مقصودی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ اس کا مسئلہ سن کر انہیں ایسا لگا تھا جیسے اظفر عالم کے بجائے وہ بھی کوئی خواب دیکھ رہے ہوں اور اظفر عالم کے ہاتھ میں دبے ریوالور کا نشانہ اس کی اپنی کھوپڑی نہیں بلکہ مقصودی صاحب کی پیشانی رہی ہو۔

''آپ مجھے یہ بتائیں کہ آخر مجھے یہ خواب کیوں نظر آ رہا ہے؟'' اظفر عالم نے اس طرح پوچھا گویا اسے خواب دکھانے والے مقصودی صاحب رہے ہوں۔ ''آپ اپنے تخیل کے زور سے ایسی کوئی وجہ ضرور ڈھونڈ سکتے ہیں جو میرے ان خوابوں کا سبب بنی ہوئی ہے۔''

''دیکھیے اظفر عالم صاحب!'' مقصودی صاحب نے بغیر الجھے، سیدھے سادے انداز میں جواب دیا۔ ''یہ خواب آپ کو کیوں نظر آ رہا ہے، اس بارے میں میرا تو کیا کسی کا بھی تخیل کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں، اس حوالے سے نفسیات دانوں نے جو تحقیق کی ہے، اس کی روشنی میں...''

''ان جھوٹے اور مکار نفسیات دانوں کا نام میرے سامنے نہ لیجیے۔'' یکا یک اظفر عالم کا لہجہ پھر سے آسیبی ہو گیا۔ ''یہ سب بیکار اور فضول باتوں کے ذریعے لوگوں کو محض بے وقوف بناتے رہے ہیں۔ میں تو نفسیات اور نفسیات دانوں پر کوئی یقین نہیں رکھتا، آپ اس کے علاوہ کوئی دوسری بات کریں۔''

''خوابوں کے اسرار و رموز پر بے شمار کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں جن میں دنیا بھر کے تحقیقی مواد کو جمع کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا مطالعہ آپ کے لیے مفید رہے گا۔'' مقصودی صاحب نے اس جھکی سے خوامخواہ کی بحث کرتے سے گریز کیا ورنہ وہ نفسیات اور نفسیات دانوں کے دفاع میں بہت اچھا بول سکتے تھے۔ ''اور میں تو آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ نپولین بونا پارٹ کی مشہور کتاب ''خوابوں کی دنیا'' ضرور پڑھیے۔ اس سے آپ کو اپنا مسئلہ سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔''

''آپ نے تو یہ کتابیں پڑھ رکھی ہوں گی؟'' اظفر عالم نے تیا نکہ لگایا۔ ''ان کی روشنی میں آپ بھی تو مجھے میرے مسئلے سے متعلق کوئی مشورہ دے سکتے ہیں... اور ہاں، آپ قطعی طور پر اطمینان رکھیے... مجھے آپ کے قیمتی وقت کا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی تخلیق کار کے نزدیک وقت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کا وقت آپ کا سرمایہ ہے اور جو بھی وقت آپ میری خاطر صرف کریں گے میں آپ کو اس کا اچھا ریٹرن دوں گا۔'' اظفر عالم جب بولنے پر آتا تھا تو بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ ''اب بتائیے آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

''میری اس بارے میں دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع ضرور بناتا ہوں مگر اپنی تمام زندگی میں کبھی میں نے اس طرح نہیں سوچا۔'' مقصودی صاحب نے واضح انداز میں اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے آپ اپنی الجھن کے سلسلے میں کسی اور سے رابطہ کر لیں تو بہتر ہو گا اور ویسے بھی اکثر اوقات خوابوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے...''

''مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے مگر میرا خواب کوئی بے معنی خواب نہیں ہے۔ یہ ایک تسلسل کے ساتھ باقاعدہ نظر آنے والا خواب ہے۔ اس کے کوئی تو معنی ہوں گے۔'' اظفر عالم اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''دیکھیے
انسانوں کے لا

دور سے لے کر آج تک مسلسل کام ہوتا رہا ہے۔ مجھے اس حوالے سے ایک قدیم مثل یاد آ رہی ہے کہ وہ خواب جس کی تشریح نہ کی گئی ہو، ایک ایسا خط ہے جسے ابھی دریافت نہ کیا گیا ہو۔ اب میں کوئی خواب خواں تو نہیں ہوں جو آپ کے خواب کی تعبیر و تشریح کر سکوں۔ مگر یہ بات ضرور کہوں گا کہ آپ اپنے خواب سے جتنا زیادہ پریشان ہوں گے، یہ آپ کو اتنا ہی زیادہ عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ اس لیے آپ اس خواب کو ذہن سے جھٹک دیجیے اور خود کو زندگی کی مصروفیات میں الجھا دیجیے... آپ شادی شدہ ہیں؟'' مقصودی صاحب نے خوابوں کے متعلق گفتگو کرتے کرتے اچانک ہی سوال کیا۔

اظفر عالم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سوال اس کے لیے شاید غیر متوقع تھا۔

مقصودی صاحب نے چند لمحے انتظار کیا پھر خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنا وقت بیوی بچوں کے ساتھ گزاریے اور اگر نہیں ہیں تو فوری طور پر شادی کر لیجیے۔ ازدواجی مسرتیں آپ کو بُرے خوابوں سے نجات دلا دیں گی۔''

''تو آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟'' مقصودی صاحب نے اپنی بات ختم کی تو اظفر عالم کی مایوسانہ آواز ابھری۔

''میں آپ کو اچھے اور قابل نفسیات دانوں کے نام تجویز کر سکتا ہوں۔'' مقصودی صاحب نے کہا مگر اظفر عالم درمیان میں بول اٹھا۔

''ان مشوروں کے لیے تو میں شہر کیا دنیا کے کسی بھی نامور نفسیات دان کو بلا سکتا ہوں جو شعور، تحت الشعور، لاشعور اور تحلیلِ نفسی جیسی ثقیل اصطلاحوں سے مزین گفتگو کر کے مجھ سے لاکھوں روپے کما لے گا مگر مجھے یقین ہے کہ میرا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔''

چند لمحے پھر خاموشی کے گزرے۔ اس کے بعد مقصودی صاحب نے اٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ مجھے اجازت دیں۔'' مقصودی صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔'' اظفر عالم کی آواز ابھری۔ ''میں کچھ سوچ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کو اس میں شریک کر لوں۔''

مقصودی [illegible] گزرے

بینکار

قمر لبے کو بینک میں نوکری ملی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ عمدہ کپڑا خرید کر شہر کے ایک مشہور ٹیلر کو بہترین سوٹ سینے کا آرڈر دیا۔ چند روز بعد ٹیلر نے کچے سوٹ کی ٹرائل کے لیے بلایا، قمر لبے تراش خراش سے بہت متاثر ہوئے لیکن ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو جیبیں ندارد۔

انہوں نے خفگی کا اظہار کیا تو ٹیلر نے رسانیت سے کہا۔

''سر! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ بینک افسر ہیں۔''

''ہاں... کہا تھا۔'' انہوں نے غصے سے اپنا سر ہلایا۔ ''اس سے مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''سر! آپ کو جیبوں کی کیا ضرورت ہے... بینکاروں کے ہاتھ تو ہمیشہ دوسروں کی جیب میں رہتے ہیں۔''

(کراچی سے بلال علیم کی سوغات)

ہوئے واقعے کا تسلسل ہو؟'' اظفر عالم کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''میں نے کسی سے کہے سنے بغیر ان موضوعات پر کئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی مشکل زبان اور اصطلاحات کی بھرمار نے مضمون کو اتنا گنجلک اور بھاری بنا دیا تھا کہ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ اسی لیے میرا یقین ان نفسیات دانوں پر سے اٹھ گیا ہے...''

''ماہرِ نفسیات انہی مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آسان الفاظ میں آپ کو مدد فراہم کریں گے۔'' مقصودی صاحب نے اس کی بات کاٹ کر اضافہ کیا۔ ''آپ کے ماضی کے حوالے کے تسلسل والی بات ناممکن نہیں ہو سکتی، سگمنڈ فرائیڈ نے اس ذیل میں بہت کچھ لکھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بچپن یا لڑکپن میں تین بج کر بیالیس منٹ پر کوئی خاص واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہو جس نے آپ کے ذہن میں کوئی ایسی گرہ ڈال دی ہو جو کھل ہی نہ پا رہی ہو اور اب وہی گرہ اس بے ہودہ خواب کا سبب بن رہی ہو۔'' مقصودی صاحب نے اس کی معقول بات کے جواب میں معقول استدلال پیش کیا۔ ''ایک بات اور بھی ہے۔ کچھ ماہرین کے نزدیک خواب انسان کی ایسی قوت کے تابع

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتے ہیں جو نیند میں بھی بیدار رہتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر خودکشی کی خواہش موجود ہے جو خواب میں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔''

''مگر میرے اندر ایسی کوئی خواہش کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟ میں ایک کامیاب شخص ہوں۔ میری زندگی میں کوئی محرومی نہیں ہے، میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں اس لیے یہ تھیوری تو فیل ہو گئی۔''

جس وقت اظفر عالم نے یہ کہا تو مقصودی صاحب کو نفسیات کی تازہ تحقیق کا وہ باب یاد آ گیا جس میں ماہر نے بتایا تھا کہ ترقی یافتہ ممالک میں خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ بہت جلد تمام دنیاوی خواہشات کا پورا ہونا بھی ہے۔ کوئی انسان جب تمام مادی خوشیاں حاصل کر لیتا ہے، تب اس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا اور وہ زندگی سے فرار چاہتا ہے۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکے کہ اگر وہ تھیوری فیل ہو گئی تو کیا یہ نئی تھیوری قابلِ عمل ہے؟

''میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں کوئی خواب خواں تو نہیں ہوں جو آپ کے اس خواب کی ماہرانہ انداز میں تعبیر و تشریح کر سکوں اس لیے اس تھیوری کے فیل ہو جانے پر مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ یہ تو میرا خیال تھا جو گزرے ہوئے کسی واقعے کے تسلسل والی آپ کی بات سے میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ ویسے ایک بات بتائیں کہ کیا واقعی آپ کے دفتر کی میز کی دراز میں کوئی آتشیں ہتھیار موجود ہے؟''

''بالکل ہے۔'' اظفر عالم نے جواب دیا۔

''تو آپ ایسا کریں، اسے فوری طور پر وہاں سے ہٹوا دیں یا ہٹا دیں۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔

''یہ تو ہو ہی جائے گا مگر اس خواب کی وجہ کا مسئلہ اپنی جگہ موجود رہے گا۔'' اظفر عالم نے کہا۔ ''ویسے یہ بتائیں... کیا یہ ممکن ہے کہ اس طرح خواب دکھا کر مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو... یا شاید قتل کرنے کی کوشش۔''

مقصودی صاحب چونک کر سیدھے ہو گئے۔

''یہ خیال آپ کو کس طرح آیا؟'' انہوں نے نیم تاریکی میں گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کہانیوں وغیرہ میں تو اسی طرح ہوتا ہے اور خصوصاً جرائم پر مبنی کہانیوں میں تو کسی کو قتل کرنے کے لیے ایسے ایسے طریقے بیان کر دیے جاتے ہیں کہ بس...!''

''کہانی تو صرف کہانی ہوتی ہے اور اس میں مصنف کا تخیل اس کی راہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔ ویسے آج تک میں نے ایسی کوئی کہانی نہیں لکھی جس میں کسی کو قتل کرنے کے لیے اسے بُرے خواب دکھائے گئے ہوں۔''

''تو اب لکھ لیجیے گا۔'' اظفر عالم نے گویا انہیں ایک نئی کہانی کا خیال دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے اس کے دشمن ہلاک کرنا چاہتے ہیں مگر کسی کو جان سے مار دینے کے بعد ملنے والی سزا سے بھی خائف ہیں۔ اس لیے وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے ان کے شکار کو مسلسل ایک ہی خواب نظر آتا رہے۔ ایسا شاید ہپناٹزم کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی جیسا بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے اس شخص کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور تنگ آ کر وہ خودکشی کر لیتا ہے... کیسی ہے کہانی؟''

''کہانی تو شاید بنائی جا سکے مگر آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ آپ کے دشمن آپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے اس قدر پیچیدہ راہ اختیار کریں گے؟'' مقصودی صاحب نے اس کی بات میں دبا گیا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ ''وہ تو کسی کو بھی لاکھ دو لاکھ دیں گے اور کہیں سے کوئی نامعلوم گولی آ کر آپ کا خاتمہ کر دے گی۔ یہ بتائیں کہ کیا آپ ان دنوں ہپناٹزم کے کسی ماہر سے رابطے میں ہیں؟''

''بالکل نہیں... بالکل بھی نہیں۔ میں صرف منتخب لوگوں سے ملتا ہوں اور بس۔'' اظفر عالم نے فوراً جواب دیا۔ ''ویسے کہانی کیسی ہے؟ ضروری نہیں ہے کہ کوئی ہپناٹزم جاننے والا ہی مجھے وہ بھیانک خواب دیکھنے پر مجبور کر رہا ہو۔ کچھ اور طریقہ بھی آپ اپنی کہانی میں اختیار کر سکتے ہیں۔''

''جب آپ کسی سے ملتے ہی نہیں تو آخر وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے جس کے استعمال سے آپ کے دماغ کو کنٹرول کیا جا سکے؟'' مقصودی صاحب نے پوچھا۔

''ٹیلی پیتھی۔'' اچانک اظفر عالم نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اس کے ذریعے تو دور بیٹھے بھی کسی کے دماغ کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے... کیا خیال ہے؟''

مقصودی صاحب کی طبیعت سخت مکدر ہو چلی تھی۔

''اس بارے میں میرا علم محدود ہے۔'' مقصودی صاحب نے رکھائی سے جواب دیا۔ مزید بحث سے بچنے کے لیے انہوں نے بہانہ کیا تھا۔

''میں نے تو [illegible] ذریعے بھی کسی [illegible]

ہے... یقیناً میرے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میرے دشمنوں نے کسی ٹیلی پیتھی کے ماہر سے رابطہ کر لیا ہوگا اور وہ اب میرے دماغ میں آ کر مجھے خودکشی پر مجبور کر رہا ہے۔''

''چلیں، اس طرح آپ کا مسئلہ حل ہو گیا۔'' مقصودی صاحب نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آپ کو نظر آنے والے بُرے خواب کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو گئی۔''

''ہاں لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ میرا وہ دشمن کون ہے جو مجھے مارنے پر تلا ہوا ہے؟'' اظفر عالم نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''میں اسے آپ کا وہم قرار دوں گا۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔ ''اور اگر واقعتاً ایسا ہے تو آپ میرے مشورے کے مطابق ریوالور اپنی دراز سے نکال دیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ ضرور رکھیں۔'' انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کو ان سے خودکشی کرانی ہی ہوتی تو وہ اب تک کرا چکا ہوتا۔ خوابوں کے لمبے چکر میں پڑ کر اپنا اور اظفر عالم کے دشمنوں کا وقت برباد نہ کرتا۔

''آپ اسے وہم قرار دے رہے ہیں، یہ آپ کی مرضی ہے مگر میں بہرحال سنجیدگی سے اپنے دشمنوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔'' اظفر عالم نے کہا۔

''اچھا، ایسا کریں کہ مجھے اپنے کمرے کو ایک نظر دیکھنے کا موقع فراہم کریں۔ ممکن ہے مجھے کوئی مفید بات معلوم ہو جائے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ویسے بھی اس کمرے میں کم ہی جاتا ہوں۔'' اظفر عالم نے کہا۔

''تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا بنیادی مسئلہ تو حل ہو گیا ہے اور اسی کے لیے آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' مقصودی صاحب نے کہا اور ایک مرتبہ پھر کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

انہیں توقع تھی کہ اظفر عالم ان سے الوداعی مصافحہ نہیں کرے گا۔ اس لیے انہوں نے بے پروائی کے اظہار کے لیے اپنے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیے اور واپسی کے لیے مڑے مگر دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گئے۔ ان کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں ایک کاغذ سے ٹکرائی تھیں۔ انہوں نے وہ کاغذ باہر نکال لیا۔

''اظفر عالم صاحب! میں نے آپ کو غلط کاغذ دے دیا تھا۔ آپ کے سیکریٹری کا خط میرے پاس ہی ہے۔'' یہ [illegible] دینے والا کاغذ اظفر عالم کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے لیا اور میز پر رکھا پہلے والا کاغذ اٹھا کر مقصودی صاحب کو واپس کر دیا۔

''مقصودی صاحب! آپ میرے سیکریٹری کی دعوت پر یہاں آئے اس کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں اور آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ اس ملاقات کا تذکرہ کسی سے نہیں کریں گے۔'' اظفر عالم نے کاغذوں کے تبادلے کے بعد اپنی مخصوص کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا تو مقصودی صاحب نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کے بعد دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور مقصودی صاحب... اظفر عالم، اس کے سیکریٹری اور اس ملاقات پر لعنت بھیجتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

باہر آ کر انہیں خوش گواری کا احساس ہوا۔ اندر کے اندھیرا اجالا ماحول نے ان کے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ انہوں نے باہر نکل کر گہرے سانس لیے اور ادھر اُدھر دیکھا۔ کوریڈور میں سناٹا تھا مگر اسی لمحے ایک طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور فوراً ہی وہی گارڈ ان کے سامنے آ گیا جو انہیں اس کمرے تک پہنچا کر گیا تھا۔

''آیئے جناب! میں آپ کو واپس چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے مقصودی صاحب کو دیکھ کر ادب سے کہا۔

مقصودی صاحب خاموشی سے اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آئے پھر سنسان راہداری سے گزر کر عمارت سے باہر آ گئے۔ بلند پھاٹک کے قریب پہنچ کر گارڈ ایک قدم آگے لپکا اور ان کے لیے ذیلی دروازہ کھول دیا۔

مقصودی صاحب نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور پھاٹک سے باہر نکل آئے۔

اظفر عالم سے ملاقات ان کی زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے کئی مداحوں سے مل چکے تھے مگر کوئی بھی اس قدر پیچیدہ... بلکہ بے ہودہ ثابت نہیں ہوا تھا۔

یہ اظفر عالم آخر چاہتا کیا تھا؟ واپسی کے لیے ڈرائیونگ کرتے ہوئے انہوں نے خود سے سوال کیا مگر کافی دیر سوچ بچار کے باوجود اس کا کوئی واضح جواب انہیں نہیں مل سکا تو انہوں نے سر جھٹک کر اس سارے قصے پر لعنت بھیجنے کی کوشش کی۔

'جہاں میں اور بے شمار فضول کاموں میں اپنا وقت برباد کرتا رہا ہوں تو کچھ وقت اس اظفر عالم کے لیے بھی سہی۔' انہوں نے خود کو تسلی دی مگر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اظفر عالم کا خیال کسی آسیب کی طرح ان کے ذہن پر سوار ہو چکا تھا۔ انہوں نے دوسرے دن کامران کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا جسے سن کر وہ بھی سخت حیران اور پھر پریشان ہوا۔ آخر میں اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار ظاہر ہو گئے۔

''جو کچھ بھی ہوا، اس پر لعنت بھیجو۔'' اس نے مقصودی صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہیں ایک اچھی کہانی کا آئیڈیا اس سے ضرور مل گیا ہے اور اتنے وقت میں اگر ایک اچھی کہانی مل سکتی ہے تو تمہارا وقت برباد نہیں ہوا بلکہ میرے حساب سے تو بہت سودمند ثابت ہوا ہے۔''

''ویسے یار! یہ اظفر عالم واقعی کوئی الجھی ہوئی شے ہے۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔ ''کم بخت نے مجھے اتنے اشتیاق اور احترام سے بلوایا مگر چائے تک کے لیے نہیں پوچھا۔ وہ خود کو ٹیلی پیتھی کا شکار سمجھ کر پریشان ہو رہا ہے۔''

''ٹیلی پیتھی!'' کامران کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ''اچھا لطیفہ ہے۔ ویسے اب میرا دل شدت سے چاہ رہا ہے کہ میں بھی اس اظفر عالم سے ملاقات کروں اور اسے بتاؤں کہ اینٹی ٹیلی پیتھی بھی ایجاد ہو گئی ہے اور میں اس کا ماہر ہوں۔ میں اپنے عمل سے اس کا دماغ مقفل کر دوں گا پھر اسے کوئی بُرا خواب نظر نہیں آئے گا۔''

موضوع ایسا تھا کہ اس پر لمبی گفتگو ہو سکتی تھی اس لیے وہ دونوں اس پر دیر تک باتیں کرتے رہے اور محظوظ ہوتے رہے۔

اس کے بعد دوسری مصروفیات کے باعث اظفر عالم ان کے دماغ سے اتر گیا تاہم جب بھی انہیں تنہائی ملتی، اس کا خیال لاشعوری طور پر انہیں اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن مقصودی صاحب کو انسپکٹر علی رضا کا فون آیا۔

''مقصودی صاحب! میں ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے ہیڈ آفس سے بول رہا ہوں۔''

''ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز!'' مقصودی صاحب کو ایک دھچکا لگا۔ ''تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ اس وقت تو وہاں کسی چڑیا کا بچہ نظر نہیں آتا۔''

''آپ کو ایک اطلاع دینی تھی۔'' انسپکٹر علی رضا نے کہا تو مقصودی صاحب کے دل کی دھڑکن خود بہ خود بڑھ گئی۔ ''کیسی اطلاع؟''

''آپ اظفر عالم کو تو جانتے ہی ہیں۔'' اس نے تمہید باندھی۔ ''مجھے چند دن پہلے ہی کامران نے اس ملاقات کے بارے میں بتایا تھا اور میں اس کی تفصیل جاننے کے لیے آپ سے رابطہ کرنے والا تھا مگر خیر... اب اطلاع یہ ہے کہ مسٹر اظفر عالم نے آج سہ پہر خودکشی کر لی۔''

''تین بج کر بیالیس منٹ پر۔'' مقصودی صاحب نے اس طرح کہا گویا انہیں اس کی پہلے سے توقع ہو۔

''تو کیا آپ کو یہ خبر مل چکی ہے؟'' انسپکٹر علی رضا نے ہلکی سی حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں کامران نے میری اور اظفر عالم کی ملاقات کی تفصیل نہیں بتائی تھی؟'' مقصودی صاحب نے اس کی حیرت پر حیرت کا اظہار کیا۔

''بالکل بھی نہیں... بس اتنا بتایا تھا کہ آپ نے اظفر عالم سے ملاقات کی تھی۔'' انسپکٹر علی رضا نے جواب دیا۔

''اچھا... تو پھر اب تم نے مجھے اظفر عالم کی خودکشی کی اطلاع دینی کیوں ضروری سمجھی؟''

''اس کی کچھ اور وجہ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہمیں اظفر عالم کے دفتر کی کاغذات میں ایک خط ملا ہے جس میں آپ کو ملاقات کی دعوت دی گئی تھی۔''

''میں اسی دعوت نامے کے مطابق اس سے ملنے گیا تھا۔'' مقصودی صاحب نے اسے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ''اس میں کون سی انوکھی بات ہے؟''

''آپ کہیں بہت زیادہ مصروف تو نہیں ہیں؟'' اچانک علی رضا نے نئی بات کی۔

''نہیں... مگر کیوں؟'' مقصودی صاحب نے پوچھا۔

''آپ بھی اسی طرف آ جاتے... میرا مطلب ہے کہ یہیں ہاف مون گروپ آف انڈسٹریز کے صدر دفتر میں... جہاں اظفر عالم نے خودکشی کی ہے۔''

''کیا یہ ضروری ہے؟'' مقصودی صاحب نے جان چھڑاتے کے انداز میں پوچھا۔

''آپ آ جائیں گے تو ذرا دل کو حوصلہ رہے گا۔ آپ کی مدد سے ہم کوئی کام کی بات معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے اسے یقین ہو کہ معاملات میں کوئی گڑبڑ ہونے والی تھی۔

''ٹھیک ہے... میں آ رہا ہوں۔ تم ایسا کرو، کامران کو بھی بلا لو۔'' مقصودی صاحب نے اس سے کہا۔

''میں آ... کہ کہہ کر ہم ہاں... آ... کامران کو کیوں زحمت دو۔

المناک واقعے کا اس پر زیادہ اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

اظفر عالم کا سیکریٹری چھریرے بدن کا حامل ایک خوش لباس نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور تیزی ٹپکتی تھی۔

ابھی تعارف کی رسم چل رہی تھی کہ کامران بھی وہاں آن پہنچا۔ اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس تھا اس لیے اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

انسپکٹر علی رضا نے مقصودی صاحب کا تعارف وہاں موجود افراد سے کرایا اور پھر ان سے اظفر عالم کے ساتھ ایک ہفتہ قبل ہونے والی ملاقات کی تفصیل معلوم کی۔ مقصودی صاحب نے تمام تفصیل وہاں موجود لوگوں کو سنا دی۔

''کمال ہے۔ میں نے آج تک ایسی عجیب و غریب کہانی نہیں سنی تھی۔'' انسپکٹر نے ساری تفصیل سننے کے بعد تبصرہ کیا۔ ''ایک خواب بھی اس طرح کسی کی جان لے سکتا ہے... حیرت انگیز بات ہے۔ کیوں مسز اظفر! کیا آپ کو بھی مرحوم نے یہ خواب سنایا تھا؟''

''ہاں۔'' زرینہ نے اداس اور غمگین لہجے میں نم آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔ ''انہوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس قسم کے خواب بدہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں اپنے فیملی فزیشن سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔'' اس نے وہاں موجود ڈاکٹر اجمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔'' ڈاکٹر اجمل نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ انہوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ماہر نفسیات سے رابطہ کیا ہو۔''

اس بارے میں آصف سے پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''نہیں، کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ انہوں نے کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کیا ہو۔ انہوں نے تو بس مقصودی صاحب کے لیے خط لکھوایا تھا اور میرا خیال تھا کہ شاید اس ملاقات کا مقصد کاروباری گفتگو ہو گی۔''

''ہوں... اچھا اب ذرا ان کی خودکشی کی تفصیلات تو بتایئے۔'' مقصودی صاحب نے آصف کا جواب سننے کے بعد کسی مخصوص فرد سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔

اس کے جواب میں سب خاموش بیٹھے رہے پھر انسپکٹر علی رضا نے بولنا شروع کر دیا۔

''اظفر عالم صاحب معمول کے مطابق اپنے دفتر میں موجود تھے۔ عموماً وہ ڈھائی بجے تک لنچ کرنے کے لیے

''ارے یار! تم پولیس والوں کا کیا اعتبار... کب کسی شریف آدمی کو کسی چکر میں پھنسا دو۔''

''اب ہمارے بارے میں اتنی بھی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔'' علی رضا نے شکوہ کرتے کے انداز میں کہا۔ ''بس آپ آ جائیں اور بے فکر ہو جائیں... میں کامران کو بھی بلا رہا ہوں۔''

''میں بس فوراً نکل رہا ہوں۔'' مقصودی صاحب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہیڈ آفس کا بلند پھاٹک بند تھا۔ مقصودی صاحب نے ہارن بجا کر اندر موجود گارڈ کو متوجہ کیا۔ اس نے ذیلی دروازہ کھولا اور مقصودی صاحب کو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر انہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور پھر چھوٹا دروازہ بند کر کے بڑا گیٹ کھول دیا۔

مقصودی صاحب کار سمیت اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے کار بائیں ہاتھ پر بنی کار پارکنگ میں کھڑی کی اور اندر داخل ہو گئے۔

ایک ہفتہ پہلے سنسان نظر آنے والی راہداری اس وقت کئی پولیس والوں سے بھری ہوئی تھی۔

''انسپکٹر صاحب کدھر ہیں؟'' مقصودی صاحب نے ایک سپاہی سے پوچھا تو اس نے مؤدب ہو کر مقصودی صاحب کی راہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا۔

لفٹ سے نکل کر وہ داہنی طرف مڑا اور راہداری کے آخری سے پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کئی افراد نظر آ رہے تھے جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔

جب تعارف شروع ہوا تو مقصودی صاحب کو بتایا گیا کہ ان میں سے ایک اظفر عالم کی بیوی اور دوسری بیٹی تھی۔ مقصودی صاحب کو انہیں دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔ اظفر عالم کی بیوی خاصی کم عمر تھی یا پھر اس نے خود کو اچھی طرح سنبھال کر رکھا تھا کہ ایک تقریباً جوان لڑکی کی ماں ہوتے ہوئے بھی زیادہ عمر کی نظر نہیں آتی تھی۔

بیٹی یقیناً اپنے باپ پر گئی تھی۔ دیگر نقوش کا تو کچھ پتا نہیں تھا البتہ اس کے چہرے پر موجود ناک میں باپ کی بھرپور شباہت موجود تھی۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں اظفر عالم کا سیکریٹری محمد آصف اور ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔

دونوں خواتین کا شمار نہایت خوب صورت خواتین میں کیا جا سکتا تھا۔ رنگت گلابی، لمبے سیاہ بال اور بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں۔ اظفر عالم کی بیوہ جس کا نام زرینہ معلوم ہوا، خودکشی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

چلے جاتے تھے مگر گزشتہ کئی دنوں سے ایک نہایت اہم کاروباری معاملے کے سلسلے میں ان کی مصروفیت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ شام کو دیر تک اپنے دفتر میں مصروف رہتے تھے۔ لوگوں کے مطابق آج کل ایک معروف بین الاقوامی کمپنی سے ان کی ایک فرم کے ادغام کا معاملہ چل رہا تھا اور اکثر و بیشتر غیر ملکی مہمان ان سے ملنے کے لیے یہاں آرہے تھے۔

''آج بھی دو غیر ملکی ان سے ملنے کے لیے یہاں موجود تھے۔ وہ قریباً پونے تین بجے یہاں پہنچے تھے مگر اس وقت اظفر عالم فون پر کوئی نہایت اہم گفتگو کر رہے تھے۔ تقریباً تین بجے وہ خود اپنے کمرے کے دروازے میں آئے اور انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے غیر ملکی مہمانوں سے کہا کہ انہیں تھوڑا سا انتظار مزید برداشت کرنا ہوگا۔ وہ چند اہم کاغذات کا مطالعہ کر رہے ہیں جو اس ملاقات میں زیر بحث آئیں گے۔ اس غیر ملکی کمپنی کے پاکستانی فرم سے ادغام میں غیر ملکیوں کا مفاد وابستہ تھا اس لیے وہ اظفر عالم صاحب کی ہر بات ماننے کو تیار تھے۔

''قریباً چار بجے آصف صاحب کا گزر انتظار گاہ میں ہوا تو وہاں ان مہمانوں کو بیٹھا دیکھ کر چونک پڑے۔ انہوں نے ان سے پوچھا کہ کیا ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔ انکار میں جواب ملنے پر وہ اظفر عالم کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس سے قبل وہ مہمانوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ اندر جاتے ہی انہیں بلواتے ہیں۔

''اندر جا کر پہلے تو آصف صاحب نے یہ سمجھا کہ شاید اظفر عالم وہاں موجود نہیں ہیں لیکن پھر میز کے عقب سے انہیں ان کا ہاتھ زمین پر نظر آیا۔ وہ تیزی سے اس طرف گئے اور انہیں اظفر عالم صاحب کھڑکی کے پاس گرے ہوئے ملے۔ ان کا ریوالور بھی وہیں تھا۔ آصف صاحب باہر آئے اور انہوں نے مہمانوں کو اس المناک واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے انہیں رخصت کر دیا اور پھر پولیس اسٹیشن فون کر کے مجھے اطلاع دی۔ اس کے ساتھ انہوں نے ڈاکٹر اجمل کو بھی فون کر دیا تھا۔''

''کیا کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی؟'' مقصودی صاحب نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے... نہیں۔'' انسپکٹر علی رضا نے سیکریٹری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس بارے میں آصف صاحب کا کہنا ہے کہ یہ عمارت مرکزی طور پر ایئر کنڈیشن ہے اور اظفر عالم صاحب کا کمرا تو خصوصی طور پر ساؤنڈ پروف بنایا گیا تھا۔ پھر یہ کہ ان دنوں برابر والی فیکٹری میں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا ہے جس کے باعث اکثر وہاں گرائنڈنگ مشین چلتی رہی ہے، اس کے شور میں تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔''

''مطلب یہ ہے کہ گولی کی آواز کسی نے نہیں سنی۔'' مقصودی صاحب نے بھی وضاحت سے اکتا کر کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال میں یہ واقعہ کب ہوا...؟ میرا مطلب ہے کہ اظفر عالم نے کب خودکشی کی؟''

''میں یہاں تقریباً ساڑھے چار بجے پہنچا تھا اور لاش کا معائنہ کرنے کے بعد میرا اندازہ تھا کہ انہیں مرے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔'' انسپکٹر علی رضا نے جواب دیا۔

''تو گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے خواب والے وقت پر ہی مرا تھا۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔ ''آپ کی کیا رائے ہے؟'' اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر اجمل سے پوچھا۔

''میری بھی یہی رائے ہے۔'' اس نے انسپکٹر علی رضا کی تائید کی۔

''مقصودی صاحب! میری رائے میں تو یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہے۔'' انسپکٹر علی رضا نے کہا تو مقصودی صاحب کی پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

''...مگر عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اسے خودکشی کا کیس ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے قتل کا کیس بھی کہا جا سکتا ہے۔ اظفر عالم صاحب نے آپ کو جو خط لکھ کر بلوایا تھا اور اس کے بعد آپ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ان کا دشمن ضرور تھا... بہرحال اب آپ نے خود ہی صورت حال اتنی واضح کر دی ہے کہ کچھ اور کہا ہی نہیں جا سکتا، لہٰذا خودکشی ہی...''

''میرا خیال ہے کہ تم کچھ جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔'' مقصودی صاحب نے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور پھر زرینہ اظفر عالم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ کے شوہر کو پراسرار علوم سے کوئی دلچسپی تھی؟ میرا مطلب ہے کہ ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی، ذہنی مشقیں وغیرہ؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' اس نے بلاتوقف جواب دیا۔ ''میرے سامنے کبھی انہوں نے ان علوم کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کی... آہ!'' اچانک ہی جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بری طرح سسکنے لگی۔ ''یہ منحوس خواب... کس قدر عجیب بات ہے کہ وہ ایک ہی خواب روزانہ دیکھتے رہے

کسی خواب کی

''کیا آپ ان کے مزاج کا اندازہ لگا کر یہ بتا سکتی ہیں کہ ان میں خودکشی کا رجحان موجود تھا؟''

''نہیں... ایسا احساس تو مجھے کبھی نہیں ہوا، البتہ بعض اوقات ان کی طبیعت میں بڑی جھنجلاہٹ اور بیزاری پیدا ہو جاتی تھی۔''

''وہ تو اپنی جان لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔'' یہ اظفر عالم کی بیٹی تھی جس نے پہلی مرتبہ اپنی زبان کھولی تھی۔ ''ڈیڈی تو اپنے بارے میں بے حد محتاط تھے اور انہیں اپنی زندگی سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔''

''لیکن مس ارجمند! عموماً وہی لوگ خودکشی کرتے ہیں جو بظاہر کبھی اس کے متعلق سوچتے بھی نہیں ہیں۔'' مقصودی صاحب نے اسے مخاطب کر کے کہا اور پھر وہ انسپکٹر علی رضا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''تم مجھے وہ کمرا دکھا سکتے ہو جہاں اظفر عالم کی موت ہوئی تھی؟''

''بالکل... آیئے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔'' علی رضا نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اظفر عالم کا کمرا برابر والا تھا اور راہداری کے سرے پر واقع تھا۔ یہ اس کے سیکریٹری کے کمرے سے بھی بڑا اور نہایت نفیس انداز میں بنا ہوا تھا۔ مقصودی صاحب اندر داخل ہوتے ہی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھے جہاں اظفر عالم کے خون کا دھبا اب بھی قالین پر نظر آرہا تھا۔ مقصودی صاحب کے ذہن میں اظفر عالم کے جملے گونجے۔ ''اور پھر تین بج کر بیالیس منٹ پر میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہوں اور کنپٹی پر ریوالور رکھ کر گولی چلا دیتا ہوں۔''

''کیا یہ کھڑکی اسی طرح کھلی رہتی ہے؟'' مقصودی صاحب نے پوچھا۔

''ہاں... اور یہ بھی اظفر عالم کا نکتہ پن تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ دفتر ہونے کے باوجود وہ یہ کھڑکی کھلی رکھتا تھا۔'' انسپکٹر علی رضا نے جواب دیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ادھر سے تو کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

مقصودی صاحب نے سر باہر نکال کر جھانکا۔ واقعی باہر کی طرف سپاٹ دیوار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ادھر سے انسان تو کیا پھر تیلی بلی بھی کمرے میں نہیں آسکتی تھی۔ انہوں نے سوچا۔

سامنے ہی ایک فیکٹری کی بلند دیوار دکھائی دے رہی تھی اور اس میں بھی کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔

''مم... یہ خالی... دیوار اظفر

انہوں نے

زیر لب کہا۔

''یعنی اس کا کوئی نفسیاتی اثر اظفر عالم کے ذہن پر پڑا تھا؟'' انسپکٹر علی رضا نے پوچھا۔

مقصودی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت میز پر رکھی ایک چمٹی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسٹیل کی بنی ہوئی نہایت نفیس چمٹی تھی۔ انہوں نے اس چمٹی کو اٹھایا پھر اس کی مدد سے کرسی کے پیچھے پڑی ہوئی ماچس کی ایک تیلی کو اٹھا کر ٹوکری میں ڈال دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اظفر عالم کی موت کے وقت مسز اظفر اور مس ارجمند کہاں تھیں؟'' انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے اس بارے میں تو معلومات کی ہوں گی؟''

''وہ دونوں اپنے گھر میں تھیں جو یہاں سے زیادہ دور نہیں، بلکہ یہیں اس دفتر کے عقب میں واقع ہے۔'' علی رضا نے جواب دیا اور مقصودی صاحب کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔اے۔ای
WELCOME BOOK SHOP
ویلکم بک شاپ
پی او بکس: 27869 کراما، دبئی
فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae
معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز
WELCOME BOOK PORT
ویلکم بک پورٹ
ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
مین اردو بازار، کراچی
فون: (92-21) 32633151, 32639581 فیکس: (92-21) 32638086
ای میل: welbooks@hotmail.com
ویب سائٹ: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔
''میرا تو خیال تھا کہ اس کا گھر کانٹن یا ڈیفنس میں ہوگا۔''
''وہاں اس کے کئی بنگلے اور اپارٹمنٹ ہیں مگر وہ شاید اپنے سنکی پن کی وجہ سے وہاں نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے اپنی بیوی بچی سمیت یہیں رہ رہا تھا۔''
''ہوں۔'' مقصودی صاحب نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر انسپکٹر کو مخاطب کر کے بولے۔ ''تم ایسا کرو کہ ذرا اظفر عالم کی بیٹی کو یہاں بھیج دو۔ میں اس سے اس کمرے میں چند سوال کروں گا۔''
اس عجیب و غریب فرمائش پر علی رضا نے حیران نظروں سے اپنے فیورٹ رائٹر کو دیکھا پھر سر جھٹک کر باہر چلا گیا۔ اسے مقصودی صاحب کی تجزیاتی اور تخیلاتی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔
چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور حسین و جمیل ارجمند عالم اندر داخل ہوئی۔
''میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں... اور مجھے امید ہے کہ آپ اس پوچھ گچھ کا برا نہیں منائیں گی۔'' اسے دیکھ کر مقصودی صاحب نے شائستگی سے کہا۔
''اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟'' ارجمند نے رسما کہا کیونکہ اس کے لہجے کی رکھائی بتا رہی تھی کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔
''کیا آپ کے علم میں تھا کہ آپ کے ڈیڈی یہ ریوالور اپنی دراز میں رکھا کرتے تھے؟''
''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ''یہ بات مجھے ابھی بتائی گئی ہے۔''
''آپ ماں، بیٹی میں عمر کا فرق بہت کم ہے...'' مقصودی صاحب نے بولنا شروع کیا تھا کہ اس نے ان کی بات کاٹ دی۔
''یہ میری سوتیلی ماں ہے اور مجھ سے صرف آٹھ سال بڑی ہے۔''
''اوہ... واقعی یہ میرے لیے ایک حیرت ناک خبر ہے۔'' مقصودی صاحب نے تبصرہ کرتے کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''ذرا یہ بتائیں کہ اظفر عالم سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟''
''تعلقات؟'' اس نے بھویں اچکا کر انہیں دیکھا۔
''میرا مطلب ہے کہ دوسری بیوی کی موجودگی میں پہلی بیوی کی اولاد کی طرف عموماً باپ کی توجہ کم ہو جاتی ہے۔'' مقصودی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
''اس حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے تعلقات سرد مہری کا شکار تھے۔ بات یہ ہے کہ میں بھی انہیں زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی۔ وہ اسی قسم کے سنکی باپ تھے جن کے ساتھ گزارہ کرنا ویسے بھی خاصا مشکل ہوتا ہے۔''
''حیرت ہے، آپ اپنے باپ کے بارے میں یہ سب کہہ رہی ہیں۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔
''میں آپ کا وقت بچا رہی ہوں۔'' اس نے پُرسکون انداز میں گردن کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے شک مجھے بُرا بھلا کہتے رہیں لیکن یہ سچ ہے... اور میں تو کیا، میری سوتیلی ماں بھی صرف اس لیے مجبور تھی کہ اس کا بھی کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔''
''کسی بھی باپ کا سنکی پن اس قدر نفرت کا باعث تو نہیں ہو سکتا۔'' مقصودی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس رویے کی اور بھی کوئی وجہ تھی؟''
''وہ اپنی من مانی کرنے کے عادی تھے اور کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی رائے سے اختلاف کرنے والا ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں میں بُرا بن جاتا تھا۔'' ارجمند نے جواب دیا۔
''آپ نے ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا تھا؟'' مقصودی صاحب نے اس کے سراپا پر نظر جمائی۔
''میں نے ایک متوسط درجے کے نوجوان سے شادی کرنا چاہی تھی مگر انہوں نے مجھے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دے کر اس نوجوان کو نوکری سے نکال باہر کیا تھا۔''
ہر نئی بات ایک انکشاف تھی۔ ارب پتی باپ، دوسری شادی، نافرمان بیٹی، مرضی کی شادی... مقصودی صاحب ان سب باتوں کا تجزیہ کر رہے تھے۔
''وہ آپ سے کیا چاہتے تھے؟''
''ان کی خواہش تھی کہ میں کسی ہم پلہ خاندان میں شادی کروں۔'' ارجمند نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔
''اور اس جائداد کی اکلوتی وارث ہونے کی وجہ سے میں ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی تھی۔''
''یعنی ان کی موت کے بعد ان کی تمام دولت و جائداد کا مالک آپ کو بننا ہے؟''
''آپ کا خیال درست ہے۔'' ارجمند نے جواب دیا۔ ''میری سوتیلی ماں کو ایک مقررہ رقم ملے گی اور باقی سب کچھ مجھے ملے گا۔ اس اعتبار سے ڈیڈی کی خودکشی میرے لیے کوئی زیادہ افسوس ناک واقعہ نہیں ہے۔ میں تو کافی عرصے سے

بھی وہ صرف اور صرف دولت کو ہی اپنا سب کچھ سمجھنے لگے تھے۔ انسانوں اور انسانی رشتوں ناتوں سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔''
''مجھے آپ کے سچ بولنے سے خوشی ہوئی ہے۔'' مقصودی صاحب نے کہا۔
''آپ کو کچھ اور تو نہیں پوچھنا؟'' اس نے گویا اس سے اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔
''بس ایک دو چھوٹے چھوٹے سوال۔'' مقصودی صاحب نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو یہ کہ کیا یہ چمٹی ہمیشہ ان کی میز پر رہتی تھی؟'' انہوں نے میز پر رکھی ہوئی چمٹی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
''جی ہاں۔'' ارجمند نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے ہمیشہ ڈیڈی کی میز پر دیکھا ہے۔ وہ میز کی اشیا اٹھانے کے لیے جھکنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے چمٹی کا استعمال کرتے تھے۔'' یہ جواب دے کر اس نے منتظر نگاہوں سے مقصودی صاحب کو دیکھا۔
''دوسرا سوال یہ کہ کیا ان کی نظر ٹھیک تھی؟''
''نظر؟'' اس نے دہرایا۔ ''یعنی آئی سائٹ...؟ وہ تو بہت کمزور تھی۔ موٹے شیشوں کی عینک کے بغیر تو وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔''
''لیکن چشمہ لگانے کے بعد؟'' مقصودی صاحب نے پوچھا۔
''اس کے بعد وہ معمول کے کام بہ آسانی انجام دیتے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔
''یعنی عینک لگانے کے بعد وہ سب کچھ پڑھ لکھ لیا کرتے تھے؟''
''جی... بالکل۔'' ارجمند نے جواب دیا۔ ''مگر نہ عینک لگانے کا کیا فائدہ تھا؟''
اس کی بات معقول تھی اس لیے مقصودی صاحب تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگے۔
''میں جاؤں؟'' ارجمند نے پوچھا تو مقصودی صاحب نے اثبات میں گردن ہلا کر وہاں سے روانگی کی اجازت دے دی۔
اس کے کمرے سے رخصت ہوتے ہی مقصودی صاحب اٹھے اور اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر خود سے گویا ہوئے۔ ''میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ بالکل سامنے کی بات ہے اور میں آنکھوں والا ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں

یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف گئے اور جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ انہیں فیکٹری کی دیوار اور دفتر کی عمارت کی درمیانی گلی نما جگہ میں کوئی سیاہ رنگ کی شے نظر آئی۔ انہوں نے مطمئن ہو کر گردن ہلائی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔
وہ باہر نکلے تو کوریڈور میں انسپکٹر علی رضا اور کامران نظر آئے۔ کامران کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی اور وہ گہرے کش لے رہا تھا۔
مقصودی صاحب کو دیکھتے ہی دونوں ان کی طرف لپکے۔
''کیا رہا میرے عظیم رائٹر؟'' کامران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''کہانی کہاں تک پہنچی؟''
''شروع میں تو کہانی چل نہیں رہی تھی مگر اب تیزی سے پھسلتی جا رہی ہے۔'' مقصودی صاحب نے جواب دیا۔ ''اور کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ قاری اس کے اختتام کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔''
''ہم تو تمہارے قاری نہیں ہیں اس لیے ہمیں تو تجسس میں مبتلا نہ کرو۔'' کامران نے احتجاجی لہجے میں کہا۔
''صبر... صرف دو منٹ کا صبر۔'' مقصودی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بے تابی کو بریک لگائے۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ آؤ، آصف کے کمرے میں چلتے ہیں۔''
''جی تو آصف صاحب...!'' کمرے میں پہنچ کر انہوں نے اظفر عالم کے سیکریٹری کو مخاطب کیا۔ ''آپ بھی مجھ سے ملنے کے مشتاق تھے مگر افسوس کہ ہماری ملاقات کسی موقع پر ہو رہی ہے۔''
وہ مغموم انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔
''آپ مجھے تفصیل سے وہ تمام واقعات بتائیں کہ کس طرح اظفر عالم صاحب نے مجھ سے رابطہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے آپ کو کیا حکم دیا تھا؟''
''یہ چھبیس دسمبر کی بات ہے۔ شام کے چار یا پانچ بجے انہوں نے مجھے اس خط کے بارے میں ہدایت کی تھی اور کہا تھا کہ میں خود یہ خط کوریئر والوں کو دوں تاکہ ستائیس دسمبر تک آپ کو مل سکے۔''
''دفتر کا ٹائم تو غالباً دو بجے تک کا ہے... تو کیا وہ دیر تک دفتر میں بیٹھے تھے؟''
''دفتر ہی ٹائم دیگر اسٹاف کے لیے ہے مگر میں اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے مستثنیٰ ہوں۔ وہ جب تک یہاں ہوتے ہیں، مجھے بھی موجود رہنا پڑتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا تو جب انہوں نے آپ کو خط کی تیاری کا حکم دیا تو کیا گارڈ کو بھی کچھ ہدایت کی تھی؟''

''جی ہاں... انہوں نے گارڈ کو بلایا تھا اور اسے بتایا تھا کہ اکتیس دسمبر کو ایک صاحب پانچ بجے آئیں گے۔ ان سے ان کا نام پوچھ لینا اور خط دیکھ کر اطمینان کر لینا کہ وہی صاحب ہیں جنہیں بلایا گیا ہے۔''

''یہ ہدایت انہوں نے چھبیس دسمبر کو ہی دے دی تھی؟''

''نہیں، یہ تیس دسمبر کی بات ہے۔ چھبیس دسمبر کو انہوں نے خط بھجوایا تھا۔''

''ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' مقصودی صاحب نے سر ہلایا اور پھر پوچھا۔ ''اچھا یہ بتائیں کہ یہ خط دیکھنے والی ہدایت غیر معمولی نہیں تھی؟ کیا انہیں شک تھا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی ان سے ملنے آسکتا ہے؟''

''اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ان کے ذہن میں جو بات آجاتی تھی، اس پر وہ پوری طرح عمل درآمد چاہتے تھے۔''

''اکتیس دسمبر کو آپ یہاں نہیں تھے جبکہ اظفر عالم یہیں تھے؟''

''ہاں... اس دن انہوں نے خصوصی طور پر مجھے چھٹی دے دی تھی۔''

''کیوں... اس کی کوئی خاص وجہ؟'' مقصودی صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''شاید وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ آپ کی ان کے علاوہ کسی اور سے ملاقات ہو۔''

''اچھا، دوسرے دن انہوں نے آپ سے اس ملاقات کا تذکرہ کیا تھا؟'' مقصودی صاحب نے پوچھا۔

''نہیں... اور نہ ہی میں ان سے دریافت کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا یہ بتائیں کہ انہوں نے اپنے کمرے میں مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کی تھی؟''

''اس کی وجہ کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ ان کی خواہش تھی اور انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں گارڈ کو بتا دوں کہ وہ آپ سے میرے کمرے میں ملیں گے۔ ویسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، آپ کے علاوہ بھی وہ چند لوگوں سے اسی کمرے میں ملتے رہے ہیں۔''

''گڈ!'' مقصودی صاحب نے تفہیمی انداز میں کہا پھر انسپکٹر علی رضا سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''ذرا اس گارڈ کو تو بلاؤ جو اس روز ڈیوٹی پر موجود تھا۔''

''کس روز؟'' اس نے پوچھا۔

''اکتیس دسمبر کو۔'' مقصودی صاحب نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے اپنے سپاہی کو گارڈ کو بلانے کا کہا اور وہ سیلیوٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مقصودی صاحب دیکھ رہے تھے کہ کامران اور انسپکٹر دونوں بے چینی و بے قراری کے ساتھ ان کو دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ کمرے میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

''تم مجھے پہچانتے ہو؟'' مقصودی صاحب نے اسے ایک کرسی پر بٹھا کر سوال کیا۔

''جی! آپ ایک ہفتہ پہلے صاحب سے ملنے آئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس دن کیا ہوا تھا؟ ساری بات تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔'' مقصودی صاحب نے اس سے کہا۔

''اس دن دوپہر میں چھٹی ہونے کے بعد آصف صاحب نے مجھے بلایا تھا اور یہ کہا تھا کہ ایک صاحب دفتر والا خط لے کر یہاں آئیں گے۔ میں انہیں لے کر ان کے کمرے میں آجاؤں کیونکہ بڑے صاحب ان سے وہیں ملیں گے۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

''اس کے بعد تم اظفر صاحب سے ملے تھے؟'' مقصودی صاحب نے پوچھا۔

''جی... میں کوئی ساڑھے چار بجے ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''انہوں نے تمہیں کیوں بلایا تھا؟''

''ان کے ایک ٹیلی فون کا تار پلگ سے نکل گیا تھا، اسے لگوانے کے لیے انہوں نے مجھے انٹرکام کیا تھا۔''

''اس موقع پر انہوں نے کوئی دوسری بات نہیں کی تھی؟'' مقصودی صاحب نے غور سے اسے دیکھا۔

''نہیں، ویسے بھی وہ زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ صرف حکم دیتے تھے... اور بس۔''

''ٹھیک [illegible]'' مقصودی [illegible] جانے کی اجازت

''اور اب میں مسز اظفر عالم سے چند سوال کروں گا۔'' اس کے جانے کے بعد مقصودی صاحب نے کہا۔

''لیکن ان سب سوالوں کی کیا ضرورت ہے؟'' ارجمند نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''اب ڈیڈی تو واپس آنے سے رہے اور اب تک کے حالات سے تو ثابت ہو رہا ہے کہ انہوں نے خودکشی کی ہے تو پھر آخر اس فضول جھک جھک سے کیا حاصل ہوگا؟''

''ان سوالوں کا محرک اظفر عالم کا وہ جملہ ہے جس میں انہوں نے مجھ سے اپنے کسی دشمن کا ذکر کیا تھا۔'' مقصودی صاحب نے رسان سے جواب دیا اور مسز اظفر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''جی تو زرینہ صاحبہ! اظفر صاحب کی نظر درست تھی؟''

''نہیں... عینک کے بغیر نہیں۔'' اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

''کیا ان کی نظر خاصی خراب تھی؟''

''خاصی سے بھی بہت زیادہ۔'' زرینہ نے جواب دیا۔ ''اپنی عینک کے بغیر تو وہ تقریباً اندھے ہی ہو جاتے تھے۔ میں نے کئی بار بغیر عینک کے انہیں اندھوں کی طرح مختلف چیزیں ٹٹولتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''ان کے پاس ایک سے زائد چشمے تھے؟''

''ہاں، اور یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ ہر وقت ایک سے زائد چشمے اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ نہ جانے کب کوئی چشمہ ٹوٹ جائے تو وہ اندھے ہونے سے بچے رہیں۔''

''ہوں۔'' مقصودی صاحب نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ''میرا خیال ہے کہ تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں اور اب ہر شے واضح ہو کر میرے سامنے آگئی ہے۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ سب لوگ مقصودی صاحب کی طرف متوجہ تھے جنہوں نے بے پروائی سے سگریٹ سلگا لیا تھا اور اس کے کش لگاتے ہوئے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لے رہے تھے۔

''مقصودی صاحب! آپ یہ معما حل کر چکے ہیں تو ہمیں بھی بتائیے۔'' اضطراب جب حد سے بڑھ گیا تو مسز اظفر عالم نے بے چینی سے کہا۔ ''اس خواب سے ان کی موت کا کیا تعلق تھا؟''

''وہ خواب [illegible] اصل مسئلہ

کنسلٹنٹ

بل سرسبز پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کے بڑے سے گلے کو چرا رہا تھا۔ کچے راستے پر دور سے دھول اڑاتی ہوئی ایک شاندار جیپ نمودار ہوئی۔ بل کے قریب سے گزرتے ہی جیپ رک گئی۔ ڈرائیور نے اسے قدرے ریورس کیا اور انجن بند کر کے نیچے آگیا۔

وہ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس، قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ آنکھوں پر رے بین کا چشمہ جما ہوا تھا۔ اس نے بل سے کہا۔ ''اگر میں تم کو یہ بتا دوں کہ اتنے بڑے ریوڑ میں تمہاری بھیڑوں کی تعداد کتنی ہے تو کیا تم ایک بھیڑ مجھے دے دو گے؟''

بل کو دلچسپی محسوس ہوئی۔ ''ہاں دے دوں گا۔''

نووارد نے اپنی جیب سے ٹیبلیٹ نکالا۔ اسے الیکٹرانک نوٹ پیڈ سے منسلک کیا اور انٹرنیٹ پر ناسا کا پیج نکالا۔ صفحہ ملتے ہی اس نے سیٹلائٹ سے چلنے والے جی پی ایس کو جوڑا، اس پر کھیلتے ہوئے اس نے بل کی چراگاہ کا تعین کیا، اس کا ڈیٹا بیس نکالا اور تقریباً 160 اسپریڈ شیٹس پر پیچیدہ فارمولوں میں الجھے رہنے کے بعد اپنے چھوٹے سے پرنٹر پر ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ نکالی اور بل سے کہا۔ ''اس وقت یہاں 15862 بھیڑیں موجود ہیں۔''

''بالکل درست!'' بل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب تم ایک بھیڑ لے سکتے ہو۔''

وہ ریوڑ کے قریب گیا اور ایک جانور کو اٹھا کر اپنی جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔

وہ لوٹا تو بل نے کہا۔ ''اب اگر میں تمہارے پیشے کے بارے میں بتا دوں تو کیا تم میرا جانور مجھے واپس دے دو گے؟''

نووارد راضی ہو گیا۔ بل نے کہا۔ ''تم کنسلٹنٹ ہو؟''

وہ حیران رہ گیا۔ ''بالکل درست... تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟''

''بہت آسان سی بات ہے۔'' بل نے اطمینان سے کہا۔ ''تم بن بلائے میرے پاس آئے... دوسری پہچان یہ تھی کہ تم ایک ایسے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے جس کا جواب میں پہلے سے جانتا تھا اور اس کے معاوضے میں ایک بھیڑ کے طلب گار تھے... تیسری اور آخری پہچان یہ تھی کہ تمہیں یہ تک پتا نہیں تھا کہ یہاں کون کون سے جانور ہیں... تم نے بھیڑ کے بجائے میرا کتا اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا ہے... مہربانی کر کے اب اسے واپس کر دو۔ وہ بہت بے ضرر ہے... صرف بھٹکنے والی بھیڑوں پر غراتا ہے۔''

(جان محمد کی جامشورو سے حاضر دماغی)

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آہ!" مسز اظفر نے لرز کر کہا۔ "اس سے پہلے بھی مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں تھا لیکن اس خواب والے واقعے کے بعد تو میری عجیب کیفیت ہے۔ وہ بے چارہ مجھے اپنا خواب سناتا تھا اور اب اس کا انجام بھی اسی خواب کے مطابق ہو گیا... آہ!" اس نے ایک سسکی لی اور خاموش ہو گئی۔ اب اس کے لہجے میں اظفر عالم کے لیے کوئی خاص احترام نہیں رہا تھا۔

"واقعی یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔" ڈاکٹر اجمل نے کہا۔ "اگر مقصودی صاحب نے یہ بات ہمیں نہ بتائی ہوتی تو میں کبھی اس پر یقین نہیں کرتا۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" مقصودی صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے خواب کا قصہ اگر مجھے اظفر عالم نے خود نہ سنایا ہوتا تو میرے لیے بھی اس پر یقین کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال اس تمام واقعے میں تین باتوں نے مجھے پریشان کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ باتیں جو میرے یہاں آنے پر پیش آئی تھیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آخر انہوں نے گارڈ کو یہ ہدایت کیوں کرائی کہ وہ ان کے خط کی موجودگی کی تصدیق کرے۔"

"شناخت کے لیے۔" اظفر عالم کے سیکریٹری نے فوراً کہا۔

"نہیں مائی ڈیئر سیکریٹری!" مقصودی صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ محض میری شناخت کی خاطر انہوں نے اتنا تردد کیا ہو۔ اس تاکید کی کوئی اور زیادہ اہم وجہ تھی جس کی بنا پر نہ صرف انہوں نے گارڈ کو خط دیکھنے کی ہدایت جاری کرائی بلکہ بعد میں وہ خط انہوں نے مجھ سے واپس بھی لے لیا۔ تاہم اگر واپس لے بھی لیا گیا تھا تو اس کی اہمیت نہ ہونے کے باعث اسے ضائع کر دینا چاہیے تھا۔ آج ان کے کاغذات میں یہ خط بھی موجود پایا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ خط انہوں نے کیوں سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا؟"

"ممکن ہے کہ اس خیال کے تحت انہوں نے یہ خط چھوڑا ہو کہ اگر ان کے ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہو جائے تو پھر آپ کے ذریعے ان کے عجیب و غریب خواب کی تفصیلات معلوم کی جا سکیں۔" یہ ارجمند تھی جس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"تم واقعی بہت ذہین ہو۔" مقصودی صاحب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ "اس خط کو سنبھال رکھنے کی صرف یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ ان کی موت کے بعد آخر کوئی تو ایسا ہو جو ان کے بھیانک خواب کے بارے میں دوسروں کو بتا سکے۔ وہ خواب جو اس سارے قضیے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اکتیس دسمبر کی شام میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے چلیں تاکہ میں ایک نظر اس کا جائزہ لے سکوں تو انہوں نے صاف انکار کیوں کر دیا تھا؟"

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

مقصودی صاحب نے جواب طلب نظروں سے سب کو دیکھا پھر بولے۔ "اچھا، میں یہ سوال ایک دوسرے طریقے سے پوچھتا ہوں۔ آخر اس روز اظفر عالم صاحب کے کمرے میں کیا چیز تھی جسے وہ مجھے دکھانا نہیں چاہتے تھے؟"

اس پر بھی سب خاموش رہے۔

"یہ سوال واقعی مشکل ہے۔" لمحاتی توقف کے بعد مقصودی صاحب نے کہا۔ "لیکن اس کے باوجود ہمیں وہ وجہ تلاش کرنی پڑے گی۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس دن ان کے کمرے میں کوئی ایسی شے ضرور تھی جو وہ مجھے دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ بہرحال میں اس سوال کو یہیں چھوڑتا ہوں اور اب تیسرا سوال... اظفر عالم سے میری ملاقات کے دوران انہوں نے اپنا خط مجھ سے طلب کیا تھا اور میں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر انہیں دے دیا تھا جسے انہوں نے کھول کر دیکھا اور پھر تہ کر کے اپنی میز پر رکھ لیا۔ ملاقات کے اختتام پر جب میں روانگی کے لیے اٹھ گیا تھا، تب مجھے پتا چلا کہ ان کا خط تو میری جیب میں تھا اور میں نے غلطی سے انہیں دوسرا کاغذ دے دیا تھا۔ میں نے وہ کاغذ واپس لے کر انہیں وہی خط دے دیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ کاغذ لے کر اسے دیکھا تھا تو انہیں یہ کیوں نہیں معلوم ہوا کہ میں نے اصلی خط کے بجائے دوسرا کاغذ انہیں دے دیا تھا؟"

"کیا انہوں نے اس وقت چشمہ نہیں لگایا ہوا تھا؟" علی رضا نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں... انہوں نے اس وقت چشمہ لگایا ہوا تھا۔ یہی تو اصل نکتہ ہے۔ اگر انہوں نے عینک پہنی ہوئی نہ ہوتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے خط اور دوسرے کاغذ میں تمیز نہ کر سکے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ انہیں ان کاغذوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا؟ بس اسی مقام سے کہانی

خوب کہانی ہے۔ اظفر عالم کو روزانہ ایک ہی خواب نظر آتا ہے جس میں وہ خودکشی کر رہا ہوتا ہے اور پھر کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے دفتر میں مردہ پایا جاتا ہے اور حالات اس طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں کہ اس نے خودکشی کی ہے لیکن..."

"لیکن کیا...؟" کامران نے چونک کر درمیان میں مداخلت کی۔ "تمہاری بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق یہ سیدھا سادہ خودکشی کا ہی معاملہ ہے۔"

"نہیں... ہرگز نہیں۔" مقصودی صاحب نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس کے برخلاف یہ ایک قتل کی واردات ہے۔ انتہائی چالاکی اور بہترین منصوبہ بندی سے کیا گیا قتل..." مقصودی صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا اور سب کے تجسس سے پُر چہروں پر ایک نظر ڈالی۔

"سوال نمبر دو یہ تھا کہ آخر اس روز اظفر عالم مجھے اپنے کمرے میں کیوں نہیں لے جانا چاہتا تھا؟" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہاں ایسی کیا چیز تھی جسے وہ میری نظروں سے چھپانا چاہتا تھا؟ تو مائی ڈیئر فرینڈز! میرا خیال یہ ہے کہ مجھے اکتیس دسمبر کو اظفر عالم کے کمرے میں اس لیے نہیں لے جایا گیا کہ کہیں میں اظفر عالم کو نہ دیکھ لوں۔"

مقصودی صاحب کی اس بات نے سب کو ہونق کر دیا تھا۔ سب کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔

"مقصودی! تم کوئی کہانی اپنے مداحوں کو نہیں سنا رہے ہو۔ ہم سب اظفر عالم کی خودکشی کے اسباب معلوم کرنے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔" کامران نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم نے اسے قتل کہا اور اب کہہ رہے ہو کہ اظفر عالم کو تمہاری نظروں سے بچانے کے لیے تمہیں اس کے کمرے میں نہیں لے جایا گیا۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں، وہ اپنی تیار کردہ کہانی کی بنیاد پر ہی کہہ رہا ہوں۔" مقصودی صاحب نے مسکراتے ہوئے کامران کو دیکھا اور بولے۔ "میرے تجزیے اور تخیل کے مطابق وہ اظفر عالم جس سے میں اس کمرے میں ملا تھا، اپنے اور دوسرے خط میں اس لیے تمیز نہ کر سکا کہ اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں لیکن اس نے غیر معمولی شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ ایسی عینک عارضی طور پر اچھی بصارت رکھنے والوں کو اندھا کر سکتی ہے۔ جب تک اسے اتارا نہ جائے، وہ صحیح طور پر کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے غلط تو نہیں

اسے تائید

کیا آپ
موذی مرض شوگر
سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکرمند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھوکھلا کمزور بے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔ خدارا ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون اوقات
صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک
عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک
آپ صرف فون کریں شوگر کورس ہم پہنچائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

طلب کی۔

''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن...'' ڈاکٹر اجمل نے مقصودی صاحب کی تائید کرنے کے بعد کچھ کہنا چاہا مگر مقصودی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''نہیں... پہلے مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو... مجھے اکتیس دسمبر کو ہی کچھ شبہ ہو گیا تھا کہ میں اصلی اظفر عالم سے نہیں، محض ایک اداکار سے ملاقات کر رہا ہوں۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ ایک ڈرامے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اس دن اظفر عالم نے خود کو روشنی سے حتی الوسیع بچا کر کمرے کی روشنیاں اس طرح سیٹ کی ہوئی تھیں کہ میں صرف اس کا کوٹ... بلکہ اوورکوٹ، خم دار ناک اور موٹے شیشوں والا چشمہ ہی دیکھ سکوں... اور یہ سب چیزیں مصنوعی بھی ہو سکتی تھیں۔

''اس کے علاوہ ذرا خواب والے قصے پر غور کیجیے۔ کسی کے پاس بھی کیا ثبوت ہے کہ اظفر عالم کو واقعی ایسے بھیانک خواب نظر آیا کرتے تھے۔ صرف اور صرف اکتیس دسمبر کے دن مجھ سے ملاقات کرنے والے اظفر عالم کا بیان... چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاید یہ سارا سلسلہ ہی فراڈ تھا اور اس فراڈ میں دو افراد شریک تھے... ایک...'' انہوں نے تجسس پھیلانے کے لیے خاموشی اختیار کی اور سب کے چہروں کو دیکھا۔ ان کی گفتگو نے دو چہروں کا رنگ تبدیل کر دیا تھا۔ ''مسز اظفر عالم اور دوسرا اظفر عالم کا سیکریٹری محمد آصف...!''

''کیا بکواس ہے؟'' زرینہ نے چلا کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی جسے انسپکٹر علی رضا نے ناکام بنا دیا۔

''آپ مقصودی صاحب کی پوری بات سن لیں۔'' اس نے ملامت سے کہا۔ ''یہ بہت اچھے کہانی نویس ہیں اور ڈراما نگار ہیں۔''

''مگر یہاں کہانیوں اور ڈراموں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' زرینہ نے آپے سے باہر ہونے کی اداکاری کی۔ ''یہ اپنی کہانیاں اور ڈرامے اپنے قارئین اور ناظرین کو پڑھائیں اور دکھائیں۔''

''آپ سکون سے تشریف رکھیں اور ہمیں ان کی کہانی سننے دیں۔'' کامران نے بھی اسے مخاطب کر کے کہا۔ ''ورنہ ممکن ہے کہ بقیہ کہانی آپ کو ہتھکڑیوں کے ساتھ سننی پڑ جائے۔''

اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور کامران کو بُری طرح گھورتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس فراڈ میں دو افراد شریک تھے۔'' مقصودی صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ''آصف نے اظفر عالم کی طرف سے مجھے خط لکھا اور میری آمد کے دن اپنے باس سے چھٹی لے کر بظاہر یہاں سے رخصت ہو گیا مگر وہ کسی طریقے سے واپس اس دفتر میں آیا اور پھر خم دار ناک، موٹے شیشوں کی عینک جو یقیناً اظفر صاحب کی ہی رہی ہو گی اور ایک اوورکوٹ پہن کر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے وہ گارڈ کو یہ ہدایت کر چکا تھا کہ اظفر عالم اپنے مہمان سے اس کے کمرے میں ملاقات کریں گے۔

''اس ڈرامے کا دوسرا حصہ آج مکمل ہوا ہے۔ آصف کسی اچھے موقع کے لیے سخت بے تاب تھا اور آج دو غیر ملکی مہمانوں کی دفتری اوقات کے بعد ملاقات کے پروگرام نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اظفر عالم کی انتظار گاہ میں دو غیر ملکی مہمان ملاقات کے لیے منتظر تھے جو بعد میں حلف اٹھا کر یہ بتاتے کہ اظفر عالم کے کمرے میں کوئی شخص نہیں گیا تھا۔

''اسے علم تھا کہ اظفر عالم کے کمرے کی کھڑکی کھلی رہتی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پڑوس کی فیکٹری میں کنکریٹ مکسر کی گڑگڑاہٹ کے باعث گولی چلنے کی آواز کوئی نہیں سن سکے گا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور جب غیر ملکی مہمان اظفر عالم سے ملاقات کے انتظار میں تھے، اس نے اظفر عالم کی کھڑکی میں کوئی شے رکھ دی۔ اسے علم تھا کہ اظفر عالم اس شے کو دیکھتے ہی بے چین ہو جائے گا اور کھڑکی میں آئے گا۔

''اور ایسا ہی ہوا۔ جونہی اظفر عالم کھڑکی میں آیا اور باہر جھانکنے کے لیے ذرا سا جھکا، آصف نے اپنے کھڑکی میں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھایا اور اس کی کنپٹی میں گولی مار دی۔ دونوں کھڑکیوں کے دوسری طرف واقع فیکٹری والی دیوار میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں ہے اس لیے وہاں سے اس کارروائی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''آصف... اظفر عالم کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد آدھے گھنٹے تک اپنے کمرے میں ہی رہتا ہے اور پھر یونہی باہر نکل آنے کی اداکاری کرتے ہوئے انتظار گاہ میں موجود مہمانوں کو وہاں دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر اس کی جیب میں

ریوالور پر اظفر عالم کی انگلیوں کے نشانات ثبت کر کے اسے وہیں ڈال دیا اور باہر نکل کر شور مچانے لگا کہ اظفر صاحب نے خودکشی کر لی۔ اس کے علاوہ اس موقع پر اس نے مجھے لکھا گیا خط اظفر عالم کے کاغذات میں شامل کر دیا تھا تاکہ جب وہ برآمد ہو تو مجھے بلایا جائے اور میں یہ بتاؤں کہ اسے بھیانک خواب آ رہے تھے جن کے باعث وہ نفسیاتی طور پر الجھا ہوا تھا، اسی دباؤ کے تحت اس نے خودکشی کر لی۔''

''لیکن سارے قصے میں زرینہ کہاں ہے؟'' کامران نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

''مسز اظفر عالم اس قصے میں کہاں ہیں اور کیوں ہیں...؟ اس کا جواب تو یہ خود ہی دے سکتی ہیں مگر مجھے یہ پتا ہے کہ انہوں نے اظفر عالم کو بھیانک خواب دکھائی دینے کی تصدیق کی تھی۔ اب انہوں نے یہ تصدیق کیوں کی؟ اس کی وضاحت ان سے ہی طلب کی جائے... اور ہاں، میری اس ساری کہانی کا ثبوت تمہیں آصف کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کرانے سے مل جائے گا۔ جس میں اب تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' آخری جملہ انہوں نے انسپکٹر علی رضا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں لیکن اس سے پہلے میں ذرا مسز اظفر عالم سے ان کا انٹرسٹ دریافت کر لوں۔'' انسپکٹر علی رضا نے کہا اور زرینہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''جی... تم یہیں اپنی کہانی سناؤ گی یا پولیس اسٹیشن میں خوف ناک صورت حوالدار کی موجودگی میں...؟''

جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش بیٹھی سرا سیمہ نگاہوں سے مقصودی صاحب کو دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے...'' علی رضا نے اس کی خاموشی کے پیش نظر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ''میں تم دونوں کو پولیس اسٹیشن روانہ کر رہا ہوں۔ وہاں سے ضابطے کی کارروائی کے بعد سیکریٹری صاحب کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات تلاش کرا لوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے اہلکاروں کو بلایا اور دونوں کو ہتھکڑی لگا کر لے جانے کا حکم دیا۔

''چلو جی... یہ قصہ تو نمٹ گیا۔'' ان دونوں کے چلے جانے کے بعد کامران نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے اتنا درست نتیجہ کیسے اخذ کیا؟''

''اس کا جواب میں نیچے چل کر دوں گا۔'' مقصودی دے گئے۔

لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچنے کے بعد ان کا رخ دائیں طرف ہو گیا جس کے آخر میں ایک دروازہ تھا۔ ڈاکٹر اجمل، ارجمند، انسپکٹر علی رضا اور کامران ان کے ساتھ تھے۔

وہ لوگ دروازے سے باہر نکلے تو انہوں نے خود کو ایک گلی نما جگہ میں پایا جس کے دوسری طرف برابر والی فیکٹری کی دیوار واقع تھی۔

مقصودی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے نیچے جھک کر ایک پلاسٹک کی بنی ہوئی سیاہ بلی اٹھائی جو ہو بہو اصلی بلی کی طرح تھی۔

''یہ وہ شے ہے جو آصف نے اپنے باس کے کمرے کی کھڑکی میں رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اظفر عالم کو جانوروں، خصوصاً بلی سے شدید نفرت ہے اور وہ بلی کو اپنی کھڑکی میں دیکھ کر اسے بھگانے کے لیے ضرور کھڑکی میں آئے گا اور اس کے بعد...''

''کمال ہے۔'' کامران نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''ایک معمولی سی کالی بلی نے اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اگر وہ یہ بلی بھی یہاں سے اٹھا لیتا تو اس کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا۔''

''اور مجھے یقین ہے کہ یہ تمام منصوبہ اس نے زرینہ کی خواہش کے مطابق تیار کیا ہو گا۔ اسی نے اسے کوئی لالچ دیا ہو گا۔'' مقصودی صاحب نے اپنی بات مکمل کی۔

وہ سب واپس ہو گئے۔

دو دن بعد انسپکٹر علی رضا نے مقصودی صاحب کو فون کر کے بتایا کہ دونوں کے اعترافِ جرم کے مطابق زرینہ، آصف سے شادی کرنا چاہتی تھی اور ان کا منصوبہ تھا کہ اظفر عالم سے کامیابی سے نجات پا لینے کے بعد وہ ارجمند کو بھی کسی ایسے ہی طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیتے اور اس طرح اظفر عالم کا تمام کاروبار ان کے ہاتھ آ جاتا مگر افسوس کہ مقصودی صاحب کو لا کر ایک گواہ بنانے کے چکر میں آصف اپنی شامت کو آواز دے بیٹھا۔

وہ ایک کہانی کار کو اپنی کہانی کا کردار بنانا چاہتا تھا مگر اسے یہ علم نہیں تھا کہ ایک سچا رائٹر وہ ہوتا ہے جو خود کسی کہانی کا کردار نہیں بنتا بلکہ کردار اس کی مرضی کے مطابق چلتے پھرتے اور اپنے کام انجام دیتے ہیں۔

مقصودی صاحب کو خوشی ہوئی کہ اب ارجمند اپنی مرضی سے اپنی پسند کے نوجوان سے شادی کر سکے گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ارض فرض قرض

مریم کے خان

بدنیتی اور جھوٹ بولنا کوئی اضطراری غلطی ہے نہ اتفاقی حادثہ... یہ تو کردار کی خاصیت ہوتی ہے جس کی جڑیں گہری بھی ہوسکتی ہیں... یہ روح کے کھیت میں اگنے والی ایک انتہائی خطرناک گھاس ہے... اگر اسے ابتدا میں ہی اکھاڑا نہ جائے تو یہ بڑھ کر پورے کھیت کو گھیرلیتی ہے اور اتنی جگہ باقی نہیں رہتی ہے کہ اچھے بیجوں کے پھول پھوٹ سکیں... ایک ایسے ہی شخص کی بدخصلتی اور بدیانتی کا ماجرا... جو سر سے پاؤں تک جھوٹ اور فریب کا لبادہ اوڑھے اپنے عزائم کے لیے زندہ تھا۔

ایک انجانے شخص کی دوستی اور شناسائی دشمنی کا سنسنی خیز فسانہ

وہ موبائل کان سے لگائے سن رہا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی شخص دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''اسی سڑک پر آگے جاؤ گے تو ایک چھوٹا ڈیرا ہے۔ اس کے پیچھے ٹیلے اور کھائیاں ہیں۔ پرسوں رات آٹھ بجے وہاں منشیات کی بہت بڑی کھیپ آئے گی۔ تمام اہم لوگ بھی ہوں گے۔''

''تم یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟'' سننے والے نے پوچھا۔

''میں ان موت کے سوداگروں کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔'' دھیمی آواز والے نے کہا اور کال منقطع کردی۔ دو دن بعد رات آٹھ بجے اینٹی نارکوٹکس فورس نے دارالحکومت کے نواحی علاقے میں اس مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ ٹھیک آٹھ بجے ایک عام سی پک اَپ مکان میں داخل ہوئی۔ بظاہر اس پر انڈوں کے کریٹ لدے ہوئے تھے۔ پک اپ کے مکان میں داخل ہوتے ہی اینٹی نارکوٹکس فورس کے اراکین حرکت میں آگئے۔ انہوں نے چاروں طرف سے مکان پر دھاوا بول دیا۔ منشیات فروشوں نے جواب دیا اور دونوں طرف سے ہتھیاروں کے دہانے کھل گئے۔ مگر فورس والے زیادہ منظم تھے۔ انہوں نے دس منٹ میں سب پر قابو پالیا۔ اس کے بعد چھپ جانے والوں اور فرار ہونے والوں کی تلاش شروع ہوئی۔ کال سننے والا اس آپریشن کی کمانڈ کررہا تھا اور وہ فرار ہونے والوں کے پیچھے تھا۔ اس نے دو افراد کو دیکھ لیا تھا جو ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے فرار ہورہے تھے۔ وہ ان کے پیچھے لگا رہا اور جیسے ہی ایک شخص نشانے پر آیا، اسے مار گرایا۔ اس نے پیروں کا نشانہ لیا تھا۔ دوسرا بھاگا تو گرنے والے نے اسے پکارا۔ ''مجھے بھی لے کر جاؤ۔''

اس نے مڑ کر کہا۔ ''میں تمہیں نہیں لے جاسکتا۔''

وہ دوسرے کو بھی نشانہ بنانے جارہا تھا لیکن جیسے ہی اس کی آواز سنی، اس کی انگلی ٹریگر پر نرم پڑ گئی اور دوسرا غائب ہوگیا۔ اس [illegible]

گروہ کے اہم ترین اراکین کے ساتھ بہت بڑی مقدار میں منشیات بھی اینٹی نارکوٹکس والوں کے ہاتھ لگی تھی۔

☆☆☆

وہ جس گاڑی میں سفر کررہا تھا، اس میں پانچ دوسرے افراد بھی تھے۔ وہ تقریباً تیس سال کا جوان اور خوش شکل آدمی تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال بے ترتیب ہورہے تھے۔ اس نے لباس بھی مقامی پہنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ الگ سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ سختی اور سفاکی نہیں تھی جو اس کے ساتھ بیٹھے دوسرے لوگوں کے چہروں پر تھی اور نہ ہی اس کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ فکرمند تھا۔ اس کی فکر تین ہستیوں سے وابستہ تھی اور اتفاق سے تینوں صنفِ نازک تھیں۔ وہ انہیں چھوڑ کر آنا نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ یہ اس کی ذمے داری تھی اور وہ اپنی ذمے داری بہرصورت نبھاتا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور خود سے کہا۔ ''ابھی یہ سب بھول جاؤ، واپسی میں دیکھی جائے گی۔''

اس کے پاس بیٹھے آدمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''تم نے کچھ بولا؟''

آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ اچانک گاڑی ایک دھچکے سے رکی اور باہر سے کئی افراد کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھیوں کے چہروں کے رنگ اڑ گئے اور خشونت کی جگہ فکرمندی نظر آنے لگی۔ یہ بڑی لینڈ کروزر جیپ تھی۔ تقریباً سب کے ہاتھ اپنے ہتھیاروں کی طرف بڑھے لیکن پھر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص نے پلٹ کر اشارے سے منع کیا تو سب رک گئے۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا ان کا سربراہ تھا۔ دو منٹ سے بھی پہلے وہ سب گاڑی سے اتار کر زمین پر اوندھے منہ لٹائے جاچکے تھے اور باوردی پولیس اہلکاران کے سروں پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ موسم شدید سرد تھا اور زمین جیسے برف کی بنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ موجود لوگوں کے لیے یہ چھاپا انہونی تھا۔ مگر یہ اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اب اس کی واپسی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اس کا تعلق اس ملک سے نہیں تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا تعلق اس ملک سے نہیں ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ لیٹے اس کے ساتھی بھی ناواقف تھے۔ انہیں قابو میں کرنے کے بعد پولیس والے اب گاڑی سے منشیات نکال رہے تھے۔ پوتھین میں لپٹی ہوئی ہیروئن کے کم سے کم سو تھیلے اس جیپ سے برآمد ہوئے تھے اور ہر تھیلی میں دو کلوگرام خالص ہیروئن تھی۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت چار کروڑ ڈالرز کے لگ بھگ تھی۔ کچھ دیر بعد ان سب کو ہتھکڑیاں لگا کر پولیس ٹرک میں بٹھایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

تیکھے نقوش اور سرخی مائل سفید رنگت والی وہ لڑکی وین سے اتری اور گھر کی طرف چل پڑی۔ وفاقی دارالحکومت میں یہ متوسط بستی تھی۔ یہاں تین کمروں کے چھوٹے سے گھر میں وہ ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا اس دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کم سے کم چھ مہینے پہلے تک تو سچ مچ کوئی نہیں تھا۔ یہ چھ مہینے پہلے کی بات ہے جب گرمی عروج پر تھی۔ وہ حسب معمول دفتر سے واپسی میں وین سے اسٹاپ پر اتری تھی کہ وہاں موجود کچھ لفنگے اسے چھیڑنے اور آوازیں کسنے لگے۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جاب پیشہ اور روز باہر جانے والی عورتوں اور لڑکیوں کو آئے دن ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ ان کی مجبوری بن جاتی ہے۔ وہ جواب نہیں دے سکتیں کہ اس صورت میں بھی ان کا اپنا ہی تماشا بنتا اس لیے خاموش رہنا اور برداشت کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس دن یہ لفنگے حد سے بڑھنے لگے۔ وہ اس کا پیچھا کر رہے تھے اور دست درازی کے موڈ میں تھے۔ وہ سنسان سڑک پر تیز قدموں سے چلتی ہوئی دل ہی دل میں ہراساں تھی۔ اچانک ایک لفنگے نے اس کا ہاتھ تھام کر واہیات بات کی تو بے اختیار اس کا ہاتھ گھوما اور تھپڑ کی آواز گونجی۔ لفنگے کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کرتا، ایک بائیک وہاں آ کر رکی اور اس سے اترنے والے ہیلمٹ پوش نے کہا۔

"لڑکی کو جانے دو۔"

"کیوں... تیری کیا لگتی ہے؟"

لفنگے نے بدتمیزی سے کہا۔ جواب میں ہیلمٹ پوش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا۔ ضرب شدید تھی، وہ زمین پر گرا اور پیٹ پکڑ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ باقی لفنگے ہیلمٹ پوش کی طرف لپکے لیکن اس نے کچھ ایسے ہاتھ دکھائے کہ دو منٹ سے بھی پہلے وہ اپنے ساتھی کی طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ لڑکی کے لیے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا جو اس سے پہلے اس نے صرف فلموں میں دیکھا تھا۔ چاروں لفنگوں کو زمین چٹانے کے بعد وہ اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر میں وہ چاروں بہ مشکل اٹھے اور پھر وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کے جانے کے بعد ہیلمٹ پوش بھی بائیک پر بیٹھ کر جانے لگا تو وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

"سنیے..."

وہ رک گیا۔ "فرمائیے؟"

"آپ کا بہت شکریہ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا اور بائیک آگے بڑھا دی۔ لڑکی نے بائیک کا نمبر دیکھا اور ذہن نشین کر لیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ چھٹی کے دن اپنی اور ماں کی کچھ چیزیں لینے مین مارکیٹ آئی تھی۔ وہ ایک دکان سے نکلی تو اس کے سامنے وہی بائیک کھڑی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر نمبر دیکھا۔ نمبر اس کے ذہن پر نقش تھا۔ وہ رک گئی۔ کچھ دیر بعد ایک اور دکان سے ایک جوان اور خوش شکل آدمی نکلا۔ وہ بائیک کے پاس آیا اور پھر اسے دیکھ کر رک گیا۔ آدمی نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ وہی ہیں؟"

وہ مسکرایا۔ "ہاں، آج میں ہیلمٹ گھر بھول آیا۔ آپ کیسی ہیں... ان لفنگوں نے دوبارہ تنگ تو نہیں کیا؟"

"نہیں اور اب میں نے اگلے اسٹاپ پر اترنا شروع کر دیا ہے۔ وہ گھر سے کچھ دور پڑتا ہے لیکن راستہ ویران نہیں ہے۔" وہ بولی اور پھر ہچکچائی۔ "میرا نام عالیہ حسن ہے۔"

"عابد الرحمن۔" اس نے جوابی تعارف کرایا۔

"میں جاب کرتی ہوں... ایک پرائیویٹ فرم ہے۔"

"میں بھی جاب کرتا ہوں۔" عابد نے کہا مگر اس نے وضاحت نہیں کی کہ وہ کیا جاب کرتا تھا۔ عالیہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی اس لیے بس اتنا ہی کہا۔

"آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔"

"مجھے ڈراپ کر دوں اگر آپ برا نہ مانیں تو...؟"

"نہیں... نہیں میں چلی جاؤں گی اور ابھی تو مجھے شاپنگ کرنی ہے۔"

"اوکے بائے۔" وہ بائیک پر بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔

عالیہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اپنی بائیس سالہ زندگی میں وہ شاذ ہی کسی غیر مرد سے مخاطب ہوئی تھی۔ وہ سولہ سال کی تھی جب باپ دنیا سے رخصت ہوا۔ وہ سرکاری ملازم تھا اور واحد اثاثہ یہ چھوٹا سا مکان تھا جو ان کے لیے چھوڑ کر گیا تھا۔ عالیہ تعلیم میں آگے تھی۔ اس نے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ دو سال دونوں ماں بیٹی نے بہت تنگی ترشی سے گزارے تھے۔ پھر عالیہ کو ایک دوا بنانے والی فیکٹری میں ملازمت مل گئی تو ان کی مشکل آسان ہوئی۔ پہلے وہ پیکنگ میں تھی اور شفٹیں لگتی تھیں۔ اس وقت اسے کنوینس ملتی تھی مگر شفٹوں میں کام کرنا مشکل تھا اس لیے اس نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ ایڈمن میں کرا لیا اور اب وہ آفس ٹائم میں آتی جاتی تھی۔ مگر اب کنوینس نہیں تھی، خود سے آنا جانا پڑتا تھا۔ تنخواہ مناسب تھی۔ ان کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ عابد سے تیسری ملاقات عجیب حالات میں ہوئی۔ عالیہ کی ماں کے کئی دن سے سر میں درد تھا اور وہ درد کش دوا لے رہی تھی مگر فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ایک رات وہ اچانک بے ہوش ہو گئی۔ عالیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے کچھ پڑوسیوں کی مدد سے ماں کو اسپتال پہنچایا۔ اسے آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ عالیہ ڈاکٹروں سے پوچھ رہی تھی مگر کوئی کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ وہ باہر ویٹنگ روم میں پریشان اور ہراساں بیٹھی تھی کہ عابد الرحمن کی آواز آئی۔

"ارے آپ یہاں... خیریت تو ہے نا؟"

وہ چونکی، عابد بازو پر پٹی باندھے کھڑا ہوا تھا۔ اسے زخمی دیکھ کر وہ بے قرار ہو گئی اور چند لمحے کے لیے ماں کو بھی بھول گئی۔ "کیا ہوا آپ کو... یہ پٹی کیوں بندھی ہے؟"

اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "چوٹ لگ گئی تھی، اس کی پٹی کرانے آیا تھا۔ آپ نے بتایا نہیں؟"

"میری امی یہاں آئی ہیں۔ وہ اچانک بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئیں۔ میں یہاں لے کر آئی ہوں مگر ڈاکٹر کچھ بتا ہی نہیں رہے ہیں۔"

"آپ بیٹھیں، میں معلوم کر کے آتا ہوں اور آپ پریشان نہ ہوں پلیز... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر کے ساتھ کے انداز میں

کہا۔ "آپ کی والدہ کے دماغ میں رسولی ہے، ابھی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ اصل رپورٹ ایم آر آئی کے بعد سامنے آئے گی مگر اس طرح کی بے ہوشی رسولی کی وجہ سے ہوتی ہے۔"

"رسولی۔" عالیہ ساکت رہ گئی۔ ڈاکٹر چلا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ عابد اسے تسلی دینے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کے آنسو تھمے اور اس نے عابد سے کہا۔ "میرا امی کے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟"

"انہیں کچھ نہیں ہو گا۔" عابد نے یقین سے کہا۔ "آج کل میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔"

اس مشکل ترین موقع پر عابد بہت کام آیا۔ وہ مستقل عالیہ اور اس کی ماں کے ساتھ رہا۔ اس نے ایم آر آئی میں مدد کی کیونکہ یہ ٹیسٹ خاصا مہنگا پڑ رہا تھا۔ پتا چلا کہ دماغ میں دو رسولیاں بن رہی تھیں۔ ابھی وہ ابتدائی مرحلے میں تھیں۔ رسولیاں کینسر کی نہیں تھیں لیکن ان کے بڑھنے سے دماغ متاثر ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دماغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتیں، انہیں نکالنا ضروری تھا۔ عالیہ اور عابد قریب آئے تو انہیں ایک دوسرے کے بارے میں پتا چلا۔ عالیہ کو معلوم ہوا کہ عابد کو اپنے گھر میں بھی پریشانی تھی۔ کچھ زمین اور جائداد کا معاملہ تھا اور عدالت میں کیس چل رہا تھا۔ مگر دوسرا فریق جو رشتے دار بھی تھا، دھونس دھاندلی سے کام لے رہا تھا۔ عابد چاہتا تھا کہ اپنے گھر والوں کو یہاں لے آئے مگر اس کی ماں نہیں مان رہی تھی۔ وہ اپنا آبائی گھر اور زمین نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ عابد گھر والوں کے تحفظ کے لیے پریشان تھا۔

عالیہ کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ ماں کا علاج کرا سکتی۔ اگرچہ آپریشن سرکاری اسپتال میں ہوتا لیکن اس میں بھی اچھا خاصا خرچ آتا۔ عابد نے اسے تسلی دی کہ وہ اس کی ممکن حد تک مدد کرے گا۔ عالیہ نے اپنے دفتر سے کچھ رقم ایڈوانس لی اور باقی رقم اسے عابد نے دی۔ وہ ہچکچا رہی تھی لیکن عابد نے مجبور کر دیا۔ عالیہ نے پیشگی رقم جمع کرائی تو ماں کے آپریشن کی تاریخ مل گئی۔ مگر اس سے کچھ دن پہلے ایک دن عابد نے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہے اور ممکن ہے چند دن اس سے رابطہ نہ کر سکے۔ اس دن عالیہ کی سالگرہ تھی اور وہ تیار ہو کر عابد کے ساتھ ریستوران میں آئی ہوئی تھی۔ ملاقات میں اس نے عالیہ کو خوب صورت گولڈن کڑا گفٹ کیا تھا۔ اس پر نئے سال کی آمد کے لحاظ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دو ہزار چودہ کے نمبر بنے ہوئے تھے۔ عالیہ خوش ہو گئی۔ ”بہت خوب صورت ہے لیکن ابھی نئے سال کی آمد میں وقت ہے۔“

”ہاں مگر چند دن ہی باقی ہیں۔“ عابد نے کہا اور اپنا موبائل نکالا۔ ”ذرا پوز تو دو اس کے ساتھ۔“

”رک جائیں، ایک چیز نکال لوں۔“ عالیہ نے کہا اور اپنے پرس سے ایک چیز نکال کر انگلیوں میں رکھ کر نمایاں کی۔ عابد چونک گیا۔

”یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“

”آپ امی کو دیکھنے آئے تھے تو یہ آپ کے پرس سے گر گئی تھی۔ تصویر لیں نا۔“

عابد نے تصویر لی اور بولا۔ ”یہ مجھے دے دو۔“

”نہیں، یہ میرے پاس آپ کی نشانی ہے۔“ عالیہ شرمائی۔ ”میں آپ سے نہیں پوچھوں گی کہ یہ آپ کے پاس کیوں ہے اور آپ مجھ سے واپس نہیں مانگیں گے۔“ اس نے کہہ کر بلٹ واپس پرس میں رکھ لی۔ عابد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب تک ان کے درمیان عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ عابد نے ڈھکے چھپے انداز میں کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ اپنے گھر والوں کو نہیں لے آتا، تب تک وہ کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ زبان کے اقرار کے سوا عابد کا ایک ایک عمل اور اس کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ عالیہ کو پسند کرتا ہے۔ پھر جب اس نے عالیہ کو جانے کا بتایا تو وہ جس طرح بے قرار ہوئی، عابد کا یقین مزید پختہ ہو گیا۔ وہ عالیہ سے مل کر روانہ ہوا۔ وہ بیس دسمبر کے دن گیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ نئے سال کی پہلی تاریخ سے پہلے آ جائے گا۔ اسے گئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا اور اب تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ عالیہ صرف اسی لیے پریشان نہیں تھی بلکہ جن لفنگوں سے عابد نے اس کی جان چھڑائی تھی، وہ اب دوبارہ نظر آنے لگے تھے اور اس کا پیچھا کرنے لگے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیونکہ عابد کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس گندی سی کوٹھری میں چار لڑکے بیٹھے تھے ان کا باس بالا جی تھا۔ نام تو اس کا فضل راہی تھا مگر وہ بالا جی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا باپ نامی گرامی ہسٹری شیٹر تھا اور جیل میں ایک جھگڑے کے دوران ہلاک ہوا تھا۔ بالا جی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی، اسے بدمعاش ہی بننا تھا مگر اپنے باپ کے مقابلے میں وہ بہادر نہیں تھا۔ اس لیے بس سڑک چھاپ لفنگا بن سکا تھا۔ گلیوں اور سڑکوں میں آتی جاتی عورتوں اور کمزور افراد سے پرس اور سامان چھیننا اس کا پیشہ تھا۔ پھر موبائل عام ہوا تو وہ موبائل چھیننے لگا۔ شروع میں وہ اکیلا تھا پھر اس کے ساتھ نبیل، پرویز اور عاطف شامل ہوئے۔ وہ عام گھرانوں کے لڑکے تھے جن کے خواب بڑے تھے اور ان میں اتنی ہمت اور اہلیت نہیں تھی کہ وہ سیدھے طریقے سے کما کر اپنے خواب پورے کرتے۔ اس لیے انہوں نے شارٹ کٹ اختیار کیا۔ گینگ بنا تو بالا جی کی ہمت بھی بڑھی اور اس نے اکا دکا چوریاں بھی شروع کر دیں۔ وہ موقع دیکھتے اور خالی گھروں میں گھس کر جو ہاتھ لگتا، لے جاتے۔

فارغ اوقات میں ان کی تفریح آتی جاتی لڑکیوں اور عورتوں کا پیچھا کرنا اور ان کو تنگ کرنا تھا۔ اس دن انہوں نے عالیہ کا انتخاب کیا۔ بالا جی نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک بے ہودہ بات کی تو خلافِ توقع لڑکی نے اسے تھپڑ مار دیا اور اس سے پہلے بالا جی اس سے بدلہ لیتا، وہ بائیک والا وہاں آ گیا اور اس نے ایک منٹ میں ان چاروں کو مزہ چکھا دیا تھا۔ اس نے تاک تاک کر ضربیں لگائیں اور وہ بے حال ہو گئے۔ وہ چاروں بھاگ نکلے تھے اور وہ دن اپنی چوٹیں سہلاتے رہے تھے۔ جب وہ مل کر بیٹھے تو نبیل نے کہا۔

”استاد! بے عزتی ہو گئی ہے۔“

”بے عزتی... کی ہو گی۔“ بالا جی نے ایک گندی گالی دی۔ ”اس کا پتا چلانا ہے۔“

لڑکی ان چاروں کو اتفاق سے اس دن نظر آئی تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے اسے دیکھا بھی تھا تو توجہ نہیں دی تھی۔ انہوں نے اس اسٹاپ کی کئی دن تک نگرانی کی لیکن لڑکی دوبارہ نظر نہیں آئی۔ وہ مایوس ہو گئے۔ بالا جی کا خیال تھا کہ وہ ملازمت کرتی ہے مگر اس کے دوبارہ نہ دکھائی دینے سے اسے اپنا اندازہ غلط لگا۔ وہ اسی اسٹاپ کے آس پاس رہتے تھے۔ اس واقعے کے تقریباً چھ مہینے بعد نبیل اتفاق سے اس اسٹاپ سے اگلے اسٹاپ کے نزدیک جوس اسٹینڈ پر موجود تھا کہ اس نے اسی لڑکی کو دیکھا۔ وہ وین سے اتر کر جا رہی تھی۔ نبیل جوس ادھورا چھوڑ کر عجلت میں اس کے پیچھے لپکا۔ خاصا لمبا راستہ طے کر کے وہ ایک چھوٹے سے گھر میں داخل ہوئی۔ گھر ذہن نشین کر کے اس نے جلدی سے بالا جی اور دوسروں کو کال کی اور انہیں لڑکی کے بارے میں بتایا۔ وہ لڑکی کا [illegible] پہنچے۔ لڑکی کا گھر

نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”اب دیکھنا اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟“

”سوچ لو استاد... کہیں پھر وہی بائیک والا درمیان میں نہ آ جائے۔“ پرویز نے کہا تو بالا جی کچھ فکر مند ہوا پھر اس نے بے پروائی سے کہا۔

”دیکھا جائے گا پر اسے چھوڑنا نہیں ہے۔“

☆☆☆

وہ ہاتھ سے اپنا پیٹ دبائے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ خون آلود ہو رہا تھا اور خون نیچے بھی ٹپک رہا تھا۔ آدھے گھنٹے پہلے وہ ایک گندی گلی میں مدہوش پڑا تھا۔ چرس نے اسے ہواؤں میں اڑایا تھا۔ اسے نہ سردی کا احساس تھا اور نہ آس پاس کا پتا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، اچانک ہنگامہ ہوا اور کچھ شور شرابے کے بعد گولیاں چلیں۔ اسے جھٹکا لگا تو وہ چونکا۔ تکلیف کا احساس نہیں تھا مگر اسے لگا تھا کہ اس کے پیٹ پر کوئی چیز لگی ہے۔ اس نے ہاتھ لگایا تو وہ خون سے بھر گیا۔ وہ چونک کر اٹھا۔ اس نے اپنی میلی گرم شرٹ اوپر کی۔ پیٹ پر نچلی پسلی والی جگہ سوراخ تھا جس سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ یہ گولی کا نشان تھا۔ وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا اور زخم ہاتھ سے دبا لیا۔ وہ کسی قدر طویل قد اور مضبوط جسامت کا جوان شخص تھا۔ اس کی صحت سے لگ رہا تھا کہ اسے نشہ شروع کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ خوش روئی اور صاف رنگت نشے اور صفائی سے بے پروائی نے دبا دی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو اور بال گندے اور الجھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک معمولی ٹراؤزر کے ساتھ پوری آستین کی گرم جرسی تھی۔ پیروں میں کینوس شوز تھے اور تمام چیزیں نہایت گندی اور خستہ حال ہو رہی تھیں۔

پولیس سائرن گونجا تو دوسرے نشے بازوں کی طرح وہ بھی وہاں سے نکل گیا۔ اسے اب بھی نہیں معلوم تھا کہ وہاں ہوا کیا تھا۔ گولیاں کس نے چلائی تھیں، کون شکار ہوا تھا اور کس کی چلائی گولی راہ بھٹک کر اس کے جسم میں اتر گئی تھی۔ وہ زخم دبائے آگے بڑھتا رہا۔ گولی کا زخم اس کے لیے نیا نہیں تھا اور وہ اب تک ہوش و حواس میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گولی کسی نازک جگہ نہیں لگی تھی۔ خون رسنا بھی کم ہو گیا تھا مگر گولی کا زخم خطرناک ہو سکتا تھا۔ اگر اسے نہ نکالا جاتا تو اس کا زہر پھیل سکتا تھا۔ پر وہ کہاں جاتا؟ اگر کسی اسپتال یا ڈاکٹر کا رخ کرتا تو وہ سب سے پہلے پولیس کو اطلاع کرتے اور وہ پولیس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس وقت پہلے وہ اس جگہ سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ زخم دبائے چلتا رہا۔ کیونکہ شرٹ سیاہ رنگ کی تھی اس لیے صرف اس کے ہاتھ سے پتا چل رہا تھا کہ خون رس رہا ہے۔ سامنے سے کوئی آتا تو وہ دوسرا ہاتھ رکھ لیتا تاکہ خون نظر نہ آئے۔ اسی طرح چلتے ہوئے وہ اس آبادی میں داخل ہوا۔

یہاں مکان چھوٹے تھے لیکن بہت پوش انداز میں بنے تھے۔ مکانات کے باہر اور اندر گاڑیاں تھیں۔ گلیوں میں سناٹا تھا اور اکا دکا لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ وہ مکانوں کی آخری قطار کے سامنے کھڑا تھا، اس کے بعد جنگل تھا۔ یہ دارالحکومت کا علاقہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پہلے مکان کی طرف بڑھا۔ اس کے فولادی گیٹ سے ٹیک لگا کر وہ گہرے سانس لینے لگا۔ اچانک گلی کے دوسرے سرے پر ایک پولیس وین نمودار ہوئی۔ وہ عجلت میں گیٹ پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ پولیس سے بچنے کے چکر میں اسے خیال نہیں آیا کہ کوئی اندر ہوا تو وہ پکڑا جائے گا مگر اندر کوئی نہیں تھا۔ ایک چھوٹی سفید کار کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ایک بائیک تھی۔ پورچ کے ساتھ ایک گیلری تھی جو مکان کے پیچھے تک گئی تھی۔ سامنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گیلری میں آیا اور اس طرف کھلنے والی کھڑکیاں چیک کرنے لگا مگر وہ سب اندر سے بند تھیں۔ یہ سب شیشے اور المونیم پٹی کی بنی مضبوط کھڑکیاں تھیں جنہیں توڑنا مشکل تھا۔ اگر وہ کوشش کرتا تو بہت شور ہوتا۔ وہ عقب میں جنگل والی طرف آیا۔ یہاں اتفاق سے ایک کھڑکی کھلی مل گئی۔ اس نے پٹ سرکایا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران میں اسے خاصی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ مکان خالی ہے۔

مکان سچ مچ خالی تھا۔ اس کے مکین کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ یہ سوچ کر اندر آیا تھا کہ یہاں اسے مرہم پٹی کا سامان مل جائے۔ شاید کوئی دوا بھی کیونکہ اب زخم تکلیف دینے لگا تھا۔ وہ بیڈ روم میں داخل ہوا۔ یہاں بیڈ تو ڈبل تھا مگر ڈریسنگ ٹیبل زنانہ استعمال کی چیزوں سے خالی تھی۔ الماری میں مردانہ کپڑے تھے اور ایک ہی سائز کے تھے۔ اسی طرح نچلے حصے میں جوتے بھی ایک سائز کے تھے۔ بیڈ روم کے ساتھ بڑا سا باتھ روم تھا۔ وہ باہر آیا۔ بیڈ روم کے بعد لاؤنج تھا جس میں گیلری والی طرف اوپن کچن تھا جس کی کھڑکیاں اور ایک دروازہ گیلری کی طرف کھل رہے تھے۔ اس سے آگے نشست گاہ تھی جس کا دروازہ پورچ کی طرف کھل رہا تھا۔ لاؤنج کے دوسری طرف سے سیڑھی اوپر جا رہی تھی اور اس کے نیچے ایک سیڑھی تھی جو یقیناً تہ خانے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف جارہی تھی۔ مکان سے زیادہ وہ کسی کے ہونے یا نہ ہونے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پورا مکان دیکھنے کے بعد اسے اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ شدید سرد موسم میں بھی اسے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے کچن کے نل سے پانی لے کر اپنی پیاس بجھائی۔

وہ واپس بیڈ روم میں آیا اور باتھ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں بڑے سے شیشے کے پیچھے خانے میں طبی امداد کا مکمل سامان موجود تھا۔ ایک چھوٹا سا سرجیکل اوزاروں کا باکس بھی تھا۔ وہ حیران ہوا، یہاں رہنے والے شخص نے سب رکھا ہوا تھا۔ اس نے باتھ روم میں لگا ہوا انسٹنٹ الیکٹرک گیزر آن کیا اور مگ میں گرم پانی نکالا۔ پھر اس میں ڈیٹول ملا کر اس نے اپنی شرٹ اتاری۔ ایک لمحے کو وہ سردی سے لرز اٹھا۔ سردی کم کرنے کے لیے اس نے ٹب میں گرم پانی کھول دیا۔ اس سے بھاپ اٹھی تو باتھ روم گرم ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد سردی کا احساس کم ہوگیا۔ اس نے آئینے میں اپنے زخم کا جائزہ لیا مگر آئینہ بھاپ سے دھندلانے لگا۔ اس نے نل بند کیا اور ڈبے سے روئی نکال کر اسے بھگو کر زخم صاف کرنے لگا۔ اس بار ایسی تکلیف ہوئی کہ اس کی کراہیں نکل گئیں۔ مگر اصل تکلیف تو ابھی ہونی تھی۔ زخم صاف کر کے اس نے ایک چھوٹا آئینہ لیا پھر ایک چمٹی نما آلہ ڈیٹول والے پانی سے صاف کر کے اس نے اسے زخم میں داخل کیا۔ اس بار اذیت ایسی تھی کہ وہ چیخ اٹھا۔

مگر وہ رکا نہیں، شدید تکلیف کے باوجود وہ چمٹی سے زخم کرید کرید کر گولی تلاش کرتا رہا۔ اسے امید تھی کہ گولی زیادہ اندر نہیں ہوگی اور آسانی سے مل جائے گی۔ چمٹی لگنے سے زخم کھلا تو پھر خون بہنے لگا مگر وہ اس کی اور تکلیف کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتا رہا۔ بالآخر اس نے گولی تلاش کر لی۔ اسے گرفت میں لیا اور کھینچ کر نکالا تو ایسا درد ہوا کہ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ مگر بے ہوشی کا یہ دورانیہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ ہوش میں آیا تو فرش پر بیسن سے ٹیک لگائے پڑا تھا اور خون بہنا کم ہوگیا تھا۔ اس نے صاف روئی لے کر اسے زخم پر رکھ کر زخم دبایا۔ ایک منٹ میں روئی پوری طرح بھیگ گئی۔ وہ بار بار روئی بدلتا رہا حتیٰ کہ خون بہنا بند ہوگیا۔ اس دوران میں ٹب کا پانی بھی سرد ہو گیا تھا۔ باتھ روم ٹھنڈا ہونے سے بھی خون رکنے میں مدد ملی تھی۔ آخری بار زخم صاف کر کے اس نے دواؤں کے باکس سے زخم خشک کرنے والا جراثیم کش پاؤڈر نکال کر زخم میں بھرا اور اوپر سے چکنی پٹی رکھ کر اسے ٹیپ کر دیا۔

اس کا ٹراؤزر بھی خون سے بھیگ گیا تھا۔ اس نے ٹراؤزر بھی اتارا اور گرم پانی لے کر اچھی سے جسم صاف کیا۔ باہر آ کر اس نے الماری سے ایک ٹراؤزر اور گرم ٹی شرٹ نکال کر پہنی۔ دونوں چیزیں اس کے ناپ کی تھیں۔ اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کچن میں آیا۔ فریج میں دودھ کے بند ڈبے رکھے تھے۔ اس نے ایک ڈبا نکال کر گرم ہونے کے لیے رکھا۔ جب دودھ مناسب گرم ہوگیا تو اس میں تین کچے انڈے توڑ کر ڈالے اور پی گیا۔ یہ بہت طاقتور غذا تھی اور اسے اس وقت ایسی ہی غذا کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے دواؤں کے باکس کا جائزہ لیا۔ اس میں اینٹی بایوٹک کیپسول بھی تھے مگر اس نے انجکشن کو ترجیح دی۔ بازو پر پٹی باندھ کر اس نے نس میں انجکشن لگایا۔ دوسرا انجکشن پین کلر تھا۔ اس کے بعد وہ مکمل لے کر لیٹا تو اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔

☆☆☆

وہ بہت سے لوگ تھے، روتے سسکتے اور کراہتے لوگ... چیخوں میں نمایاں پسلیوں اور اندر دھنسی آنکھوں والے لوگ... وہ خود کو نوچ رہے تھے... کراہتی آوازوں میں کچھ مانگ رہے تھے... ان کے ہاتھ پیر اور چہرے زخمی تھے۔ وہ میل کی تہوں سے ڈھکے ہوئے تھے... بدبو کے بھبکے اڑاتے مگر انہیں اپنی گندگی اور بدبو کا احساس بھی نہیں تھا۔ وہ ان کے درمیان گھوم رہا تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھاتے مگر وہ پیچھے ہو جاتا۔ پھر اسے ایک نوعمر لڑکا گھٹنوں میں سر دیے نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکھڑا گیا، وہ بے چین ہوگیا۔ لڑکا اس کا بھائی تھا۔ اس دنیا میں اس کا واحد خون کا رشتہ۔ لڑکے نے منہ کھولا تو اچانک اس کے منہ سے خون ابل پڑا... وہ چلایا... بھائی...

"نہیں۔" اس نے چلا کر کہا۔

☆☆☆

"نہیں۔" اس کے منہ سے نکلا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اسے کسی قدر تاخیر سے یاد آیا کہ وہ کہاں؟ باہر دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ کل کا باقی دن اور گزشتہ رات سوتا رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ اکیس گھنٹے سویا تھا

اسے چرس کی طلب کیوں نہیں ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ گرم دودھ میں کچے انڈے ڈال کر پیٹ بھرا۔ پھر وہ باتھ روم میں آیا۔ اس نے پٹی ہٹا کر اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ اس میں درد تھا اور کناروں پر کسی قدر سوجن تھی مگر زخم خشک ہو رہا تھا اور اس کا منہ بھی چھوٹا ہوگیا تھا۔ پٹی پر رسنے والا خون لگ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ پاؤڈر چھڑک کر دوسری پٹی رکھی اور ٹیپ کر دیا۔

پھر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ زخم کی رفوگری کے دوران باتھ روم میں خاصی گندگی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا اور صفائی میں لگ گیا۔ اس نے اپنے کپڑے، خون آلود روئی، پٹیاں، خالی انجکشن اور سرنجیں ایک شاپر میں ڈالیں۔ پھر اس نے پانی اور ڈٹرجنٹ کی مدد سے باتھ روم صاف کیا۔ اس ذرا سی محنت سے وہ تھک گیا اور زخم میں درد ہونے لگا۔ وہ واپس کچن میں آیا۔ فریج میں ایک بڑی ڈبل روٹی اور مکھن کا ڈبا بھی تھا۔ اس نے چائے کا پانی رکھا۔ چائے کا سامان سامنے ہی رکھا تھا۔ جب تک چائے تیار ہوئی۔ اس نے ڈبل روٹی پر مکھن لگا کر کھایا۔ چائے تیار ہوئی تو وہ چائے کا مگ لے کر مکان کا معائنہ کرنے لگا۔ جس وقت وہ سونے کے لیے لیٹا تھا تو اسے خیال بھی نہیں آیا کہ گھر کا مالک کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ مگر جاگنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مالک مکان شہر میں نہیں تھا یا کسی کام سے ابھی تک باہر تھا۔

اس نے نشست گاہ والے دروازے سے باہر نکل کر دیکھا تو گیٹ کا چھوٹا دروازہ اندر سے بند تھا جبکہ بڑے والے گیٹ پر باہر تالا پڑا تھا۔ پورچ میں کار اور موٹر سائیکل کے علاوہ کسی تیسری سواری کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کار اور موٹر سائیکل مکان میں ہونے کا مطلب تھا کہ مالک شہر سے باہر ہی گیا ہوا تھا ورنہ ان میں سے کوئی سواری تو لے جاتا۔ وہ واپس اندر آیا۔ اس نے سوچ لیا اگر مالک اچانک بھی آیا تو وہ نشست گاہ سے اندر آئے گا اور وہ کچن والے دروازے سے گیلری میں آئے گا اور چھوٹے گیٹ سے باہر نکل جائے گا۔ اس نے مکان کا پھر معائنہ کیا۔ نشست گاہ اور لاؤنج سادہ فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ نشست گاہ میں فرش کے قالین کے ساتھ ایک فائیو سیٹر صوفہ اور گلاس ٹاپ سینٹر ٹیبل تھی۔ اسی کے ساتھ کی ایک سیٹھی تھی۔ لاؤنج میں، ہر افراد کے لیے طرح کچن

میں ضرورت کے چند ایک برتن تھے اور فریج میں صرف فوری استعمال کی خوراک تھی۔ اسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جسے باقاعدہ پکا کر کھا سکے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں ایک ہی شخص رہتا تھا اور وہ بھی زیادہ تر باہر سے کھانا کھاتا تھا۔ چائے پی کر اس نے اینٹی بایوٹک کیپسول اور دو پیناڈول لے لیں۔ اب انجکشن کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اس نے بیڈ روم کا معائنہ کیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ایک فوٹو فریم میں تصویر تھی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا، ایک نوجوان اور تقریباً اس کی جسامت کا شخص دو عورتوں کے درمیان کھڑا تھا۔ ایک بوڑھی تھی اور دوسری جوان تھی۔ تینوں کی شکلوں کی مماثلت بتا رہی تھی کہ وہ ایک خاندان تھے۔ مرد یقیناً ان عورتوں کا بیٹا اور بھائی تھا۔ شاید وہی اس مکان میں رہتا تھا مگر یہ عورتیں کہیں اور رہتی تھیں۔ تصویر کے پس منظر میں کھلا علاقہ اور دور پہاڑیاں بتا رہی تھیں کہ یہ شہر سے دور کوئی جگہ تھی۔ اس نے فریم اپنی جگہ رکھ کر دراڑوں کو چیک کیا۔ پہلی دراز میں ایک موبائل فون اور ایک مردانہ پرس بھی تھا۔

پرس میں تقریباً ڈھائی ہزار کی رقم تھی۔ ایک ڈیبٹ کارڈ بھی تھا لیکن اہم چیز ڈرائیونگ لائسنس اور شناختی کارڈ تھا۔ یہ دونوں چیزیں کسی عابد الرحمن کی تھیں۔ ان پر لگی تصویر اسی شخص کی تھی جو فوٹو فریم میں بھی تھا۔ اس نے پرس اور اس کی چیزیں واپس دراز میں ڈال دیں اور موبائل لے کر بیڈ پر دراز ہوگیا۔ یہ نیا ٹچ اسکرین موبائل تھا اور اس وقت بند تھا۔ اس نے آن کیا تو چند لمحے بعد اسکرین پر وال پیپر نمودار ہوا۔ یہ ایک لڑکی کی تصویر تھی جس نے انگلیوں میں ایک کارڈ تھوں دبا رکھا تھا اور حیران ہونے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ پس منظر سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی ریستوران میں ہے۔ لڑکی کے نقوش تیکھے اور رنگت سرخی مائل سفید تھی۔ اسے بہت خوب صورت تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اس میں ایک خاص کشش تھی۔ اسی اثنا میں ایس ایم ایس آنے لگے۔ اس نے پہلا ایس ایم ایس کھولا۔ اس پر نام عالی لکھا ہوا تھا۔ اس میں تحریر تھا۔ "عابد آپ کہاں ہیں... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

یہ ایس ایم ایس کل صبح کیا گیا تھا۔ پھر ایک ایس ایم ایس کل شام چھ بجے کا تھا اور اس میں بھی عابد کے بارے میں تشویش تھی۔ گویا اس مکان کا مالک کل صبح سے پہلے ہی کہیں گیا ہوا تھا اور اپنا موبائل گھر رکھ کر گیا تھا۔ صرف موبائل نہیں، وہ اپنا پرس اور تمام شناختی کاغذات بھی گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھوڑ کر گیا تھا۔ تیسرا ایس ایم ایس کسی فاریہ کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''بھائی آپ کہاں ہیں ہم بہت پریشان ہیں۔ کل کچھ لوگوں نے ہمارے گھر میں گھسنے کی کوشش کی جب ٹائیگر نے انہیں روکا تو انہوں نے اسے گولی مار کر زخمی کر دیا۔ بھائی، امی بہت رو رہی ہیں۔ آپ کا نمبر بند جا رہا ہے... پلیز ہم سے رابطہ کریں۔''

اس نے سوچا اور دوبارہ موبائل آف کر دیا۔ عالی کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کا عابد الرحمن سے ایسا رشتہ نہیں تھا کہ وہ اسے کسی خاص انداز میں مخاطب کرتی جبکہ فاریہ نے اسے بھائی کہا تھا۔ اس نے جو بتایا تھا، وہ عابد الرحمن کے لیے خاصا تشویش ناک ہونا چاہیے تھا مگر وہ خود غائب تھا۔ وہ لیٹا ہوا تھا اور لیٹے لیٹے ہی سو گیا۔ گزشتہ روز اس کا خاصا خون ضائع ہوا تھا اور یقیناً وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا ورنہ اتنی دیر تک سونے کے بعد دوبارہ نیند نہ آتی۔

☆☆☆

یہ پہاڑ پر بنا ہوا خوب صورت لیکن کسی قدر پرانے طرز کا مکان تھا۔ زمین چار کنال سے زیادہ تھی۔ اس پہاڑی قصبے میں یہ سب سے اوپر کی جگہ تھی۔ مکان کے سامنے والی زمین کسی قدر ڈھلان میں تھی لیکن دائیں طرف کی زمین زیادہ ڈھلان میں جا رہی تھی۔ اس پر سیب، انار، آڑو اور لوکاٹ کے درختوں پر مشتمل چھوٹا سا باغ تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں برآمدے کے ساتھ انگور کی بہت بڑی بیل تھی مگر اس وقت سردی کی وجہ سے سبزہ مرجھایا ہوا تھا۔ گیٹ سے دس گز کا ڈرائیوے تھا پھر مکان کا برآمدہ تھا۔ بائیں طرف ایک چھوٹی سی گلی تھی جو مکان کے پچھلے صحن تک جاتی تھی۔ برآمدے میں ایک بوڑھا شخص رائفل لیے موجود تھا۔ اندر کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی باہر آئی۔ وہ فاریہ تھی۔ اس نے آدمی سے کہا۔ ''رفیق بابا! ٹائیگر کا زخم کیسا ہے؟''

''میرے ساتھ آیئے بی بی۔'' رفیق نے کہا اور اسے لے کر عقبی صحن میں بنی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں آیا جہاں ڈوبرمین نسل کا کتا پرانی رضائی میں لپٹا لیٹا ہوا تھا۔ سر سے پاؤں تک ڈارک براؤن رنگ کے اس کتے کے کان نکیلے اور آنکھیں پیلی تھیں۔ اس کی پچھلی ٹانگ کے اوپری حصے میں کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا اور کتا اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ گزشتہ رات کچھ افراد نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹائیگر نے ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ البتہ وفادار کتا خود شدید زخمی ہو گیا تھا۔ نصف رات کے بعد کتے کے بھونکنے کی آواز نے سب کو جگا دیا تھا۔ رفیق اس کوٹھری کے ساتھ والے کمرے میں سوتا تھا۔ وہ گزشتہ تیس برس سے اس گھر میں ملازم چلا آ رہا تھا۔ وہ باہر آیا، اس کے پاس رائفل تھی اور اس نے چند ہوائی فائر کیے۔ اس لیے بھی حملہ آوروں نے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی ہو گی۔

فاریہ اور ماں کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ فاریہ اندر سے پوچھ رہی تھی لیکن رفیق نے اسے باہر آنے سے منع کیا تھا۔ جب رفیق نے تمام جگہوں کو دیکھ لیا تو اس نے فاریہ کو بتایا۔ وہ ٹائیگر کے زخمی ہونے کا سن کر بے قرار ہو گئی۔ وہ چھوٹا سا پلا تھا جب عابد اسے گھر میں لایا تھا اور چھ سال میں وہ گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ خاص طور سے فاریہ سے بہت ہلا ہوا تھا۔ فاریہ اور رفیق نے اس کے زخم کی صفائی کر کے مرہم لیپ کیا۔ رفیق نے کہا۔

''بی بی کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا اس کا زخم بھرنے میں۔''

یہ سن کر فاریہ فکر مند ہو گئی۔ ایک ہفتے پہلے عابد نے آخری بار رابطہ کیا تھا اور اس کے بعد اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ کوئی اور نمبر نہیں تھا اور نہ ایسا جاننے والا تھا جو اسے عابد کے بارے میں بتاتا۔ فاریہ کو یقین تھا کہ گھر میں گھسنے کی کوشش کرنے والے قادر حیات کے آدمی تھے۔ قادر حیات ان کا رشتے دار تھا۔ وہ فاریہ کے باپ عبید الرحمن کا چچازاد بھائی تھا اور اس کی زمینیں ان کے گھر سے ملی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے گھر اور زمین پر دعویٰ تو کئی سالوں سے کر رہا تھا مگر ایک سال پہلے اس نے کیس بھی کر دیا تھا۔ اس نے کچھ کچے پکے ثبوت بھی بنا لیے تھے اور ان کے بل پر کیس آگے گھسیٹ رہا تھا۔ عابد نے فاریہ اور ماں کو یقین دلایا تھا کہ وہ کسی صورت کیس نہیں جیت سکتا۔ اس طرح وہ ان پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ قادر حیات نے انہیں قیمت کی پیشکش بھی کی تھی کہ وہ لیں اور زمین و مکان اس کے حوالے کر دیں۔ قیمت اگرچہ اچھی تھی مگر ان کے مکان اور زمین کی ویلیو سے کم تھی۔ جب سے ان کا قصبہ مرکزی شاہراہ پر آیا تھا، یہاں زمین اور جائدادوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ کیونکہ ان کی زمین سب سے اوپر تھی اس لیے اس کی قیمت بھی سب سے زیادہ تھی۔

قادر حیات مکار اور موقع پرست تھا۔ اس نے پہلے جوڑ توڑ کر کے اپنے سگے بہن بھائیوں کے حصے پر قبضہ کیا اور قصبے کا سب سے بڑا لینڈ لارڈ بن گیا۔ کیونکہ اس کی زمین ان کے مکان۔

تھی۔ پھر یہ سب سے اوپر تھی اور وہ اس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ عدالت میں کیس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں دوسرے طریقوں سے بھی ہراساں کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی راتوں کو نامعلوم افراد نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی یا ان کے گھر پر فائرنگ کی گئی تھی۔ فاریہ کا رشتہ اس کی کم عمری میں اس کے ماموں کے گھر طے ہو گیا تھا مگر اچانک ہی ان کی طرف سے انکار ہو گیا اور پھر پتا چلا کہ فاریہ کے ماموں زاد کی شادی قادر حیات کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔ گویا اس کے پس پشت بھی قادر حیات تھا۔ فاریہ کو رفیع اللہ اچھا لگتا تھا مگر اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ اسے مسترد کیے جانے کا دکھ تھا مگر جلد اس نے خود کو سنبھال لیا

☆☆☆

وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان تھا اور کرکٹ کے میدان میں بولنگ کرا رہا تھا۔ لمبا اور چھریرا جسم جو فاسٹ بولنگ کے لیے موزوں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مخالف ٹیم کی بیٹنگ کو تہس نہس کر دیا۔ پھر جیسے ہی آخری کھلاڑی کی وکٹیں ہوائیں بکھریں، اس کی ٹیم کے کھلاڑی اس سے لپٹ گئے۔ وہ بھی دوڑتا ہوا جا کر ان سے لپٹ گیا۔ اس نے جوش سے کہا۔ ''ہم جیت گئے۔''

مگر پھر منظر بدلا۔ وہی نوجوان کفن میں لپٹا ہوا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اس کا صحت مند جسم گل گیا تھا۔ اسے کوئی بیماری نہیں تھی، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا پھر بھی وہ مر گیا۔ اس ملک کے بے شمار لاکھوں نوجوانوں کی طرح جو بغیر کسی بیماری کسی حادثے کے مرتے رہے ہیں اور مر رہے ہیں اور آئندہ بھی مرتے رہیں گے۔ وہ اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی مر گیا ہو۔ وہ مرا نہیں تھا، وہ ہار گیا تھا۔ اس نے نوجوان کے سرد ماتھے کو چوما اور آہستہ سے بولا۔ ''ہم ہار گئے... ہاں، ہم ہار گئے ہیں۔''

وہ رونے لگا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ ویسے بھی سردیوں کے دن تھے، پانچ بجے تک سورج غروب ہو جاتا تھا۔ اسے اپنی آنکھیں نم محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے چھو کر دیکھا نمی سچ مچ تھی۔ وہ اٹھا تو پہلی بار اسے نشے کی طلب محسوس ہوئی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور منہ کا ذائقہ خراب تھا۔ وہ باتھ روم.... آیا۔ ضرورت سے فارغ ہو کر اس نے دانت صاف کیے۔ ت صاف کیے

تھے۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور بولا۔ ''بیکار میں محنت کر رہے ہو، کل یا پرسوں تک تم ان چیزوں سے پھر بے نیاز ہو جاؤ گے۔''

اس نے منہ ہاتھ بھی دھویا۔ ٹھنڈے پانی نے اسے چوکس کر دیا تھا اور وہ چرس کی طلب نظر انداز کر کے کچن میں آیا۔ اس نے چائے تیار کی اور پھر انڈوں اور پنیر کی مدد سے سینڈوچز تیار کرنے میں لگ گیا۔ ڈبل روٹی اتنی بڑی تھی کہ آرام سے کل تک بھی چل سکتی تھی، بشرطیکہ اسے کل تک یہاں رہنے کا موقع ملتا۔ چائے پینے سے جسم کے درد میں کمی آئی۔ اس نے دو سینڈوچز لیے تھے کہ اس کی بھوک مر گئی۔ باقی رکھ کر وہ واپس کمرے میں آیا اور اس بار اس نے الماری کی تلاشی لی۔ نکالا کچھ نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اپنی جگہ سے ہٹائی مگر ایک ایک جگہ دیکھ لی۔ الماری کے اندر ایک لاکر تھا اور یہ وہاں کا بنا ہوا تھا۔ اسے کھولنا یا توڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے چابیاں تلاش کیں مگر وہاں کسی قسم کی کوئی چابی نہیں ملی۔ حد یہ کہ کار اور موٹر سائیکل کی چابی بھی نہیں تھی۔ جبکہ ان دونوں چیزوں کی چابیاں ہونی چاہیے تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر نشست گاہ میں آیا۔ وہاں اسے کی ہولڈر پر کار اور موٹر سائیکل کی چابیاں مل گئیں۔

اسے کسی چیز کی تلاش نہیں تھی، وہ ہونے والی طلب سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ سیڑھی سے نیچے آیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا بیسمنٹ تھا جس میں ایکسرسائز کے کچھ جدید آلات لگے ہوئے تھے۔ ریکس میں کچھ بیکار اور کم استعمال ہونے والا سامان رکھا تھا۔ اس نے دلچسپی سے ایکسرسائز کی مشینیں دیکھیں۔ ایک زمانے میں وہ خود باقاعدگی سے ایکسرسائز کرتا تھا۔ اور سگریٹ بھی بہت کم پیتا تھا۔ یہی وجہ تھی اس کا اسٹیمنا بہت اچھا تھا مگر اب چرس نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ یہاں ٹی وی یا تفریح کے لیے کوئی اور چیز نہیں تھی۔ بیڈ روم میں ایک ریک پر کچھ کتابیں اور رسائل رکھے تھے۔ وہ انہیں دیکھنے لگا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طلب بڑھ رہی تھی۔ جب طلب حد سے بڑھنے لگی تو اس نے دواؤں کے باکس میں دیکھا شاید کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے وہ طلب کم کر سکے مگر اس میں ایسی کوئی دوا نہیں تھی۔ تکلیف ہوئی تو وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے سر تک کمبل اوڑھ لیا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا جیسے اسے جاڑا چڑھا ہو لیکن ساتھ اس کے مساموں سے پسینا بہہ رہا تھا۔ وہ تکلیف برداشت کرتا رہا پھر کسی وقت اس پر غشی طاری ہو گئی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

عالیہ کی ماں اسپتال میں داخل ہوگئی تھی۔ آج اسے پہلی بار اکیلے گھر میں رہنا تھا۔ اگرچہ وہ ماں کے ساتھ اسپتال میں رک سکتی تھی کیونکہ اسے الگ کمرا ملا تھا اور اس میں ایک تیمادار کے رکنے کی گنجائش بھی تھی۔ مگر اسے گھر سے آپریشن کے لیے رقم لینا تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگلے دن آپریشن کی پوری رقم جمع کرادے تاکہ آپریشن میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ یہ سیمی پرائیویٹ اسپتال تھا۔ عام فیسیں اتنی زیادہ تھیں لیکن خاص امراض اور آپریشن کی صورت میں اچھے خاصے اخراجات ہو جاتے تھے۔ اس آپریشن کے بھی ڈیڑھ لاکھ روپے لگ رہے تھے۔ نصف رقم اس نے دفتر سے ایڈوانس کی صورت میں لی تھی اور یہ اس کی تنخواہ سے کٹتی۔ باقی رقم عابد نے اسے دی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ماں نے اس کی شادی کے لیے جو زیور بنایا ہے، وہ فروخت کردے۔ یہ تین تولے کے قریب تھا اور اس سے اتنی رقم تو مل جاتی۔ مگر عابد نے بہت اصرار کرکے اسے یہ رقم دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں ساری رقم نہیں کرسکا۔''

''ایسا نہ کہیں... آپ نے اتنا کیا ہے یہ بھی بہت ہے... اور عابد اس سے زیادہ قیمتی وہ ساتھ اور سہارا ہے جو آپ نے اس کڑے وقت مجھے اور امی کو دیا ہے۔''

مگر اب عابد ایک ہفتے سے غائب تھا اور وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ وہ مخصوص بس اسٹاپ پر اتری۔ یہ اس کے گھر سے خاصے فاصلے پر تھا مگر اس کا بڑا حصہ بازار سے گزرتا تھا اور یہاں رات دس گیارہ بجے تک چہل پہل رہتی تھی جبکہ اس کے گھر کے قریب والا اسٹاپ رہائشی علاقے کے ساتھ تھا اور درمیان میں پارک بھی آتا تھا۔ یہاں شام کے بعد سناٹا چھا جاتا تھا۔ سردیوں میں سورج ویسے بھی جلد غروب ہو جاتا تھا اور وہ عام طور سے تاریکی میں گھر پہنچتی تھی۔ اسے عام حالات میں بھی بہت ڈر لگتا تھا مگر جب سے لفنگوں والا واقعہ پیش آیا تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ اس راستے سے نہیں گزرے گی۔ بے شک دس منٹ لیٹ گھر پہنچے اور مزید تھک جائے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ سکون میں رہتی تھی۔ لیکن اس روز وہ جب گھر کی طرف روانہ ہوئی تو سامنے اس نے اسی لفنگے کو دیکھا جسے اس نے تھپڑ مارا تھا۔ وہ اسے معنی خیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

عالیہ گھبرا گئی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ چاروں لفنگے اس کے پیچھے آرہے تھے۔ یہاں رونق تھی اور لوگ آجا رہے تھے اس لیے انہوں نے قریب آنے یا اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عالیہ کو خوف آرہا تھا کیونکہ بازار ختم ہونے کے بعد رہائشی علاقہ تھا اور وہاں اس وقت سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ عالیہ نے اپنی رفتار مزید تیز کردی۔ جلد بازار کا حصہ ختم ہوگیا اور اب رہائشی علاقہ تھا۔ جیسے ہی ذرا سناٹا اور ویرانی ہوئی، وہ چاروں پاس آنے لگے۔ اب وہ بول بھی رہے تھے۔ بہ ظاہر وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن درحقیقت اسے سنا رہے تھے اور ان کی گفتگو ناقابلِ بیان تھی۔ عالیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ رونا شروع کردے۔ اس نے کبھی خود کو اتنا بے بس اور دل گرفتہ محسوس نہیں کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ ابھی اس کا گھر دو گلی دور تھا۔ اچانک اسے آواز سنائی دی۔

''آج اسے جانے نہیں دینا ہے۔''

یہ سنتے ہی وہ بھاگنے لگی۔ خوش قسمتی میں سردی کی وجہ سے وہ فلیٹ ایڑی والے چمپ شوز پہنے ہوئے تھی اور اسے بھاگنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے بھاگتے ہی وہ چاروں بھی اس کے پیچھے لپکے۔ مارے خوف اور گھبراہٹ کے اسے شور کرنے کا خیال نہیں آیا ورنہ یہ چھوٹے گھروں کا علاقہ تھا۔ اس کا شور سن کر ہی اہلِ محلہ نکل آتے۔ اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے پرس سے گیٹ کی چابی نکال لی۔ گیٹ لاک تھا جو کھینچنے سے بند ہو جاتا تھا اور باہر سے چابی سے کھلتا تھا۔ وہ چاروں رفتہ رفتہ اس کے پاس آتے جا رہے تھے۔ عالیہ کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اگر وہ کوشش کرکے خود پر قابو نہ رکھتی تو شاید گر ہی جاتی۔ گیٹ پر آتے ہی اس نے چابی لگانے کی کوشش کی مگر ہاتھ کانپنے کی وجہ سے پہلی کوشش ناکام رہی۔ وہ دیوانہ وار تالے کے سوراخ میں چابی ڈالنا چاہ رہی تھی اور وہ چاروں قریب آرہے تھے۔ اس نے ان کی طرف دیکھا وہ مشکل سے دس قدم دور تھے اور طوفان کی طرح آرہے تھے۔ پھر جیسے چابی خود ہی خود لاک میں چلی گئی۔ وہ اسے گھماتے اور دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آئی اور پھرتی سے اسے واپس بند کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بند ہوتا، کوئی باہر دروازے سے ٹکرایا تو عالیہ نے پہلی بار چیخ ماری۔ اس کی چیخ نے اثر کیا اور دروازے پر دباؤ ختم ہوگیا۔ اس نے دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی بھی لگا دی پھر وہ تیزی سے اندر والے حصے کی طرف بڑھی۔ جب وہ اندر کا دروازہ کھول رہی تھی تو دروازے کے اوپر سے ایک سر نمودار ہوا۔ اس نے عجلت میں نشست گاہ کا دروازہ کھولا اور ا

بُری طرح لرز رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو نیا دن طلوع ہوگیا تھا۔ اسے ایک بار پھر شدید بھوک لگ رہی تھی اور حیرت انگیز طور پر ذہن اور جسم ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ نشے کی طلب اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہوگئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن میں آیا۔ گزشتہ رات کے بچے ہوئے سینڈوچز کھائے لیکن جب ان سے تسلی نہیں ہوئی تو اس نے مزید انڈے ابالے اور کچھ تلے پھر انہیں ڈبل روٹی سینک کر ان سے کھایا۔ بھرپور ناشتے کے بعد دو کپ چائے پی کر وہ خود کو آسودہ محسوس کرنے لگا۔ جب وہ نشے کا عادی نہیں تھا تو اس کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ آج بہت عرصے بعد اس نے پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ اس کا موڈ اچھا ہوگیا تھا۔ اس نے کچن صاف کیا۔ گندے برتن دھوئے۔ ان کاموں سے فارغ ہوکر اس نے اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ دواؤں، اچھی، سادہ خوراک اور مسلسل آرام سے زخم تقریباً بھرنے کی پوزیشن میں آگیا تھا۔ اس نے چل پھر کر دیکھا۔ اسے تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں عابد الرحمن کا شکر گزار تھا۔ اگر اس کا خالی مکان نہ ملتا تو شاید وہ اس وقت کسی اسپتال سے ہوکر حوالات میں پڑا ہوتا اور پولیس اس پر نہ جانے کون کون سے کیس ڈال چکی ہوتی۔ اب وہ اس قابل تھا کہ یہاں سے چلا بھی جاتا تو اسے فرق نہ پڑتا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے جاتے ہوئے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائے گا، سوائے اس خوراک کے جو وہ استعمال کرچکا تھا اور اس ایک جوڑے کے جو اس نے پہن لیا تھا۔ فی الحال وہ اسی طرح عابد الرحمن کا شکریہ ادا کرسکتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ رات کو یہاں سے نکلے گا۔ دن میں خطرہ تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ رات میں وہ زیادہ آسانی سے یہاں سے نکل سکتا تھا۔ البتہ اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ اس نے ایک بار اور دوا لی۔ اس کے بعد شاید اسے ضرورت نہ پڑتی۔ چرس کی طلب ختم ہونے کے بعد وہ خود کو گندا محسوس کر رہا تھا ورنہ نشہ پاکی ناپاکی کا احساس سب سے پہلے ختم کرتا ہے۔ وہ واش روم میں آیا، وہاں شیونگ کا مکمل سامان تھا۔ اس نے پہلے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اس کے سر کے بال بے ہنگم لمبے ہو رہے تھے۔ سامان میں سر پر پھیرنے والی مشین بھی تھی۔ اس نے اس کی مدد سے اپنے لمبے بالوں کا صفایا اور انہیں بالکل مختصر کر دیا۔

سامنے کھڑا تھا۔ حیران کن طور پر وہ چھوٹے بالوں میں بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے پر حالات کی سختی رقم تھی، اس کے باوجود وہ ٹھیک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے زخم سے نیچے کا حصہ دھویا اور اوپری جسم اسفنج پر صابن لگا کر صاف کیا اور آخر میں بیسن پر جھک کر سر دھولیا۔ اب اس کے سر پر معمولی سے بال تھے۔ صاف ہوکر اس نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ تھک گیا تھا اس لیے وہ واپس آکر لیٹ گیا۔ تھکن کے باوجود وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے موبائل اٹھا لیا۔ اسے آن کیا تو ایک بار پھر کئی ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس بار بھی ایس ایم ایس ان دو خواتین کی طرف سے تھے۔ عالی نامی لڑکی نے لکھا تھا۔

''پلیز عابد! آپ کہاں ہیں؟ میں خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی ہوں۔ پرسوں امی کا آپریشن ہے۔ عابد! وہی لفنگے کل پھر دکھائی دیے تھے اور انہوں نے میرا پیچھا بھی کیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میں ان سے کس طرح بچی۔ اب اکیلے گھر جاتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اس سے زیادہ ڈر مجھے اکیلے رہنے سے لگتا ہے۔ عابد! مجھ سے رابطہ کریں۔ آپ کی عالی۔''

دوسرا ایس ایم ایس بھی اسی کا تھا۔ ''میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز اگر مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہے تو مجھے معاف کردیں۔ اگر آپ رابطہ کرنا نہیں چاہ رہے تو ٹھیک ہے مگر ایک بار مجھے ایس ایم ایس کرکے بتا تو دیں... عالی۔''

تین ایس ایم ایس فاریہ کی جانب سے تھے اور اس نے حالات کی مزید خرابی کا ذکر کیا تھا۔ ان کا کتا ٹائیگر زخم کی وجہ سے ناکارہ تھا۔ گھر کا واحد ملازم رفیق پُراسرار طور پر غائب تھا۔ فاریہ کے پیغامات سے لگ رہا تھا کہ خطرہ ان کے سر پر آگیا ہے۔ وہ حیران تھا کہ جس شخص سے متعلقہ لوگوں کو اتنے سنگین حالات اور مسائل کا سامنا تھا، وہ یوں کہاں چلا گیا تھا کہ اپنا موبائل بند کرکے گھر چھوڑ گیا تھا۔ حد یہ کہ اپنا پرس بھی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بیڈروم کی مکمل تلاشی لی۔ ہر جگہ دیکھا، حد یہ کہ بیڈ کے نیچے بھی دیکھ لیا مگر اسے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے پتا چلے کہ عابد الرحمن کیا کام کرتا تھا۔ واحد جگہ جہاں وہ نہیں دیکھ سکتا تھا، الماری کا لاکر تھا۔ یہ خاصے بھاری گیج کی فولادی چادر سے بنا ہوا تھا اور اس کا لاک بھی یقیناً اچھی قسم کا تھا۔ اگر وہ عام سا لاک ہوتا تب بھی وہ اسے نہیں کھول سکتا تھا۔ اسے یہ فن نہیں آتا تھا۔ جب وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا تو اسے خیال آیا کہ وہ تو جلد

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہاں سے چلا جائے گا، تب وہ اتنی کوشش کیوں کر رہا تھا؟

تین بجے اسے پھر بھوک لگی۔ اس نے بچی کھچی ڈبل روٹی اور مکھن سے پیٹ بھرا کیونکہ انڈے ختم ہو چکے تھے۔ ہاں، دودھ کے کئی پیکٹ تھے مگر اسے دودھ سے رغبت نہیں تھی۔ پانچ بجے اندھیرا ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سات بجے یہاں سے نکلے گا۔ اس وقت تک سردی کی شدت سے گلیاں بھی سنسان ہو جائیں گی اور دھند بھی ہو جائے گی، اسے کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔ اس کے جسم پر موجود لباس گرم تھا مگر یہ باہر کی سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے الماری کھولی اور اس میں موجود لیدر کی جیکٹ نکال کر پہنی پھر اس نے جوتوں میں سے جوگرز کا انتخاب کیا۔ گرم موزے نکالے۔ لباس اور جیکٹ کی طرح جوتے بھی اسے فٹ آئے تھے۔ سات بجے وہ جانے کے لیے لاؤنج میں آیا۔ اس نے کچن والا دروازہ کھولا۔ جس کھڑکی سے وہ آیا تھا۔ اسے پہلے ہی اندر سے بند کر چکا تھا۔ اس دروازے کو بھی لاک لگا دیتا تو ایک بار بند ہونے کے بعد اسے باہر سے چابی کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

اس نے اپنے اتارے ہوئے لباس اور دوسرے کچرے والا شاپر ساتھ لے لیا تھا۔ وہ باہر نکل کر دروازہ بند کرنے جا رہا تھا کہ بیڈ روم سے موبائل کی بیل سنائی دی۔ وہ رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟ دوپہر میں موبائل آن کرنے کے بعد وہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ بیڈ روم میں آ کر موبائل دیکھا۔ اس پر عالی کی کال آ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے موبائل دیکھا بیل بجنے بند ہو گئی۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ موبائل بند کرنے جا رہا تھا کہ دوبارہ بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کرنے والا بٹن دبایا اور کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے عالی روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''سوری عابد... آئی ایم رئیلی سوری... آپ جانتے ہیں اس دنیا میں امی کے بعد اگر کوئی مجھے اپنا لگا تو وہ آپ ہیں... اسی لیے میں نے آپ سے شاید زیادہ ہی توقع لگا لی... مگر آپ مجھ سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتے۔ اب میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی... ایک بار پھر سوری۔'' اس نے کہتے ہوئے لائن کاٹ دی۔ وہ ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بات رہ رہ کر آ رہی تھی۔ وہ ہچکچایا لیکن پھر اس نے عالی کے نمبر پر ایس ایم ایس کیا۔

''عالی! میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔ تم سے بات نہیں کر سکتا اور نہ آ کر مل سکتا ہوں۔ میں شہر سے باہر ہوں لیکن میں اپنے ایک دوست کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم اس پر اعتماد کر سکتی ہو۔ اس کا نام بلال مصطفیٰ ہے۔ وہ اپنا نام بتائے گا اور حوالہ دے گا۔ یہ بتاؤ تمہاری امی کس اسپتال میں داخل ہیں۔ وہ وہیں آئے گا اور پلیز اب مجھے کال مت کرنا۔ ایس ایم ایس کرنا۔''

اس نے ایس ایم ایس بھیج دیا اور فوراً ہی عالی کی طرف سے جواب آیا۔ ''شکر ہے آپ ٹھیک ہیں... امی اسی اسپتال میں ہیں آپ جانتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے جوابی ایس ایم ایس کیا۔ ''لیکن اسپتال کا نام ذہن سے نکل گیا ہے۔ میں اپنے دوست کو کیا بتاؤں گا۔''

عالی نے کچھ دیر بعد اسپتال کا نام بھیج دیا۔ اس نے اٹھ کر دراز سے عابد کا پرس نکالا اور ایک بار پھر دل ہی دل میں اس سے معذرت کی۔ اس میں موجود ساری رقم نکال کر جیب میں رکھی۔ موٹر سائیکل کی چابی لی اور کچن والے دروازے سے باہر آیا لیکن اس بار اس نے اسے اندر سے لاک نہیں کیا۔ حسب توقع باہر گلی سنسان تھی۔ اگرچہ دھند بہت معمولی سی تھی مگر کسی نے اسے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ چھوٹے گیٹ سے باہر آیا اور اسے کھینچ کر بند کر لیا۔ اس میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا۔ اس نے موبائل بھی ساتھ رکھا اور روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایس ایم ایس پر تصدیق کر لی کہ عالی اسپتال میں ہی ہے۔ اس نے راستے میں کچرے کا شاپر ایک کچرے دان میں ڈالا۔ اسپتال اس کا دیکھا ہوا تھا، وہ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ ریسپشن سے اسے کسی قدر مشکل سے سہی لیکن عالی کی ماں کے کمرے کا پتا چل گیا۔ وہ کمرے تک پہنچا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ عالیہ نے کھولا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''بلال مصطفیٰ۔'' اس نے تعارف کرایا۔ ''مجھے عابد نے بھیجا ہے۔''

''اوہ... اندر آیئے۔'' اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ عالیہ کی ماں گہری نیند میں تھی۔ اس نے بتایا۔ ''میں امی کے ساتھ ہی رکی ہوں مگر کل امی کا آپریشن ہے اور مجھے لازمی گھر جانا ہے۔''

''کیوں؟''

''آپریشن کے لیے رقم گھر میں ہے۔ میں نے ابھی صرف آدھی رقم جمع کرائی ہے، جب تک پوری رقم جمع نہیں ہو گی آپریشن نہیں [illegible]''

''مسئلہ

وہ ہچکچائی۔ ''کچھ عرصے پہلے کچھ بدمعاش میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور عابد نے مجھے بچایا تھا۔ وہ غائب ہو گئے تھے لیکن پچھلے چند دن سے وہ دوبارہ دکھائی دے رہے ہیں۔ کل رات میں جب گھر جا رہی تھی تو وہ میرے پیچھے لگ گئے۔ میں نے راستہ تقریباً بھاگ کر طے کیا۔ سردی کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ میں گھر میں بھی ساری رات جاگتی اور ڈرتی رہی۔ کئی بار مجھے لگا جیسے کوئی باہر والا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''جب تم گھر گئی تھیں تو رقم کیوں نہیں لائیں؟''

''میں بھول گئی تھی اور جب میں گھر سے نکلی تو وہ لوگ باہر موجود تھے۔ انہوں نے پھر میرا پیچھا کیا اور میں ڈر کے مارے واپس نہیں گئی۔ اب بھی نہیں جا سکتی اور مجھے ہر صورت رقم لانی ہے۔ عابد کے سوا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس سے میں مدد مانگ سکوں۔ میں مسلسل ان سے کونٹیکٹ کی کوشش کرتی رہی مگر وہ جواب نہیں دے رہے تھے۔'' کہتے ہوئے عالیہ روہانسی ہونے لگی۔

''وہ سچ مچ مجبور ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور عالیہ کی ماں کی طرف دیکھا۔ ''کیا انہیں مسکن دوا دی گئی ہے؟''

عالیہ نے سر ہلایا۔ ''ان کے اعصاب پُرسکون رکھنے کے لیے ڈاکٹرز ابھی سے مسکن دوا دے رہے ہیں۔ ورنہ بی پی شوٹ کر گیا تو آپریشن نہیں ہو گا۔''

اس نے سوچا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، چلو میرے ساتھ... ہم ابھی تمہارے گھر سے رقم لے آتے ہیں۔''

عالی کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ اگر عابد کا حوالہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کسی اجنبی پر اس طرح اعتبار نہ کرتی اور عام حالات میں تو بائل نہ کرتی لیکن اس وقت اس کی ماں کی زندگی اور صحت کا سوال تھا۔ عالیہ نے شال پہن رکھی تھی۔ موٹر سائیکل دیکھ کر وہ چونکی۔ ''یہ تو عابد کی بائیک ہے۔''

''ہاں لیکن ابھی میرے پاس ہے۔'' اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ عالیہ جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے گرم شال اچھی طرح لپیٹ لی تھی۔ اس نے عالیہ سے اس کے گھر کا پتا پوچھا اور موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ دھند کسی قدر بڑھی ہوئی تھی لیکن تیز اسٹریٹ لائٹس کی وجہ سے سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے رفتار مناسب رکھی۔ عالیہ نے پوچھا۔ ''آپ عابد کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں؟''

''[illegible]

''عابد کہاں کام کرتے ہیں؟'' عالیہ کا یہ سوال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''کیا عابد نے تمہیں نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' عالیہ شرمندہ ہو گئی۔ ''میں نے بھی کبھی نہیں پوچھا۔''

وہ خاموش ہو گیا اور عالیہ نے بھی دوبارہ نہیں پوچھا۔ کچھ دیر میں وہ عالیہ کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے کہا۔ ''اپنا چہرہ شال سے چھپا لو، اگر کوئی نگرانی کر رہا ہو تو تمہیں دیکھ لے گا۔ گھر بتانا، میں اس سے ذرا آگے روکوں گا۔''

''ٹھیک ہے... اس گلی میں مڑ جائیں۔'' عالیہ نے کہا۔ ''اسے کراس کرنے پر میرے گھر والی گلی ہے... وہ چھوٹا سا براؤن گیٹ ہے جس کے ساتھ پھولوں کی بیل چڑھی ہے...''

اس نے موٹر سائیکل اس گیٹ سے دو گھر آگے روکی اور آہستہ سے بولا۔ ''اتر کر یوں دروازے کی طرف جاؤ جیسے ہم اسی گھر میں آئے ہیں۔''

عالیہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں وہ آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا مگر اسے دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے عالیہ کو آواز دی۔ ''ہری اَپ... اپنے گھر چلو۔''

عالیہ نے چابی سے گیٹ کا تالا کھولا۔ وہ اس کے ساتھ تھا۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا جس کے ایک طرف چھوٹا سا باتھ روم تھا پھر ایک کمرا تھا۔ عالیہ اب کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی کہ اچانک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک شخص پستول سامنے کیے نمودار ہوا۔ اور خود کار انداز میں حرکت میں آیا۔ اس کی لات گھومی اور پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے کراہ کر گالی دی وہ نبیل تھا۔ اس نے گھومتے ہوئے توازن سے دوبارہ نبیل کے سینے پر لات ماری، وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے آنے والے عاطف سے ٹکرایا اور دونوں باتھ روم میں چلے گئے پھر دوبارہ آگے آئے۔ اس نے فرش پر قلابازی کھائی اور اس بار اس کے دونوں پاؤں رد عمل میں پھر نبیل کے سینے پر بہت قوت سے لگے۔ گھومتی ٹانگوں میں بہت زور تھا۔ نبیل کے حلق سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور وہ دوبارہ عاطف کو لیتے ہوئے باتھ روم میں جا گرا۔ اس بار وہ زیادہ دور گئے تھے۔ جب تک وہ اٹھتے، اس نے فرش سے اٹھتے ہوئے باتھ روم کا دروازے کھینچ کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ یہ پلائی کے بجائے دھات کا بنا ہوا دروازہ تھا۔ فوراً ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش شروع ہوگئی مگر یہ آسانی سے کھلنے والا دروازہ نہیں تھا اور اسے توڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے نیچے گرا پستول اٹھایا اور ہکا بکا کھڑی عالیہ سے کہا۔

"جلدی کرو... رقم لو اور یہاں سے نکلو... ان کے اور ساتھی بھی ہوسکتے ہیں۔"

عالیہ کو بے ساختہ عابد یاد آیا۔ اس نے بھی اسی پھرتی اور مہارت سے اسے چھیڑنے والے لفنگوں کی مرمت کی تھی۔ اس کی آواز پر وہ چونکی اور اندر لپکی۔ دوسرا کمرا جوان کا بیڈروم بھی تھا، اس میں موجود الماری سے اس نے نہ صرف آپریشن کی رقم بلکہ ایک چھوٹا چرمی بیگ بھی اٹھالیا۔ اس میں ان کی جمع پونجی تھی۔ اس کے لیے کچھ زیور اور رقم تھی۔ عالیہ کے اندر جانے کے بعد اس نے اپنے دکھ جانے والے زخم پر ہاتھ رکھا۔ جسمانی حرکات نے شاید زخم ہرا کر دیا تھا مگر تکلیف ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ عالیہ باہر آئی اور دونوں گھر سے نکل آئے۔ عالیہ نے اندر اور باہر کے دروازے دوبارہ لاک کر دیے اور اب پریشان تھی۔

"میرے اللہ... اب کیا ہوگا؟ وہ تو اندر ہی ہیں۔"

"فکر مت کرو، انہیں بعد میں دیکھا جائے گا۔" اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "جلدی کرو۔"

جیسے ہی عالیہ پیچھے بیٹھی، اس نے موٹر سائیکل دوڑا دی۔ جیسے ہی وہ گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آئے، ایک بائیک اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے ان کے پیچھے آنے لگی۔ وہ بہت چوکنا تھا۔ اس نے فوری محسوس کر لیا اور رفتار بڑھاتے ہوئے عالیہ سے کہا۔ "سنبھل کر بیٹھو، یہ بائیک پیچھے آرہی ہے۔"

عالیہ نے جھجک اور شرم بالائے طاق رکھ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ موٹر سائیکل کا پچھلا اسٹینڈ نہیں تھا۔ وہ اسی طرح بچی رہ سکتی تھی۔ پیچھے آنے والی بائیک طاقتور انجن کی تھی اور وہ تیزی سے قریب آرہی تھی۔ جبکہ عابد کی موٹر سائیکل کا انجن سوسی سی کا تھا اور یہ ایک حد سے زیادہ تیزی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اچانک بائیک کی طرف سے فائرنگ کی گئی اور گولیاں ان کے آس پاس سے گزر گئیں۔ فائر کسی پستول یا ریوالور سے ہوئے تھے۔ عالیہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں، میں ڈر گئی تھی۔" عالیہ روہانسے لہجے میں بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے یہ اس حد تک بڑھ گئے؟"

"سنبھل کر بیٹھنا۔" اس نے کہا اور موٹر سائیکل اچانک ہی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ تعاقب میں آنے والی بائیک بھی پیچھے آئی۔ یہ بھی ڈبل روڈ تھا۔ اس سے پہلے وہ مین روڈ پر تھے اور وہاں صرف موڑ سے دوسری سڑک پر جاسکتے تھے۔ درمیانی رکاوٹ بہت بڑی تھی لیکن یہاں گرین بیلٹ ایسی تھی جس سے موٹر سائیکل دوسری طرف جاسکتی تھی۔ اس نے اچانک موٹر سائیکل گھمائی اور دوسری طرف چلا گیا۔ بائیک کی طرف سے پھر فائرنگ ہوئی اور اس بار بھی وہ بال بال بچے۔ دوسری طرف جاتے ہی اس نے بریک لگا کر موٹر سائیکل روکی اور پستول دوسری سڑک پر تیزی سے نزدیک آتی بائیک کی طرف کر کے لگاتار تین فائر کیے۔ ایک گولی بائیک چلانے والے کو لگی اور وہ لہراتی ہوئی گرین بیلٹ کے درخت سے ٹکرائی۔ ایک دھماکا ہوا۔ بائیک سواروں کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ اس تصادم سے پہلے ہی موٹر سائیکل آگے بڑھا چکا تھا۔ عالیہ بدستور اس سے چمٹی بیٹھی تھی۔ کچھ آگے نکلنے کے بعد اس نے کہا۔

"اب ہم محفوظ ہیں۔"

تو عالیہ نے خفیف ہو کر اسے چھوڑ دیا۔ بیس منٹ بعد وہ اسپتال میں تھے۔ یہاں پرائیویٹ ڈاکٹر اور سرجن بھی کام کرتے تھے۔ عالیہ کی ماں کا آپریشن ایک پرائیویٹ سرجن کر رہا تھا، اس لیے اس کی فیس خاصی زیادہ تھی۔ عالیہ نے کاؤنٹر پر رقم جمع کرائی اور رسید لی۔ وہ ویٹنگ روم میں آئے تو عالیہ نے کہا۔

"میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ سب کیا تھا؟ دو آدمی ہمارے گھر میں تھے اور پھر اس طرح سے ہمارا پیچھا کیا گیا... فائرنگ کی گئی..." عالیہ کہتے ہوئے کانپ گئی۔ "گولیاں آس پاس سے گزری تھیں۔"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کے کیا مقاصد ہیں؟ مگر مجھے لگ رہا ہے کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ کیا تم لوگ عارضی طور پر کہیں اور منتقل ہوسکتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمارا کوئی ایسا عزیز نہیں ہے جس کے ہاں پناہ لے سکیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری والدہ کو کتنے دن اسپتال میں رہنا ہوگا؟"

"کل آپریشن ہے اور کم سے کم دو تین دن رکھیں گے، اس کے بعد بھی کنڈیشن دیکھ کر ڈسچارج کریں گے۔"

"تم [illegible]"

"ظاہر ہے... میں نے دفتر سے چھٹی لی ہوئی ہے۔"

"تب ٹھیک ہے، تم یہیں رہو اور بلاوجہ اسپتال سے باہر جانے سے گریز کرو۔ اگر جانا ہو تو چہرہ چھپا کر جانا۔"

عالیہ کی رنگت زرد پڑ گئی۔ "وہ یہاں بھی آسکتے ہیں؟"

"ایسا ہوسکتا ہے۔"

"میں پولیس کو رپورٹ کروں؟"

"اس صورت میں میرا ذکر کرنا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم یہیں رہو۔ یہ اسپتال ہے اور یہاں سیکیورٹی بھی ہے یہاں تم محفوظ ہو۔"

"اب تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" عالیہ نے جھرجھری لی۔

وہ اسے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ "فکر مت کرو، دن میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور رات کو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔"

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"تمہیں جو مسئلہ تھا وہ حل ہوگیا ہے۔ دوسرے میں یہاں رک نہیں سکتا لیکن تم فکر مت کرو، تم عابد کو میسج کرو گی تو میں آجاؤں گا۔"

"وہ جو میرے گھر میں باتھ روم میں بند ہیں؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "مجھے گیٹ کی چابی دو، میں دیکھتا ہوں۔"

عالیہ اس کے جانے کے بعد بھی اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے کیسی پھرتی اور مہارت سے صورتِ حال کا مقابلہ کیا تھا۔ دو مسلح افراد کے مقابلے میں وہ اکیلا اور نہتا تھا۔ یہی نہیں، اس نے چلتی بائیک والے کا نشانہ لے کر ان بدمعاشوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو عالیہ کے ساتھ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ لوگ کامیاب ہو جاتے جو پتا نہیں کیوں اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

☆☆☆

بالاجی کا برا حال تھا کیونکہ گولی اس کے گھٹنے پر لگی تھی اور اس نے گھٹنا توڑ دیا تھا۔ اس کے ساتھ پرویز تھا اور درخت سے تصادم میں اس کی ریڑھ کی ہڈی پر شدید ضرب لگی تھی کیونکہ وہ اچھل کر کمر کے بل درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ بالاجی ہوش میں تھا، اس نے بہ مشکل اپنا موبائل نکالا اور عاطف کو کال کی۔ وہ کراہ رہا تھا۔ "کہاں ہو تم لوگ... وہ نکل گئے ہمارا بیڑا غرق کر کے۔"

"ہم اس کے گھر کے باتھ روم میں بند ہیں۔" عاطف نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "دروازہ [illegible] ہے کا ہے،

اسے توڑنے کی کوشش کی تو بہت شور ہوگا۔ تم لوگ آؤ۔"

"تیرا دماغ خراب ہے... میرے پیر میں گولی لگی ہے... پرویز بے ہوش پڑا ہے... تم لوگ مدد کو آؤ۔"

"ہم کہاں سے آئیں... دروازہ توڑنے کی کوشش تو اتنا شور ہوگا کہ ہمارے آزاد ہونے سے پہلے پولیس آجائے گی۔"

پہلی ناکامی کے بعد انہوں نے سوچا تھا کہ اب لڑکی کو گھر میں قابو کرنا ہے۔ پروگرام کے مطابق عاطف اور نبیل اس کے گھر میں کود کر باتھ روم میں چھپ گئے تاکہ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہو اسے قابو کر لیں جبکہ بالاجی اور پرویز گلی کے کونے پر تھے تاکہ کسی ناگہانی کی صورت میں اندر والوں کی مدد کر سکیں۔ جب موٹر سائیکل لڑکی کے گھر سے ذرا فاصلے پر رکی تو بالاجی اور پرویز نے توجہ نہیں دی مگر اچانک ہی لڑکی جس نے شال اوڑھی ہوئی تھی، اس گھر میں داخل ہوئی اور مرد اس کے پیچھے گیا تو وہ دونوں چونکے۔ پرویز نے کہا۔

"استاد! یہ وہی لڑکی ہے۔"

"اور یہ وہی آدمی ہے۔" بالاجی نے دانت پیس کر کہا۔ "آج اسے چھوڑنا نہیں ہے۔"

"ہم بھی چلیں؟" پرویز نے کہا۔ "یہ آدمی خطرناک ہے، پتا نہیں نبیل اور عاطف کے قابو میں آتا ہے یا نہیں۔"

اس موقع پر بالاجی کی فطری بزدلی عود کر آئی۔ اس نے انکار کیا۔ "نہیں، سب اندر چلے گئے تو پھر ان کی مدد کون کرے گا؟"

چند منٹ کے اندر لڑکی اور آدمی اندر سے برآمد ہوئے اور گیٹ کو تالا لگا کر روانہ ہوگئے۔ پرویز نے کہا۔

"یہ تو کچھ نہیں ہوا... وہ دونوں کیا کر رہے ہیں؟"

"ان کے پیچھے چلنا ہے۔" بالاجی نے بائیک اسٹارٹ کی۔ یہ طاقتور دن ٹو فائیو سی سی تھی۔ وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا پھر اس نے پستول نکالا تو پرویز خوفزدہ ہو کر بولا۔

"یہ کیا کر رہے ہو استاد؟"

"دیکھتا رہ... آج اس کتے کو نہ مارا تو کچھ نہ کیا۔"

بالاجی نے فائرنگ کی لیکن آگے والے بچ گئے۔ پھر موٹر سائیکل ایک ذیلی سڑک پر مڑی۔ وہ پیچھے آئے تھے کہ موٹر سائیکل اچانک گرین بیلٹ کے دوسری طرف جا کر رکی اور جب وہ پاس پہنچے تو فائرنگ ہوئی۔ بالاجی کو لگا کہ اس کے گھٹنے میں دہکتی ہوئی سلاخ گھس گئی ہو۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اسے پتا نہیں چلا کہ بائیک کس طرف گئی ہے۔ دھماکے سے وہ اچھل کر نیچے جا گرا اور پرویز درخت سے ٹکرا کر وہیں رہ گیا۔ بالاجی کی حالت بری تھی مگر کوشش کر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے موبائل نکالا تھا اور اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ دونوں بھی اس کی مدد کے قابل نہیں ہیں۔ اسی اثنا میں پولیس سائرن سنائی دیا۔ پہلے ہی بالاجی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، پولیس سائرن سُن کر وہ بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

وہ اسپتال سے نکل کر دوبارہ عالیہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے زخم کا درد بڑھ گیا تھا مگر اب بھی یہ قابلِ برداشت تھا۔ اس نے بائیک گھر سے کچھ دور پارک کے ساتھ روک دی۔ یہ سنسان علاقہ تھا، وہاں سے وہ پیدل روانہ ہوا۔ یہاں مین روڈ سے عالیہ کا گھر قریب تھا اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ وہ گلی میں داخل ہوا اور پہلے اس نے سُن گُن لی مگر گھر اور آس پاس سناٹا تھا۔ اگر وہ دونوں لفنگے اندر موجود نہیں تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ بغیر کسی شور شرابے کے نکل بھاگے تھے۔ اس نے گلی کا جائزہ لیا اور چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا اور اندر آتے ہی اس نے محسوس کرلیا کہ وہ دونوں بدستور قید ہیں۔ اندر سے ان کے بولنے کی ہلکی آواز آرہی تھی۔ اس نے سائڈ پر کھڑے ہوکر دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''تم دونوں میری آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں... خدا کے لیے ہمیں یہاں سے نکالو۔'' نبیل تڑپ کر بولا۔

اس نے حکم دیا۔ ''تمہارے پاس جو ہتھیار ہے، وہ اس روشن دان سے باہر پھینک دو۔''

''ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے۔'' عاطف بولا۔ ''ایک پستول تھا جو گر گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں دروازہ کھول رہا ہوں دونوں ہاتھ اوپر کرکے باہر آجاؤ۔ مجھے ذرا شبہ ہوا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے پستول تان لیا تھا مگر وہ دونوں شرافت سے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر آئے۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہونے کا حکم دیا تو اس بار بھی انہوں نے تعمیل کی، اس نے ان کی تلاشی لی۔ سچ مچ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ دونوں کے پاس موبائل اور دوسری چیزیں تھیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بالاجی کال کرکے انہیں پہلے ہی اپنا حشر بتا چکا ہے اور اسی لیے دونوں کی حالت خراب ہے۔ اس نے ان کے موبائل اور پرس میں موجود رقم نکال لی۔ باقی چیزوں سے تعرض نہیں کیا۔ پھر اس نے حکم دیا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

''ہمیں جانے دو۔'' نبیل نے گڑگڑا کر کہا۔

''میرے باپ کی توبہ جو آئندہ اس گلی سے بھی گزروں۔''

''بکواس کرنے کے بجائے چلو یہاں سے۔'' وہ انہیں پستول کی نوک پر باہر لایا۔ اس نے گیٹ کھینچ کر بند کیا اور ان کے ساتھ پارک تک آیا۔ وہ اس کی منت سماجت کر رہے تھے کہ وہ انہیں جانے دے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ لوگ عالیہ کے پیچھے کیوں پڑے تھے۔ اس نے ان سے سوالات شروع کیے۔ شروع میں انہوں نے غلط بیانی کی مگر جب اس نے پستول کے دستے سے ان کی مرمت کی تو وہ راہِ راست پر آگئے۔ روتے کراہتے انہوں نے اپنے بارے میں بتایا اور پھر عالیہ کے پیچھے آنے کی کہانی سنائی۔ یہ جان کر اس کا خون کھول اٹھا کہ وہ عالیہ کے لیے گندے عزائم رکھتے تھے۔ اس نے بلاتردد پستول سیدھا کیا اور ان کے گھٹنوں میں ایک ایک گولی اتار دی۔ وہ چیخ چلانے لگے۔ اس نے جانے سے پہلے ان سے کہا۔

''دل تو چاہ رہے کہ تمہارے سروں میں سوراخ کردوں لیکن اگلی بار سہی۔ اگر دوبارہ مجھے پتا چل گیا کہ تم اس کے آس پاس نظر آئے ہو تو یہی کروں گا۔'' کہتے ہوئے اس کا لہجہ خونخوار ہوگیا تو وہ اپنے زخم کو بھول گئے۔

''ہم اس علاقے میں... نہیں آئیں گے۔'' عاطف نے روتے ہوئے کہا۔

''پولیس کو نامعلوم فرد کی کہانی سنانا، میرا حلیہ بتانا چاہو تو شوق سے بتانا لیکن لڑکی کا ذکر نہ آنے پائے تمہاری کہانی میں۔''

وہاں سناٹا تھا اس لیے فائرنگ کی آوازیں دور تک سنی گئی ہوں گی۔ پولیس یا کسی کے آنے سے پہلے اس نے وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ وہ راستے میں ایک بیکری پر رکا اور اس نے کھانے پینے کا خاصا سامان لے لیا۔ بھاگ دوڑ اور ایک مختصر لڑائی نے اس کے زخم میں درد جگا دیا تھا۔ جب وہ واپس عابد کے گھر پہنچا تو اچھی خاصی دھند ہوچکی تھی۔ اس نے سوزوکی سائیکل اندر کھڑی کی۔ وہ بالکل خاموشی سے آیا تھا۔ کچن والے دروازے سے اندر آکر اس نے سامان کچن میں رکھا اور سب سے پہلے باتھ روم میں آکر اپنے زخم کا معائنہ کیا۔ اس سے ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ زخم اندر سے کچا تھا اور لڑائی میں اسے چوٹ نہیں لگی تھی اس کے باوجود یہ ہرا ہوگیا تھا۔ اس نے مزید پاؤڈر چھڑک کر تازہ پٹی رکھی اور ٹیپ لگا کر واپس [illegible]

ساتھ وہ بیکری کے تیار گرم کردہ پیزا اور برگر لایا۔ اس نے ان سے ڈنر کیا اور پھر چائے تیار کی۔ چائے کے ساتھ اس نے پین کلر اور اینٹی بایوٹک لی تھیں۔ اس محنت اور جدوجہد نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا اور بے خبر سو گیا۔

☆☆☆

فاریہ اور اس کی ماں سخت ہراساں تھے۔ پہلے ٹائیگر زخمی ہوا تھا اور اب رفیق غائب تھا۔ وہ شام کے وقت کچھ سامان لینے کے لیے نیچے مارکیٹ گیا اور اس کے بعد واپس نہیں آیا۔ فاریہ نے اسے کال کی تو اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ جب بہت دیر ہوگئی اور رات چھا گئی تو فاریہ نے ماں سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ رفیق بابا کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔''

ماں نے سہم کر پوچھا۔ ''کیا ہمارے دشمنوں نے کچھ کیا ہے؟''

''سامنے کی بات ہے۔ وہ اس گھر پر قبضے کے لیے اتنے بے تاب ہیں کہ اس کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔'' فاریہ نے تلخی سے کہا۔ ''وہ اسی لیے گھر میں گھسے تھے۔ انہیں پتا ہے بھائی یہاں نہیں ہے۔''

''لیکن گھر میں گھس کر وہ اس پر قبضہ تو نہیں کرسکتے۔''

''امی، وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ رفیق غائب ہے، اب ہمیں اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔''

''ہم دو عورتیں کیا کرسکتی ہیں؟''

فاریہ سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''امی، ہمیں کل یہاں سے جانا ہوگا۔''

''کہاں؟''

''بھائی کے پاس... یہاں ہم محفوظ نہیں ہیں۔'' فاریہ نے کہا۔ وہ رفیق کی کوٹھری میں گئی۔ وہاں اس کی رائفل اور کارتوس رکھے تھے۔ فاریہ رائفل استعمال کرنا جانتی تھی مگر نشانہ لگانا نہیں آتا تھا۔ مکان میں آکر اس نے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کیں۔ دروازے بہت مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ پھر اس نے اپنا اور ماں کا مشترک کمرا بھی اندر سے بند کرلیا۔ اب کوئی اندر گھس آتا تب بھی وہ آسانی سے ان کے کمرے میں نہیں آسکتا تھا۔ ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ دوا لے کر سو گئی مگر فاریہ خوف اور اندیشوں میں تقریباً ساری رات جاگتی رہی۔ سردی شدید تھی اور اگر آتش [illegible] تو سیزن میں ایک دو بار ہی ہوتی تھی لیکن چھ مہینے بہت سخت سردی پڑتی تھی۔ اکتوبر کے وسط سے انہیں آتش دان جلانے پڑتے تھے اور یہ سلسلہ مارچ کے وسط تک جاری رہتا تھا۔

مگر صبح ماں کو بہت تیز بخار تھا، اوپر سے موسم ابر آلود ہوگیا اور سورج نکلتے ہی بارش شروع ہوگئی۔ اگر موسم ٹھیک ہوتا تو وہ ماں کو لے کر نکل جاتی مگر اس موسم میں جانا بہت مشکل تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔ پہلے اس نے پورے گھر کا چکر لگایا۔ ہر چیز اپنی جگہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا اور کچن میں آگئی۔ اس نے ناشتا بنایا۔ پہلے ماں کو دیا اور پھر اسے دوا دے کر کچن میں آئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے اس نے صرف چائے لی۔ کچن کی کھڑکی سے مکان کے دائیں طرف پھیلا ہوا باغ بہت صاف اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے مرجھایا ہوا سبزہ نکھر گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ عارضی ہے۔ جیسے ہی بارش رکے گی سب پھر مرجھا جائے گا۔ اپنے باپ کے بعد ان لوگوں نے سخت حالات دیکھے تھے۔ ماں نے بہت قربانی دے کر انہیں پڑھایا، خاص طور سے عابد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور اب شہر میں تھا۔ فاریہ نے دو سال پہلے گریجویشن کرلیا تھا اور اب ایجوکیشن میں ماسٹر کر رہی تھی۔ دو مہینے بعد اس کے پیپرز تھے مگر حالات کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہیں دے پائی تھی۔

صبح بیدار ہوتے ہی اس نے رفیق کا نمبر چیک کیا۔ وہ بدستور بند تھا۔ اسے ٹائیگر کا خیال تھا، اس کا زخم بھر رہا تھا لیکن اسے ابھی آرام اور خوراک کی ضرورت تھی۔ فاریہ نے اسے گزشتہ شام راتب دیا تھا۔ چائے پی کر اس نے فریج سے ٹائیگر کے لیے مخصوص گوشت نکالا اور اسے ہلکا سا ابال کر عقبی دروازے سے باہر آئی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا اس لیے اس نے احتیاطاً رائفل ساتھ رکھی۔ وہ ٹائیگر کی کوٹھری میں آئی تو وہ بھوک سے بے تاب تھا۔ فاریہ نے اس کے سامنے راتب ڈالا تو وہ جلدی جلدی کھانے لگا۔ فاریہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ٹائیگر! جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ... رفیق بابا بھی غائب ہے، ہم بہت اکیلے رہ گئے ہیں۔ عابد بھائی کا موبائل بھی بند جا رہا ہے۔''

ٹائیگر نے ہلکی سی آواز نکالی اور دوبارہ کھانے میں لگ گیا۔ فاریہ نے کپڑا ہٹا کر اس کا زخم دیکھا اور پھر رکھا ہوا مرہم لیپ گیا۔ وہ باہر آئی۔ بوندا باندی ہلکی ہوگئی تھی اور سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ واپس مکان میں آئی۔ اس نے ایک بار پھر عابد کو ایس ایم ایس کیا کیونکہ نمبر مستقل بند جا رہا تھا اور اب وہ اسے کال کرنے کی کوشش

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں کررہی تھی، حالانکہ اس وقت نمبر آن تھا۔ اس سارا دن بارش ہوتی رہی۔ ماں کی طبیعت شام کے وقت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ وہ فاریہ سے بات کررہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''فاریہ! میری ایک بات مان... اگر کوئی گھر میں گھسے تو تو خاموشی سے نکل جائے گی۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے انکار کیا۔ ''اگر نکلی بھی تو کہاں جاؤں گی؟ یہاں تو اپنے ہی دشمن بنے ہوئے ہیں۔''

ماں نے اپنے اکلوتے بھائی کا ذکر کیا۔ ''تو اپنے ماموں کے گھر چلی جانا...''

''امی، ان کا نام نہ لیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں قادر حیات کے گھر چلی جاؤں۔'' فاریہ نے غصے سے کہا۔ ''بس آپ سن لیں کل ہم یہاں سے جارہے ہیں۔ بھاڑ میں جائے یہ مکان اور زمین جس نے ہمارا سکون برباد کردیا ہے۔''

''میری بچی... یہ تیرے باپ کی نشانی ہے۔'' ماں نے روایتی بات کی۔

''امی، بابا کی نشانی میں اور عابد بھائی ہیں... یہ بے جان مکان کہاں سے ان کی نشانی ہوگیا؟ ہوسکتا ہے آنے والے کل یہ کسی اور ملکیت ہو۔''

مگر ماں یہ بات نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس کی وہی مخصوص دیہاتی سوچ تھی جو زمین اور مکان سے چمٹے رہنا چاہتی ہے۔ عابد کتنے عرصے سے ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ شہر آکر اس کے ساتھ رہیں۔ خود فاریہ کی بھی یہی خواہش تھی مگر ماں یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس کی وجہ سے وہ بھی مجبور تھے۔ رات کے کھانے کے بعد فاریہ ایک بار پھر ٹائیگر کی کوٹھری میں اسے راتب ڈالنے گئی۔ کتے کے کان کھڑے ہوئے تھے اور وہ ہولے سے غرا رہا تھا۔ فاریہ نے اسے پچکارا۔ ''ایزی بوائے۔''

اس نے راتب ڈالا مگر ٹائیگر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ فاریہ کو سردی لگ رہی تھی، اس نے ٹائیگر کے زخم کا معائنہ کیا اور واپس مکان میں آگئی۔ رات کے وقت سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ سونے سے پہلے آتش دان میں مزید لکڑی ڈال دے تاکہ دروازہ بند کرتے سے پہلے پہلے دھواں نکل جائے۔ وہ کمرے میں آئی اور آتش دان کے ساتھ رکھی لکڑی اندر ڈالی۔ ماں کھانا اور دوا کھا کر سوگئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور باہر آئی۔ اس نے حسب معمول تمام کھڑکیاں اور دروازے چیک کیے۔ پھر کچن میں آئی تو اس کا کھلا دروازہ دیکھ کر چونک گئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے آکر دروازہ اندر سے بند کیا تھا تو پھر اسے کس نے کھولا؟ اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پلٹنے لگی تھی لیکن اس سے پہلے ہی ایک کپڑا آکر اس کے منہ پر جم گیا جس سے تیز بو اٹھ رہی تھی اور یہ بو اس کے دماغ پر چڑھتی چلی گئی۔ چند لمحوں میں اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ زخم کا درد بہت کم رہ گیا تھا اور گزشتہ دن کی تھکن بھی اُتر گئی تھی۔ وہ اٹھ کر واش روم میں آیا، اس نے پٹی ہٹا کر زخم دیکھا۔ وہ اب درست حالت میں تھا کیونکہ پٹی صاف تھی اس لیے اس نے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آگیا۔ سب سے پہلے اس نے موبائل دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پر فاریہ کے ایس ایم ایس ہوں گے لیکن اس پر صرف ایک ایس ایم ایس تھا اور وہ عالیہ کی طرف سے تھا۔ اس نے عابد کو گزشتہ روز کا مختصر احوال سناتے ہوئے اس کے ''دوست'' کا بہت ذکر کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ اس نے ناشتا کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اصولاً تو اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ اس نے جو کرنا تھا، وہ کر لیا تھا۔ اس نے ایک طرح سے عابد کا عملی شکریہ ادا بھی کردیا تھا۔ مگر اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی۔ اسے اب رہ رہ کر فاریہ کے پیغامات یاد آرہے تھے۔ وہ اور اس کی ماں مشکل میں تھی اور اپنے بھائی کو پکار رہی تھی جبکہ بھائی کہیں غائب تھا مگر وہ ان کے لیے کیا کرسکتا تھا؟ عالیہ اسی شہر میں تھی اور اس کی مدد اس کے بس میں تھی لیکن وہ نہ جانے کہاں تھیں؟ اور نہ جانے انہیں کیا مسئلہ درپیش تھا؟ وہ سوچتا رہا۔ پھر ناشتا کرکے وہ گھر سے نکلا اور پیدل نزدیکی مارکیٹ پہنچا۔ وہاں اس نے ایک پی سی او سے فاریہ کا نمبر ملوایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کررہا تھا۔ اس نے موبائل سے ایس ایم ایس کیا۔ ''فاریہ! یہ میں کال کررہا ہوں... میرے پاس بیلنس نہیں ہے، پی سی او سے کال کررہا ہوں۔''

چند منٹ بعد اس نے دوبارہ کال ملوائی۔ اس بار کال ریسیو ہوئی۔ ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز نے کہا۔ ''ہیلو بھائی...''

''میں بات کررہا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''عابد... [illegible] ہیں... پلیز!

''میں آرہا ہوں۔'' اس نے کہا اور اسی لمحے کال کٹ گئی۔ اس نے دوبارہ کال ملوانے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کرکے واپس آیا اور اس نے ایک بار پھر ڈریسنگ روم کی درازوں کو چیک کیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے ایک لپٹا ہوا لفافوں کا بنڈل دیکھا تھا لیکن اسے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ بنڈل نچلی دراز میں تھا۔ اس نے اسے کھولا۔ توقع کے مطابق اس میں کچھ لفافے فاریہ کی طرف سے تھے۔ اس میں اس نے عابد کو برتھ ڈے کارڈ بھیجا تھا۔ لفافے کوریئر سے آئے تھے۔ اس نے لفافے پر بھیجنے والے کا پتا دیکھا۔ پتا شمال میں دارالحکومت سے تقریباً سو کلومیٹر دور ایک چھوٹے قصبے کا تھا۔ اس نے پتے والا لفافہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ فاریہ سے بات ہونے کے بعد وہ پھر ایس ایم ایس کرے گی لیکن اس نے کوئی میسج نہیں کیا تھا۔ اس نے عالیہ سے رابطہ کیا اور اس سے اس کی ماں کے آپریشن کے بارے میں پوچھا۔ انہیں صبح گیارہ بجے آپریشن روم لے جایا جاتا اور آپریشن تقریباً تین بجے تک مکمل ہوجاتا۔ عالیہ نے بتایا، سرجن کا کہنا تھا کہ آپریشن کے بعد اس کی ماں کو چوبیس گھنٹے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رہنا ہوگا، اس کے بعد اسے کمرے میں شفٹ کیا جاتا۔ عالیہ اس کے ساتھ تھی اور ابھی تک اسے کسی طرف سے کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

اگرچہ شاید اب ضرورت نہیں تھی لیکن اس نے اینٹی بایوٹک کیپسول اور پین کلر لے لی تھی۔ گیارہ بجے وہ گھر سے نکلا، اس بار اس نے کار لی تھی۔ اتفاق سے اس میں سی این جی فل تھی اور پیٹرول ٹینک بھی آدھے سے زیادہ تھا۔ باہر اب روشنی تیز تھی، اسے ڈرائیونگ میں مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ کسی قدر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد شمال کی طرف جانے والی ہائی وے پر وہ ایک چھوٹی بستی کے سامنے اترا۔ اس نے ایک معمولی سے مکان کا دروازہ بجایا۔ دوسری بار بجانے پر اندر سے کسی نے غنودہ آواز میں پوچھا۔ ''اس وقت کون آگیا ہے؟''

''میں ہوں۔''

دروازہ کھلا، ایک دبلا اور مدقوق چہرے والا شخص سامنے کھڑا تھا۔ وہ یقیناً منشیات کے استعمال کا عادی تھا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''تو...''

''ہاں میں۔'' وہ اسے دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ ''میں کام سے آیا ہوں۔''

رر سے بھی

معمولی سا تھا۔ ایک کمرے میں چند چارپائیاں پڑی تھیں۔ مدقوق آدمی نے اشارہ کیا تو اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں بیٹھنے نہیں آیا۔''

''کام کیا ہے؟''

''مجھے اعشاریہ تین آٹھ کی گولیاں چاہئیں۔'' اس نے جیکٹ سے ایک گولی نکال کر اسے تھمائی۔ ''سائز یہی ہونا چاہیے۔''

مدقوق آدمی نے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''مل جائیں گی مگر اصلی ہیں اس لیے قیمت زیادہ ہوگی۔''

''کیا قیمت ہوگی؟''

''تمہارے لیے پچیس کی ایک گولی ہوگی ورنہ دوسروں کو چالیس کی ایک دیتا ہوں۔''

دونوں لفنگوں سے اسے ساڑھے تین ہزار کی رقم ملی تھی۔ اس نے عابد کے پرس سے نکالی ہوئی رقم واپس رکھ دی تھی۔ خریداری کے بعد بھی اس کے پاس تقریباً تین ہزار روپے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا اور بولا۔ ''مجھے چالیس گولیاں دے دو۔''

مدقوق آدمی دوسرے کمرے میں گیا اور چند منٹ بعد وہ ایک شاپر میں گولیاں لے آیا۔ اس نے تمام گولیاں نکال کر چیک کیں اور مطمئن ہوگیا۔ اس نے ایک ہزار کا نوٹ مدقوق آدمی کو دیا تو وہ خوش ہوگیا۔ ''آج صبح صبح بوہنی ہوگئی۔''

''مگر بات اپنے تک رکھنا۔'' اس نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد کار شمال کی طرف جارہی تھی۔ ایک جگہ رک کر اس نے پستول نکالا اور میگزین میں پانچ گولیاں ڈالیں۔ یہ وہ گولیاں تھیں جو اس نے چلائی تھیں۔ یہ بارہ گولیوں والا میگزین تھا۔ وہ پھر روانہ ہوا، یہ ہائی وے اس قصبے تک جاتی تھی جس کا نام لفافے پر لکھا ہوا تھا۔ ایک بجے وہ قصبے کے پاس تھا۔ یہ دو مسطح پہاڑیوں پر پھیلا ہوا قصبہ تھا، اس میں شاید ہزار سے اوپر گھر تھے۔ کمرشل ایریا دونوں پہاڑیوں کے درمیان تھا۔ ہائی وے بھی یہیں سے گزر رہی تھی۔ اس نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روکی لیکن اندر جانے کے بجائے وہ اس کے مخالف سمت میں قائم ڈاک خانے میں داخل ہوا۔ اس نے کاؤنٹر پر موجود شخص سے لفافے کے پتے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کسی افضل کو آواز دی۔ ایک بوڑھا شخص سامنے آیا، اس نے ڈاکیے کی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ کاؤنٹر والے نے اس سے پتے کا پوچھا۔

بوڑھے ڈاکیے نے بتایا۔ ''یہ دائیں والے حصے میں ذرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیچھے ہے۔ سڑک سے نظر نہیں آتا ہے لیکن اوپر جاؤ گے تو سرخ چھت والا مکان ہے۔ دیواروں پر آسمانی رنگ ہے۔ عبیدالرحمن کا مکان ہے، پر اب تو اس کا بیٹا بھی شہر میں ہوتا ہے۔"

"مجھے اسی نے بھیجا ہے۔" اس نے کہا۔ "گاڑی اوپر جانے کا راستہ ہے؟"

"بالکل ہے، یہ جو موڑ کے ساتھ سڑک ہے اس پر چلے جاؤ... مکان بھی اسی کے آخر میں ہے۔"

وہ شکریہ ادا کر کے باہر آیا اور گاڑی لے کر اوپر روانہ ہوا مگر مکان نظر آتے ہی اس نے گاڑی ایک باغ کے ساتھ روک دی اور خود پیدل آگے روانہ ہوا۔ مکان پرانا لیکن خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔ اس کے چاروں طرف اچھی خاصی زمین تھی۔ یہ کم سے کم بھی چار کنال زمین تھی جو پہاڑی علاقوں میں خاصی سمجھی جاتی تھی۔ زمین دائیں طرف نشیب میں چلی گئی تھی اور اس پر باغ تھا۔ وہ چار دیواری کے پاس آیا۔ یہ مشکل سے چھ فٹ اونچی تھی۔ فاریہ نے تیسی صورت حال بتائی تھی، اس میں تو یہ چار دیواری حفاظت کے لیے قطعی ناکافی تھی کوئی بھی آسانی سے اسے پھلانگ کر اندر جا سکتا تھا۔ مکان کے اندر اور احاطے میں کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ اس نے سوچا اور پھر کال بیل بجائی۔ پستول عقب میں ٹراؤزر میں اڑسا ہوا تھا۔ اسے جنیٹ نے ڈھانپ رکھا تھا اس لیے کسی کے دیکھ لینے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوبارہ بیل بجانے پر بھی کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو اس نے چھوٹا دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔

اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا۔ جن لوگوں کو خطرہ ہوتا ہے، وہ اس طرح دروازے کھلے چھوڑ کر نہیں رکھتے۔ کیا اس گھر میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا؟ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور دیوار کے ساتھ لگی بیلوں کی آڑ میں اندر کی طرف بڑھا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہ مشکل سے تہائی کنال رقبے پر تھا۔ اس کے آس پاس کی ساری جگہ خالی تھی۔ اس پر تراشی ہوئی گھاس تھی پھول دار پودوں کے تختے تھے۔ اس نے پستول نکال لیا۔ وہ داخلی دروازے تک آیا مگر اندر جانے کے بجائے اس نے سُن گُن لی۔ اندر خاموشی تھی۔ وہ پلٹ کر دبے قدموں بائیں طرف آ کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پیچھے کی طرف آیا۔ ایک دروازہ اس طرف بھی تھا۔ اس نے ہینڈل گھما کر اسے چیک کیا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ بہت آہستگی سے اس نے دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا تھا کہ کسی نے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا۔

ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود وہ مزاحمت نہ کر سکا، کھینچنے والا بہت طاقتور تھا۔ اس نے پستول کا رخ نیچے رکھتے ہوئے اسے نیچے گرا دیا۔ اس نے پستول نہیں چھوڑا اور اس کا رخ حملہ آور کی طرف کرنا چاہا کہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور یک لخت اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن اسے لگا جیسے اس کا جسم اس کے قابو سے نکل گیا ہو۔ وہ ساکت ہو کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی نے بیدردی اسے پلٹ کر سیدھا کیا اور پھر اس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول پہلے ہی لے لیا تھا، اب اس کی جیبوں سے موبائل، رقم اور گولیوں کا شاپر بھی نکال لیا گیا تھا۔ کسی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔"

"ملک اسے دیکھ کر خوش ہوگا... اس نے کہا تھا کہ اسے زندہ لانا ہے۔" دوسرا بولا۔

"چلو اس کے ہاتھ پاؤں باندھو۔" پہلے نے کہا۔ "میں جیپ تک گاڑی لاتا ہوں۔"

وہ آنکھ بند کیے ساکت لیٹا ہوا تھا۔ پہلا آدمی باہر چلا گیا، یہاں شاید دو ہی تھے۔ دوسرا اس پر جھکا اور اس کے ہاتھ پکڑے تھے کہ اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی اس آدمی کی رانوں کے درمیان ماری۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور منہ کھل گیا۔ یہ وہی طاقتور آدمی تھا جس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ مگر نازک جگہ ٹھیک سے لگنے والی ضرب نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ اس نے کالر سے پکڑ کر آدمی کو کھینچا اور خود ایک طرف سرکتے ہوئے اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔ یہ ضرب بھی شدید تھی اور وہ فوری بے ہوش ہو گیا۔ فرش سے اٹھتے ہوئے اس کا سر ہلکا سا چکرایا مگر فوراً ہی وہ سنبھل گیا۔ یہ بے ہوش ہونے کا وقت نہیں تھا اگر اس وقت وہ ہوش کھو دیتا تو شاید پھر کبھی ہوش نہ آتا۔ اس لیے وہ ہمت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے طاقتور آدمی کے لباس سے اپنا پستول نکالا اور پہلے اس کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا کیونکہ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ اس ضرب نے اسے یقینی طور پر بے ہوش کر دیا۔

یہ مکان کے عقبی حصے کا لاؤنج تھا جس کی کھڑکیاں اور ایک دروازہ عقبی لان کی طرف کھل رہا تھا۔ وہ اسی سے اندر آیا تھا۔ اس کے برابر میں کچن تھا۔ پھر ایک بیڈروم اور سامنے والے حصے میں بڑی سی نشست گاہ تھا۔ نشست گاہ کے ساتھ اور لاؤنج کے دوسری طرف ایک کمرا اور تھا۔ طاقتور آدمی سے

والے حصے میں آیا کیونکہ گاڑی کے لیے جانے والا فرنٹ والے دروازے سے باہر گیا تھا۔ اتنے ہنگامے کے باوجود اندر خاموشی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا یا تھا تو بھی کسی ردِعمل کے قابل نہیں تھا۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ ان دونوں کی گفتگو سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے منتظر تھے اور وہ اسے کسی ملک کے سامنے پیش کرنے کی بات کر رہے تھے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا۔ ان لوگوں کو یا کسی ملک کو اس کے بارے میں کیا معلوم تھا اور یہ بھی کہ وہ یہاں آ رہا تھا۔

اسے باہر جانے والے کی فکر تھی۔ ان لوگوں نے بہت چالاکی سے کام لیا تھا۔ اپنی گاڑی باہر کھڑی کی تھی اور خود مکان کے عقبی حصے میں اس کے منتظر تھے۔ اس سوال کا جواب اس کے ذہن میں آ گیا تھا کہ انہیں اس کی آمد کا کیسے پتا چلا۔ اسے یقین تھا کہ جب اس نے فاریہ کو کال کی تو یہ لوگ یہاں آ چکے تھے اور اس وقت فاریہ اور اس کی ماں ان کے قبضے میں تھیں۔ ان کی مرضی سے فاریہ نے کال ریسیو کی اور اسے بھائی سمجھتے ہوئے فوراً آنے کو کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ وہی لوگ تھے جن سے اس خاندان کو خطرہ تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال اور آیا۔ کیا فاریہ نے سچ مچ اسے بھائی سمجھ لیا تھا؟ کیا وہ اپنے بھائی کی آواز نہیں شناخت کر سکی تھی؟ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تو وہ چوکنا ہو گیا۔ اس نے دروازے کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ دوسرا آدمی پوری بے فکری سے آیا تھا۔ اس لیے آرام سے مار کھا گیا۔ سر پر لگنے والی ضرب نے اسے بھی ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ یہ گٹھے ہوئے جسم کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس کی تلاشی لے کر اس نے اس کا پستول بھی نکال لیا۔ اس کا موبائل اور رقم بھی اسی کے پاس تھی۔ طاقتور آدمی کے پاس سے کوئی ہتھیار نہیں نکلا تھا۔ وہ دوسرے آدمی کو بھی کھینچ کر عقبی کمرے میں لے آیا۔ پیچھے صحن میں دو درختوں کے درمیان الگنی کی رسیاں بندھی تھیں۔ اس نے کچن سے چاقو لیا اور یہ رسیاں کاٹ کر لے آیا۔ ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ ان کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اس نے پورے گھر کا معائنہ کیا۔ دونوں عورتیں غائب تھیں۔ ان کو یہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔ وہ کچن سے بوتل میں پانی لایا جو یخ بستہ تھا۔ اس نے باری باری دونوں کے سروں پر پانی ڈالا تو وہ ہوش میں آنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ پستہ قد آدمی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی اس نے سرد لہجے میں کہا۔

سے بولا۔

"ہاں..."

"عورتیں کہاں ہیں؟"

جواب میں پستہ قد شخص نے ایک گندی بات کی تو اس کا ہاتھ گھوما۔ پستول کی نال نے پستہ قد کا گال پھاڑ دیا۔ کراہ کے ساتھ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "فضول باتوں سے گریز کرو۔"

پستہ قد شخص خون تھوکتا رہا مگر اس کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ زبان کھولنے کے موڈ میں ہے۔ وہ اٹھ کر تنومند آدمی کے پاس آیا۔ وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ "تم جانتے ہو عورتیں کہاں ہیں؟"

"وہ ملک کے پاس پہنچائی جا چکی ہیں۔" اس نے فوری جواب دیا۔

"تو بھی جلد ملک کے قدموں میں ہوگا۔" پستہ قد شخص تھوک کر بالآخر بولنے کے قابل ہوا تھا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔

"تم دونوں میرے لیے یہاں رکے تھے... کیا تم مجھے جانتے ہو؟"

"تم عابد الرحمن ہو۔" پستہ قد نے جواب دیا تو وہ چونکا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں ایسے بول رہے تھے اور ملک اسے دیکھ کر کیوں خوش ہوتا۔ اس نے سوچ کر سوال کیا۔

"تم لوگ کس ملک کی بات کر رہے ہو... یہاں تو ہر شخص ملک ہے؟"

پستہ قد شخص خاموش رہا تو اس نے دوسرا سوال کیا۔ "ملک نے ان عورتوں کو کیوں اٹھوایا ہے؟"

"ملک کی باتیں ملک جانے... ہم تو حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔"

اس نے طاقتور آدمی سے ملک کے بارے میں سوال کیا تو اس نے پستہ قد شخص سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "ہم ملک قادر حیات کے لیے کام کر رہے ہیں۔"

"عورتیں کہاں ہیں؟"

"ہمیں نہیں معلوم... انہیں دوسرے لوگ لے گئے ہیں۔ ہم تمہارے لیے یہاں رکے تھے۔"

"عورتوں کو کب لے جایا گیا؟"

"کل رات دو بجے۔"

وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ملک کو عابد الرحمن سے کیا... پرخاش تھی؟ اور اس نے اس کی ماں اور بہن کو کیوں اٹھوا لیا تھا؟ اب اس کی شخصیت اور بھی پراسرار ہو گئی تھی۔ وہ کہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

گئے تھے۔ اس نے عالیہ کا موبائل لے کر دیکھا اور اس میں ایس ایم ایس پڑھے جو اسی کے موبائل سے بھیجے گئے تھے۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون شخص تھا جو یوں اس کے گھر میں گھسا۔ اس نے اطمینان سے وہاں کئی دن گزارے، کھایا پیا۔ یہی نہیں وہ کھانے کا مزید سامان بھی لایا۔ پہلے اس کی بائیک استعمال کی اور پھر اس کی کار لے گیا۔ اس نے صرف چوری نہیں کی بلکہ وہ اس کے کام آیا تھا۔ اس وقت اس کے لیے وہ کیا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ عالیہ اسے بتا رہی تھی۔

"عابد... وہ آپ کی طرح پھرتیلا اور لڑنے کا ماہر تھا۔ اس نے اتنی آسانی سے دو مسلح لفنگوں کو قابو کر لیا اور انہیں باتھ روم میں بند کر دیا پھر اس نے پیچھے آنے والی بائیک پر فائر کیے اور اسے چلانے والے کو زخمی کر دیا۔"

اس نے گہری سانس لی۔ "عالیہ! یہ اسی چور کا کام ہے۔ میں کسی بلال مصطفیٰ کو نہیں جانتا۔"

"وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ کام کرتا ہے۔"

"یہ بھی غلط ہے اور شاید وہ زخمی تھا کیونکہ میرے میڈیکل باکس سے خاصا سامان استعمال ہوا ہے۔ مجھے ایک بلٹ بھی ملا ہے۔" عابد نے اسے بلٹ دکھایا۔ "یہ استعمال شدہ ہے۔ کیا وہ شخص زخمی لگ رہا تھا؟"

"نہیں... وہ تو بالکل ٹھیک تھا۔"

"شاید معمولی زخم تھا اسی لیے اس نے خود ہی بلٹ نکال لیا تھا۔ وہ کم سے کم دو دن میرے گھر میں رہا۔ دیکھنے میں کیسا لگ رہا تھا؟"

عالیہ نے اس کا نقشہ کھینچا۔ عابد نے سر ہلایا۔ "میں دیکھوں گا... میرا موبائل اس کے پاس ہے۔ اپنا موبائل دو۔"

اس نے عالیہ کے موبائل سے اپنا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جا رہی تھی مگر کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ "پتا نہیں وہ کہاں ہے لیکن میرا موبائل آن ہے۔"

"اگر موبائل آن ہے تو آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔" عالیہ کہتے ہوئے شرمائی۔ "میں نے آپ کا نمبر ٹریکنگ پر لگایا ہوا ہے۔ ایک ایس ایم ایس کر کے میں آپ کی لوکیشن معلوم کر سکتی ہوں۔"

عابد خوش ہو گیا۔ "یہ تم نے اچھا کام کیا ہے۔"

عالیہ نے لوکیشن معلوم کرنے کے لیے ایس ایم ایس کیا تو کچھ دیر بعد سروس کی طرف سے جوابی ایس ایم ایس میں لوکیشن آ گئی۔ وہ حیران ہوئی۔ "یہ تو آپ کا گاؤں ہے۔"

عابد نے دیکھا اور پریشان ہو گیا۔ اس نے قاریہ کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی مگر کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ عالیہ نے کہا۔ "میں نے کال اور ایس ایم ایس کیا تھا، آپ کا جاننے کے لیے لیکن قاریہ کا جواب نہیں آیا۔"

"کوئی گڑبڑ ہے... مجھے جانا ہوگا۔" عابد نے کہا۔

عالیہ فکرمند ہو گئی۔ "آپ چلے جائیں گے؟"

"ہاں... لیکن تم فکر مت کرو... ابھی تم یہاں ہو اگر کوئی مشکل ہو یا میں نہ آؤں اور امی کو ڈسچارج کر دیا جائے تو تم اس نمبر پر کال کر کے مدد طلب کر سکتی ہو۔" عابد نے ایک نمبر اس کے موبائل میں فیڈ کر کے اسے ہیلپ کا نام دے دیا تھا۔ "تمہارے پاس پیسے ہیں؟"

"ہاں... اس لحاظ سے مسئلہ نہیں ہے۔"

"میں جلد آؤں گا اور اگر نہ آ سکا۔" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ عالیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہیں... آپ آئیں گے۔ مجھے پتا ہے۔ میں انتظار کروں گی۔"

خود پر جبر کر کے عابد نے اسے اللہ حافظ کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس بائیک تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ پہاڑی علاقہ شروع ہوتے ہی اس نے رفتار کم نہیں کی۔ راستہ دو گھنٹے کا تھا لیکن وہ ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ اپنی کار دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے رک کر کار کا معائنہ کیا۔ وہ خالی اور لاک تھی۔ انجن بھی ٹھنڈا تھا۔ یعنی اسے یہاں آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے بائیک ذرا دور روکی اور خود پیدل روانہ ہوا۔ گیٹ کی جھری سے اندر جھانکا تو اسے ایک اجنبی گاڑی دکھائی دی۔ وہ گیٹ سے اندر آنے کے بجائے چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا اور ایک جگہ سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر آتے ہی اس نے پستول نکال لیا تھا اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

پستہ قد شخص کا حشر ہو چکا تھا۔ گال کے ساتھ ساتھ اس کا ماتھا اور ہونٹ بھی پھٹ گئے تھے اور وہ اپنے ہی لہو میں لتھڑا بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ سامنے سے لگنے والی ضرب نے اس کے دو دانت فارغ کر دیے تھے۔ اب اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے تم پر ذرا بھی ترس نہیں آئے گا۔ مجھے عورتوں پر ظلم کرنے والے قتل بھی کرنا پڑ

طاقتور آدمی مسلسل انکار کر رہا تھا کہ اسے نہیں معلوم کہ عورتیں کہاں لے جائی گئی ہیں جبکہ پستہ قد بہت دھیرج دکھا رہا تھا۔ اپنا حشر کروا کر بھی وہ زبان کھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے پاس سے ایک موبائل اور ملا تھا۔ اچانک اس کی بیل بجی۔ اس نے اسکرین پر دیکھا، اس پر صرف ملک لکھا ہوا تھا۔ اس نے موبائل پستہ قد کے سامنے کیا۔ "یہ ملک کی کال ہے؟"

"ریسیو کر... کے دیکھ لو۔" پستہ قد شخص نے مشکل سے کہا۔

مگر اس نے جواب میں موبائل واپس جیب میں ڈال لیا، کال نہیں کاٹی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ طاقتور آدمی کو اس بارے میں نہیں معلوم ہے۔ البتہ پستہ قد جانتا ہے لیکن وہ ضدی آدمی تھا۔ زبان کھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زبان کیسے کھلوائے؟ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ان عورتوں کی جان اور آبرو کی سلامتی کی امید کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پستہ قد شخص کی زبان کھلوا سکتا تھا مگر اس میں بہت وقت لگتا۔ وہ جلد از جلد یہ کام کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے اسے خطرہ تھا کہ ان لوگوں کے مزید ساتھی نہ آ جائیں۔ اس نے کہا۔ "بہتر ہے، زبان کھول دو ورنہ سمجھ لو کہ یہ صرف آغاز ہے۔"

پستہ قد شخص نے خون تھوکا۔ "تم ہم کو مار سکتا ہے، اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے۔"

"نہیں، میں اس سے زیادہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے گھٹنے کی ہڈیاں گولیوں سے توڑ دوں گا اور تم دوبارہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکو گے۔ پھر چاقو سے تمہاری دونوں آنکھیں نکال دوں گا۔ تمہاری زبان کاٹ دوں گا اور تمہارے کان ناکارہ کر دوں گا۔ تم زندہ رہو گے لیکن کیسے زندہ رہو گے، تم سوچ سکتے ہو؟"

پہلی بار پستہ قد شخص کے چہرے پر خوف نمودار ہوا لیکن اس نے کسمسا کر کہا۔ "مجھ کو نہیں معلوم... اور تم اپنی فکر کرو۔"

"تم اس طرح نہیں مانو گے۔" اس نے کہتے ہوئے پستہ قد شخص کے دائیں گھٹنے پر پستول کی نال رکھ دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، عقب سے ایک بھرائی ہوئی آواز آئی۔

"کوئی حرکت مت کرنا بلال مصطفیٰ... پستول آہستہ سے پیچھے پھینک دو۔"

اس نے آہستہ سے سر گھما کر دیکھا۔ عقبی صحن کی طرف کے پستول کا رخ اس کی طرف تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور دھیمی آواز میں بولا۔ "یہ تم ہو۔"

"تم نے پستول نہیں پھینکا۔" اس نے للکار کر کہا تو اس نے ہاتھ پیچھے کر کے پستول اس کی طرف پھینک دیا اور بولا۔

"تم غلطی کر رہے ہو، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے تمہاری ماں اور بہن کو اغوا کیا ہے۔ میں ان کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"جھوٹ بولتا ہے یہ۔" اب تک بھیگی بلی بنے رہنے والا طاقتور آدمی شیر بن کر بولا۔ "اسی نے انہیں غائب کیا ہے اور ہمیں بھی پکڑ رکھا ہے۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" عابد نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ماں اور بہن کے غائب ہونے کا سن کر وہ مضطرب ہوا تھا مگر اس نے خود پر قابو رکھا تھا۔ اس نے پستول اٹھا کر اپنی جیکٹ میں رکھا اور اس کی طرف دیکھا۔

"بلال مصطفیٰ... تمہارا اصل نام ہے؟"

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ "یہی میرا نام ہے۔"

عابد چونک گیا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم جانے پہچانے لگ رہے ہو؟"

اس نے انکار کیا۔ "ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"فون پر بھی نہیں؟" عابد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تو بلال نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"تم میرے گھر میں کیوں گھسے تھے اور پھر تم نے میرا گھر ہی استعمال نہیں کیا بلکہ وہاں سے چیزیں بھی چرائیں۔"

"میں نے استعمال کیں، چرایا کچھ نہیں۔" بلال نے تصحیح کی۔ "اگر تم اجازت دو تو میں تمہارا موبائل اور کار کی چابی واپس کر دوں؟"

"بہت آہستہ سے۔" عابد نے اسے خبردار کیا۔ "میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا اگر تم نے مجبور نہ کیا تو..."

بلال نے ان دونوں کے پرس بھی نکال لیے تھے۔ اس نے موبائل کے ساتھ کار کی چابی بھی عابد کی طرف بڑھا دی۔ پھر ایک ہزار کا نوٹ اور آگے کیا۔ "یہ اس کے بدلے جو میں نے تمہارے کچن سے کھایا پیا تھا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" عابد نے بے پروائی سے کہا۔ "تمہارا مجھ پر حق بنتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" بلال کہتے ہوئے چونکا۔ "میرے خدا... تم وہی ہو..."

WWW.PAKSOCIETY.COM

عابد نے سر ہلایا۔ ''تم نے دیر سے شناخت کیا... میں پہلے ہی تمہاری آواز سے پہچان چکا تھا۔''

''میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' بلال نے کہا تو عابد اسے کچن میں لے آیا۔ یہاں سے وہ ان دونوں پر نظر رکھ سکتے تھے اور آپس میں بات بھی کر سکتے تھے۔

''سب سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم میرے گھر میں کیوں اور کیسے گھسے؟''

''یہ بعد کی بات ہے، اس وقت زیادہ اہم تمہاری ماں اور بہن ہیں۔ وہ ان لوگوں کے قبضے میں ہیں۔''

''کن لوگوں کے؟'' عابد فکر مند ہو گیا۔ اب تک وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماں اور بہن محفوظ ہیں۔

''کوئی ملک قادر حیات ہے؟''

وہ اچھل پڑا۔ ''قادر حیات... اور تم مجھے اب بتا رہے ہو؟''

''تم آتے ہی غیر ضروری باتوں میں الجھ گئے تھے۔'' بلال نے کہا۔ ''میں ان سے یہی اگلوا رہا تھا کہ ان دونوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔''

عابد کا موڈ بدل گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''یہ ضرور بتائیں گے... اگر نہیں بتایا تو میں ان کی بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔''

☆☆☆

ملک قادر حیات اس کچے لیکن وسیع احاطے والے ڈیرے میں ٹہل رہا تھا۔ یہ اس کی زمینوں پر تھا۔ قصبے کے عالی شان مکان اور زمین کے علاوہ بھی اس کے پاس بہت بڑی زمین تھی لیکن اس کی ہوس کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ رشتے داری کا لحاظ ایک طرف رکھ کر پستی کی انتہائی حد پر اتر آیا تھا اور اس نے فاریہ اور اس کی ماں کو اغوا کرا لیا تھا۔ اس کی اس زمین پر تمباکو کاشت ہوتی تھی۔ یہاں کام کرنے والے زیادہ تر افغانی تھے جو پورے پورے خاندان سمیت یہاں رہ رہے تھے اور ان کے توسط سے قادر حیات کو کچھ ایسے افراد ملے تھے جو مجرمانہ ذہن رکھتے تھے اور معقول معاوضے پر اس کے لیے سب کرنے کو تیار رہتے تھے۔ فاریہ اور اس کی ماں کو اغوا کرانے کا کام اس نے انہی لوگوں سے لیا تھا۔ اسے خطرہ نہیں تھا کہ بات باہر نکلے گی۔ ویسے بھی سب سے پہلے اسی پر جاتا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ سارا کام خوش اسلوبی سے ہوا تھا، البتہ ایک مسئلہ سامنے آیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مکان اور زمین کی ملکیت عابد کی ماں کے پاس ہے لیکن اس نے انکشاف کیا تھا کہ یہ ملکیت عابد کے پاس تھی۔ اس کے پیش کار کے دفتر میں تعلقات تھے اور اس نے ایک کال کر کے تصدیق کر لی تھی کہ یہ بات درست ہے۔ اس کے آدمی فاریہ کا موبائل بھی لے آئے تھے۔ اس پر کال آنے لگی تو اس نے ریسیو نہیں کی پھر عابد کے نمبر سے ایس ایم ایس آیا کہ وہ کال ریسیو کرے۔ قادر حیات خوش ہو گیا کہ وہ جس کام کے لیے پریشان تھا، یعنی عابد سے کیسے رابطہ کرے کہ وہ یہاں دوڑا آئے، وہ خود ہو گیا تھا۔ وہ کوٹھری میں آیا جہاں دونوں ماں بیٹی قید تھیں۔ اس نے موبائل فاریہ کو دیا اور ماں کے سر پر پستول رکھا۔

''ابھی عابد کی کال آئے گی۔ اسے کہنا فوراً گھر آئے۔ اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو تیری ماں کا بھیجا باہر ہوگا۔''

قادر حیات سفاک تاثرات اور خون جیسی سرخ رنگ آنکھوں والا تنومند شخص تھا۔ نرم لہجے میں بھی بات کرتا تو ایسا لگتا تھا کہ سامنے والے کو پھاڑ کھائے گا۔ فاریہ نے بے چون و چرا اس کے حکم کی تعمیل کی اور جب اس نے اپنی بات کہہ دی تو قادر حیات نے جھپٹ کر اس سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔ فاریہ نے اس سے کہا۔ ''خدا کے لیے ہمیں جانے دو... امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''چپ کر کے پڑی رہ... اب تمہاری قسمت کا فیصلہ عابد کے آنے پر ہوگا۔'' قادر حیات اسے جھڑک کر باہر نکل گیا۔ فاریہ نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کے یا ماں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اس نے قادر حیات کے بارے میں سنا تھا کہ وہ عیاش شخص ہے۔ شراب اور عورتوں کا رسیا ہے۔ کال کے بعد اسے کچھ اطمینان ہوا کہ بھائی آئے گا تو شاید ان کی جان بچنے کی کوئی راہ نکل آئے۔

قادر حیات نے فوری طور پر اپنے دو آدمی روانہ کیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ عابد کو بے دست و پا کر کے یہاں لے آئیں۔ ان میں سے پستہ قد جس کا نام اشرف شاہ تھا، اس کے ڈیرے سے روانہ ہوا اور اس نے دوسرے شخص بابر کو راستے سے لیا مگر انہیں گئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اب تک وہ واپس آئے تھے، نہ ان کی طرف سے کوئی پیغام آیا۔ قادر حیات نے اشرف کو کال کی لیکن وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قادر حیات کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس قصے کو نمٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ مکان اور زمین اس کے قبضے میں آتی تو پورے قصبے میں اس کا مکان سب

کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ اشرف شاہ کو کال کی، اس بار بھی اس نے ریسیو نہیں کی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اشرف شاہ اتنی دیر موبائل نہ دیکھے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ قادر حیات متفکر ہو گیا۔ اس نے اپنے پاس موجود فاریہ کا موبائل نکالا اور اس پر دیکھا۔ عابد کے نمبر سے اس پر مس کال موجود تھی۔ قادر حیات نے عابد کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد بیل جانے لگی۔ ایک بار بیل بج بج کر بند ہو گئی۔ قادر حیات نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ اس بار کال ریسیو ہوئی اور کوئی بولا۔ ''ہیلو...''

قادر حیات کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

☆☆☆

کال عابد نے ریسیو کی۔ اس نے ہیلو کہا تو جواب میں اسے قادر حیات کی آواز سنائی دی۔ ''عابد... تم کہاں ہو... اب تک گھر نہیں پہنچے؟''

عابد نے اداکاری کی۔ ''فاریہ کا موبائل تمہارے پاس کیسے آیا اور وہ کہاں ہے؟''

''صرف فاریہ نہیں، تمہاری ماں بھی میرے پاس ہے اور بالکل محفوظ ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' عابد نے گرج کر کہا۔

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ ایک منٹ میں تمہاری بات کراتا ہوں۔''

عابد نے بلال کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ ایک منٹ بعد فاریہ کی آواز آئی، وہ رو رہی تھی۔ عابد تڑپ گیا۔ ''فاری... کیسی ہے؟ امی کہاں ہیں؟''

''وہ میرے پاس ہیں... بھائی اس شیطان نے ہمیں اغوا کر لیا ہے۔ پلیز ہمیں اس سے آزاد کرائیں... موبائل دو...'' فاریہ کے چلانے کی آواز آئی۔ پھر قادر حیات نے کہا۔

''تم نے بات کر لی اپنی بہن سے... اور اطمینان ہو گیا ہوگا۔ اب تمہارے پاس صرف چھ گھنٹے کا وقت ہے۔''

''چھ گھنٹے... وہ کس لیے؟''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''دارالحکومت میں جہاں میں کام کرتا ہوں۔''

''تم فوراً اپنے گھر کی طرف چل پڑو۔ وہاں میرے آدمی ہوں گے۔ وہ تمہیں مکان اور زمین کی ملکیت کے کاغذات دیں گے اور تم ان پر سائن کرو گے۔ جب یہ کاغذات مجھے مل جائیں گے تو تمہاری ماں اور بہن تمہیں

''میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ تم ایک ہاتھ سے مجھ سے سائن کراؤ اور دوسرے ہاتھ سے ان کو میرے حوالے کرو۔'' عابد نے کہا۔

''جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو... ورنہ یہ دونوں بہت عذاب سے مریں گی۔ تم بھی نہیں بچو گے۔ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔'' قادر حیات کا لہجہ سفاک ہو گیا۔

''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں اکیلا ہی تمہارے لیے کافی ہوں۔ یہ بات بھول جاؤ کہ میں تمہاری بات مان لوں گا۔''

''ٹھیک ہے، تم گھر پہنچو اور میرے آدمی جہاں لے جائیں ان کے ساتھ چلے آؤ۔''

''میں ایک گھنٹے بعد تم سے بات کرتا ہوں۔'' عابد نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ کچن میں تھے اور بلال کان لگا کر سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ مسلسل اپنے آدمی کو کال کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس کی بات کرا دو ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گا۔''

''یہ کیسے بات کرے گا؟'' عابد نے بدمزگی سے اشرف کی طرف دیکھا۔ ''تم نے اس کا حشر کر دیا ہے۔ بولا تو فوراً پتا چل جائے گا کہ گڑبڑ ہے۔''

''دوسرے کی بات کرا دو، وہ فرمانبردار ہے جو کہو گے وہی کہے گا۔''

وہ اس کمرے میں آئے تو اتفاق سے اسی وقت اشرف کے موبائل پر کال آنے لگی۔ بلال نے بابر سے کہا۔ ''کال ریسیو کرو اور قادر حیات سے کہو کہ سب ٹھیک ہے اور تم لوگ عابد کا انتظار کر رہے ہو۔ وہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔ میری بات سمجھ گئے ہو نا؟''

بابر نے سر ہلایا۔ بلال نے موبائل اسے تھمایا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس نے کال ریسیو کی اور تھوک نگل کر بولا۔ ''جی ملک جی! اشرف باہر ہے... جی موبائل میرے پاس تھا... اشرف نے بیل آف کی ہوئی ہے... اس لیے پتا نہیں چلا... ابھی دیکھا ہے... نہیں جی وہ اب تک نہیں آیا... ہم انتظار کر رہے ہیں... ٹھیک ہے ملک جی۔'' اس نے کال کاٹ دی اور مردہ لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے ٹھیک کہا نا؟''

''شاباش۔'' بلال نے اس کا شانہ تھپکا اور عابد کو اشارہ کیا۔ عابد نے ٹائیگر کو اس کی کوٹھری میں بند پایا تھا لیکن وہ ٹھیک تھا۔ وہ دوبارہ کچن میں آئے۔ ''اب وہ اپنے آدمیوں کی طرف سے مطمئن ہوگا۔ تمہارے پاس

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقت ہے۔"

عابد چونکا۔ "میرے پاس... کیا تم جارہے ہو؟"

بلال ہچکچایا۔ "میرا خیال تھا کہ میں جس حد تک کرسکتا تھا میں نے کردیا ہے۔"

عابد نے سوچا اور سر ہلایا۔ "بلکہ زیادہ ہی کیا ہے۔ میں عالیہ کی مدد کے لیے تمہارا شکر گزار رہوں۔"

"وہ میں نے حساب برابر کیا تھا... تمہارے گھر میں پناہ لی تھی اور اپنا علاج کیا تھا۔"

"تمہیں گولی لگی تھی؟" عابد نے پوچھا۔ "زخم کیسا ہے؟"

اس نے پیٹ سے شرٹ اوپر کرکے اور پٹی ہٹا کر اپنا زخم دکھایا۔ "اب تقریباً ٹھیک ہے، گولی بھی زیادہ اندر نہیں گئی تھی۔"

"ہاں بہتر لگ رہا ہے۔" عابد نے سر ہلایا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

"جہاں تقدیر لے جائے۔" بلال نے سرد آہ بھر کر کہا۔ عابد اسے باہر تک چھوڑنے آیا اور آخری بار گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملا کر اسے رخصت کیا۔ پھر وہ گیٹ بند کرکے اندر آیا۔ اب اسے اشرف کی زبان کھلوانی تھی۔ وہ کچھ چیزوں کے ساتھ لاؤنج میں آیا تو اشرف اور بابر کے چہرے اسے دیکھ کر زرد پڑ گئے۔

☆☆☆

قادر حیات، بابر سے بات کرنے کے بعد مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد عابد اس کے سامنے ہوگا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مکان اور زمین کے کاغذات پر سائن کرا کے ان تینوں کو اس وقت تک اپنی تحویل میں رکھے گا جب تک پیش کار کے دفتر میں مکان اور زمین اس کے نام نہیں ہوجاتی۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح پیسا کھلا کر اپنا کام کرانا ہوتا ہے اور پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ عبید الرحمن کی زندگی سے ہی قادر حیات کی اس زمین پر نظر تھی۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ وہ اسے یہ زمین فروخت کردے مگر عبید الرحمن نے ہمیشہ انکار کیا۔ پھر جب پائی وے قصبے کے درمیان سے گزری تو زمین کی قیمت راتوں رات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اسی لحاظ سے قادر حیات کی زمین کے لیے خواہش بھی بڑھی۔ تمام کوششوں میں ناکامی کے بعد اسے یہ کام کرنا پڑا تھا اور اب اسے کامیابی کی امید ہوئی تھی۔ اس خوشی میں اس نے بوتل کھول لی۔

جب تک دھوپ تھی، وہ باہر رہا مگر دھوپ ختم ہونے پر وہ اندر آگیا۔ یہاں ایک چھوٹی سرخ کھپریل کی چھت والی خوب صورت سی عمارت تھی۔ اندر نشست گاہ میں انگیٹھی جل رہی تھی اور اس کی حرارت سے کمرا خوشگوار حد تک گرم ہوگیا تھا۔ قادر حیات کے لیے تلا ہوا دیسی مرغ لایا گیا تھا۔ وہ وہسکی کے ساتھ اس سے شغل کر رہا تھا۔ عابد نے اس سے ایک گھنٹے کی مہلت لی تھی اور ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ اسے دوبارہ کال کرے کہ فاریہ کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ عابد نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ میں تمہارے پاس آرہا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو؟"

"تمہارے گھر میں جو میرے آدمی موجود ہیں، ان کو معلوم ہے کہ تمہیں کہاں لانا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں پیپرز پر سائن اس وقت کروں گا جب تم امی اور فاریہ کو میرے حوالے کرو گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" قادر حیات فوراً مان گیا کیونکہ اس کا ایسا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایک بار عابد اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ فاریہ کے حوالے سے دھمکی دے کر اس سے کچھ بھی کرا سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔" عابد نے کہا۔

"کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" قادر حیات نے اسے خبردار کیا۔ "ورنہ تم جانتے ہو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"کوئی چالاکی نہیں کروں گا۔" عابد نے کہا اور کال کاٹ دی۔ قادر حیات مسکرانے لگا۔ اس نے زیر لب کہا۔

"ایک بار تم یہاں آؤ تو..."

اس نے اپنے ملازم کو آواز دی اور اسے حکم دیا۔

"اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔"

"جو حکم سرکار۔" ملازم بولا۔

☆☆☆

اشرف شاہ کی حالت بُری تھی۔ وہ اپنی دو انگلیوں اور ایک کان سے محروم ہوگیا تھا۔ عابد نے کٹر اور استرا استعمال کیا تھا۔ بالآخر اس نے زبان کھول دی تھی۔ اس نے قادر حیات کے ڈیرے کی نشان دہی کردی تھی۔ عابد نے وہاں کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں پوچھا۔ اشرف نے روتے دھوتے بتایا کہ وہاں قادر حیات کے خاص بندے بھی چار پانچ ہوتے ہیں جبکہ ڈیرے پر موجود لوگوں کی تعداد درجن ہوتی تھی اور وہ سب اسلحہ استعمال کرنا جانتے تھے۔ اس سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے قادر حیات کو کال

تھا۔ اگرچہ اس میں رسک تھا لیکن وہ فاریہ اور ماں کو آزاد کرانے کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ اس نے اشرف سے کہا۔ "تیار ہوجاؤ، تم میرے ساتھ چلو گے۔"

"اور میں۔" بابر نے پوچھا۔

"تم یہیں رہو گے۔" عابد نے کہا اور اس کے سر پر پستول کا دستہ رسید کردیا۔ وہ بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ عابد نے اسے کھینچ کر اسٹور میں بند کردیا۔ اگر وہ ہوش میں آکر خود کو آزاد کرا لیتا تب بھی اسٹور سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اشرف کی حالت بری تھی لیکن وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ عابد نے اسی کی گاڑی استعمال کی۔ یہ چھوٹی دو دروازوں والی جیپ تھی۔ عابد نے اسے جیپ میں دھکیلا۔ اس نے اپنی رائفل ساتھ لے لی تھی۔ پستول اس کے پاس پہلے ہی تھا۔ باہر تاریکی پوری طرح چھا چکی تھی۔ اشرف کے مطابق انہیں کوئی بیس میل دور جانا تھا۔ اس میں آخری دو میل کا سفر ایک کچی پہاڑی سڑک پر تھا۔ عابد نے اشرف شاہ کے پاؤں کھول دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ عابد نے اسے وارننگ دی۔ "اگر تم نے کوئی حرکت کی تو اپنی موت کے ذمے دار خود ہو گے۔ وفاداری اچھی چیز ہے لیکن قادر حیات جیسے آدمی کے لیے مرجانا کتنا مناسب ہوگا، یہ تم خود سوچ سکتے ہو۔ وہ پلٹ کر تمہارے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔"

"میں... کوئی حرکت نہیں کروں گا۔" اس نے سہم کر کہا۔ ایک کان اور دو انگلیوں سے محروم ہو کر اس کی ساری اکڑفوں رخصت ہوگئی تھی۔

"اسی میں تمہاری عافیت ہے۔" عابد نے جیپ آگے بڑھادی۔ "یہ جیپ کس کی ہے؟"

"میری ہے۔" اشرف نے جواب دیا۔

"تم افغانی ہو؟" عابد نے کہا تو وہ حیران رہ گیا۔

"تم نے کیسے جانا؟"

"میرا آئے دن تم لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔"

اشرف نے اعتراف کیا۔ "میرا تعلق شمالی افغانستان سے ہے۔ لیکن میں بیس سال سے یہیں ہوں۔"

"تم اور تمہارے جیسے ہزاروں لاکھوں بیس تیس سال سے اسی سرزمین پر بیٹھے ہیں، یہاں کا کھا رہے ہیں اور اسی ملک کے خلاف کام کر رہے ہیں۔" عابد نے تلخی سے کہا۔ "منشیات اور اسلحے کی ساری اسمگلنگ تم لوگ کرتے ہو۔"

لرتا۔"

ورتوں کو اغوا

ارض، قرض، قرض

کرتے ہو۔" عابد کا لہجہ سرد تھا۔ یہ تیرہ تاریخ کا چاند تھا اور سات بجے چاند بلند ہوا تو پہاڑوں میں اس کی روشنی پھیل گئی۔ اس وقت وہ قادر حیات کے ڈیرے سے کچھ دور رہ گئے تھے۔ اشرف شاہ اسے گائیڈ کر رہا تھا۔ وہ کچی سڑک تک پہنچے تو عابد نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کروئیں۔ اشرف شاہ خوفزدہ ہوگیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو... اس راستے پر بغیر روشنی کے گاڑی چلانا بہت خطرناک ہوگا۔"

"تم فکر مت کرو، میں خودکشی کرنے والا شخص نہیں ہوں۔" عابد نے کہا۔ اس نے اشرف شاہ سے کاغذات لے لیے تھے۔ وہ اس نے اپنی شرٹ کے اندر چھپا رکھے تھے۔ کچے راستے پر جیپ کے انجن کو زیادہ زور لگانا پڑ رہا تھا اور اس کے غرانے کی آواز یقیناً آس پاس پھیل رہی تھی۔ ان پہاڑوں پر تمباکو کاشت کرنے والوں کے فارمز تھے۔ یہاں مقامی آبادیاں کم تھیں البتہ فارمز میں کام کرنے والے مزدوروں نے جگہ جگہ کچی کوٹھریاں بنا رکھی تھیں جہاں وہ اپنے خاندان سمیت رہتے تھے۔ دس منٹ بعد اشرف شاہ نے دور ایک کچے احاطے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ قادر حیات کا ڈیرا ہے۔"

"یہاں تک پہنچانے کا شکریہ... اب تم بھی آرام کرو۔" عابد نے کہا اور اچانک اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ وہ کراہ کر آگے جھکا اور ساکت ہوگیا۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہ آتا۔ عابد نے جیپ ایک طرف روک دی۔ اس نے چابی نکال لی اور رائفل لے کر نیچے اتر آیا۔ یہ چھوٹی نال کی بارہ بور والی رائفل تھی۔ اس میں ایک وقت میں پانچ کارتوس لوڈ کیے جاسکتے تھے اور ہر بار کلپ گھما کر نیا کارتوس نال میں لانا پڑتا تھا مگر مار اور درستگی کے لحاظ سے یہ بے مثال ہتھیار تھا۔ عابد تیز قدموں سے درختوں اور دیواروں کے سائے میں قادر حیات کے ڈیرے کی طرف بڑھا۔ دیواریں کچی مگر سات سے آٹھ فٹ بلند تھیں۔ ایک جگہ دیوار کے ساتھ پتھر پڑا ہوا تھا۔ عابد نے اس پر چڑھ کر دیوار پر ہاتھ جمائے اور اوپر اٹھا۔ پیٹ کے بل دیوار پر ٹیک کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ یہاں بجلی نہیں تھی مگر چاندنی میں اندر کا منظر واضح تھا۔

سیب کے ایک چھوٹے باغ کے ساتھ ایک خوب صورت کھپریل کی چھت والی چھوٹی عمارت تھی۔ اس کے آگے بڑا صحن تھا جس میں چارپائیاں بچھی تھیں اور پلاسٹک کی میز و کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے ذرا آگے احاطے کی دیوار

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ساتھ چند کچی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کوٹھریوں کے سامنے دو مسلح افراد ٹہل رہے تھے اور کبھی کبھی ایک طرف رکھے لوہے کے ڈرم میں جلتی آگ سے ہاتھ سینکتے تھے۔ کھپریل والی عمارت کے سامنے بھی دو مسلح آدمی موجود تھے۔ جائزہ لے کر وہ خاموشی سے اندر اتر آیا اور درختوں کے درمیان جھکا جھکا کھپریل والی عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ وہ سامنے سے نظروں میں آئے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں صرف چار مسلح افراد نہیں تھے، اشرف شاہ کے مطابق ان کی تعداد درجن بھر تھی اور کسی بھی ہنگامہ آرائی کی صورت میں وہ فوری مسلح ہو کر آجاتے۔ عمارت کے عقب میں دور تک ڈھلان پر تمباکو کے پودے لگے ہوئے تھے مگر اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔

عمارت کے پیچھے بھی ایک دروازہ تھا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس کے علاوہ دو کھڑکیاں تھیں اور ان پر گرل تھی۔ عمارت ایک منزلہ تھی اس لیے اوپر جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ عقبی دروازہ کھلا۔ وہ فوری دیوار سے چپک گیا۔ ایک ملازم جیسے والا شخص کچرے کا تھیلا اٹھائے باہر نکلا اور کچھ دور واقع بھٹی کی طرف بڑھا۔ اس کا خانہ کھول کر اس نے کچرا اندر ڈال دیا۔ یہ بھٹی تمباکو پکانے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس سے پہلے وہ شخص واپس آتا، عابد خاموشی سے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک راہداری تھی جس کے دونوں طرف دو کمرے تھے۔ آگے راہداری نشست گاہ میں کھل رہی تھی۔ کل عمارت بس اتنی تھی۔ اس سے پہلے کہ ملازم واپس آتا، وہ دائیں طرف کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ سجا سجایا بیڈروم تھا۔ اس کا اعلیٰ فرنیچر اور فرش کا دبیز قالین بتا رہا تھا کہ یہ قادر حیات کے لیے مخصوص ہے۔ دیوار پر لگا کیروسین لیمپ جل رہا تھا۔ عابد چونکا۔ بڑی مسہری پر کوئی کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بے آواز دروازہ بند کیا اور مسہری کی طرف بڑھا۔ پستول آگے کرتے ہوئے اس نے اچانک سونے والے کے منہ سے کمبل کھینچا تو بری طرح چونکا۔ وہ فاریہ تھی جو بے بسی سے بندھی پڑی تھی اور اس کے ہاتھ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔

"فاری تو..." عابد نے بے تابی سے کہا اور پستول رکھ کر اس کا منہ کھولنے لگا۔ فاریہ کی آنکھیں تیزی سے گھوم رہی تھیں جیسے ہی عابد نے اس کا منہ کھولا وہ چلائی۔

"بھائی بچو..."

اسی لمحے عابد کو اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، کوئی چیز اس کی گدی سے ٹکرائی اور اسے ہوش نہیں رہا۔ وہ اوندھے منہ مسہری کے ساتھ گر پڑا۔ وار کرنے والا قادر حیات تھا۔ اس نے چلاتی ہوئی فاریہ کا منہ دوبارہ کپڑے سے بند کیا۔

"پاگل کا بچہ... بیوقوف سمجھتا تھا کہ اتنے آرام سے ادھر گھس آئے گا۔"

عابد کو ہوش آیا تو وہ کانپ اٹھا کیونکہ اسے بہت سرد پانی منہ پر ڈال کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ وہ نشست گاہ میں تھا اور ایک کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ سامنے صوفے پر قادر حیات شاہانہ انداز میں بیٹھا وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مسلح آدمی کھڑا تھا۔ قادر حیات نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ "اب تجھے ہوش آگیا ہوگا۔"

عابد نے سر جھٹکا۔ "تم جان گئے تھے کہ میں اندر آگیا ہوں۔"

"ہاں، میرا ایک آدمی اوپر رات میں دیکھنے والی دوربین کے ساتھ تھا۔ اس نے تجھے دیکھ لیا پھر تجھے اندر بلایا اور تو آرام سے چوہے دان میں چلا آیا۔ میں جانتا تھا تو اپنے گھر پہنچ گیا ہے اور ان دونوں گدھوں کو قابو کر لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا تو یہیں آئے گا۔"

عابد محسوس کر رہا تھا کہ وہ بُری طرح پھنس گیا ہے اور اس کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ قادر حیات نے نہ صرف اس کی ماں اور بہن کو قید کیا ہوا تھا بلکہ اب وہ خود اس کے قابو میں آگیا تھا۔ وہ اس سے مکان اور ملکیت کے کاغذات پر سائن کرا سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ وہ انہیں مار کر غائب کر سکتا تھا یا ان کی لاشیں کہیں پھینک دیتا تب بھی اس پر کوئی الزام لگانا مشکل تھا۔ اس کی گردن دکھ رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "قادر حیات! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ مکان اور زمین میرے باپ کی ملکیت ہے اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اب بن گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ تم مجھ سے پیپرز پر سائن لے سکتے ہو لیکن یہ تبھی ہوگا جب تم میری ماں اور بہن کو آزاد کر دو گے۔"

قادر حیات مسکراتا رہا۔ "میں بے وقوف نہیں ہوں، انہیں آزاد کر دوں، اور پھر تم انکار کر دو تو میرے ہاتھ سے تمہاری جان لے

"دوسری صورت میں میں تم پر کیسے اعتبار کروں؟"

"تم کرو گے۔" قادر حیات ذرا جھک کر بولا۔ "کیونکہ تم مجبور ہو۔"

"مجھے... مجھے سوچنے کی مہلت دو۔" عابد نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"تمہارے پاس صرف دس منٹ کی مہلت ہے۔" قادر حیات بولا۔ "تمہاری بہن میرے بیڈروم میں ہے۔ اگر تم نے سائن نہ کیے تو میں اندر چلا جاؤں گا۔"

عابد لرز گیا۔ اس نے کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" قادر حیات نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تمہارے پاس نو منٹ ہیں۔"

عابد کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمایاں تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ قادر حیات جیسے شخص پر اعتبار کرنا کس قدر مہلک ہو سکتا ہے۔ وہ سانپ اور بچھو سے زیادہ خطرناک تھا۔ ایک بار وہ سائن کر دیتا تو مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر آجاتا۔ قادر حیات ہر گزرتے منٹ پر اعلان کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسے بتا رہا تھا کہ ایک بار اس نے یہ موقع گنوا دیا تو پھر معاملہ ان تینوں کی موت تک جائے گا۔ وہ انہیں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ بعد میں بھی اس مکان اور زمین پر قبضہ کر سکتا تھا۔ پیسا اس کی ہر مشکل کو آسان کر دیتا۔ وہ مکان اور زمین کے ساتھ جان اور آبرو سے بھی جاتے۔ قادر حیات نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ دونوں چیزیں واپس نہیں ملیں گی۔ مکان اور زمین تو تم اور بھی بنا سکتے ہو۔"

ایک منٹ رہ گیا تو قادر حیات کھڑا ہوگیا۔ اس بار عابد خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ "ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... میں سائن کر رہا ہوں۔"

قادر حیات مسکرایا اور اس نے کاغذات اور پین عابد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس کے اشارے پر اس کے آدمی نے عابد کے ہاتھ کھول دیے۔ عابد نے یہ ظاہر دونوں ہاتھ میز کی طرف بڑھائے جیسے سائن کرنے جا رہا ہو لیکن اس نے دونوں ہاتھ ٹیکتے ہوئے اچانک پیچھے کی طرف دولتی جھاڑی اور قادر حیات کا آدمی اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ قادر حیات اپنا پستول نکال رہا تھا کہ عابد اس سے جا ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا زمین پر گرا۔ قادر حیات گرا مگر اس نے پستول نہیں چھوڑا۔ البتہ جب عابد نے سر اس

تول لینے میں

در حیات کے

ارض، فرض، قرض

دوسری طرف گرا مگر وہ حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کر صوفے کے دوسری طرف چلا گیا۔ اس کا آدمی زمین سے اٹھ رہا تھا اور اس نے اپنی شاٹ گن اٹھالی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا عابد نے گولی چلا دی وہ اس کے سینے میں اتر گئی۔

اسی لمحے دھماکے سے باہر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص رائفل بدست نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی عابد تیزی سے کمرے کی طرف پسپا ہوا اور اس نے آنے والے پر دو فائر کیے مگر وہ بچ گیا اور جب تک وہ رائفل سیدھی کرتا، عابد بیڈروم کے مخالف والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہاں سے نشست گاہ کا بڑا حصہ نظر آرہا تھا۔ قادر حیات وہیں کہیں تھا اور وہ اس کی نظروں سے بچ کر باہر نہیں جاسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی۔ "عابد! تم بچ کر نہیں جا سکتے... تمہاری ماں ہمارے پاس ہے۔"

"اور تمہاری جان میرے قبضے میں ہے۔ تم مرے بغیر یہاں سے گزر نہیں سکتے۔" عابد نے جواب دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فاریہ ان لوگوں کی رسائی سے دور تھی لیکن اس کی ماں ان کے قبضے میں تھی اور وہ اسے استعمال کر سکتے تھے۔ اس کی بات کے جواب میں قادر حیات نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس کی ماں کو لے آئیں۔

☆☆☆

عابد کے جانے کے چند منٹ بعد اشرف شاہ ہلنے لگا تھا۔ جب وہ اس کے سر پر ضرب لگا رہا تھا تو اس نے جان کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اس لیے ضرب ٹھیک سے نہیں لگی تھی اور وہ جلد ہوش میں آگیا۔ اس نے اٹھ کر اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش شروع کی۔ جلد وہ اس میں بھی کامیاب رہا۔ اگرچہ کٹی ہوئی انگلیوں کے زخم سخت تکلیف دے رہے تھے مگر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو آزاد کرا لیا۔ وہ کراہتے ہوئے نیچے اترا کیونکہ جیپ میں چابی نہیں تھی۔ وہ دروازے سے لگا گہرے سانس لے رہا تھا کہ پاس ہی سے کسی نے کہا۔ "مبارک ہو۔"

اشرف شاہ کی جان نکل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو بلال اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "قادر حیات کا اڈا کہاں ہے؟"

انکار کا فائدہ نہیں تھا۔ اشرف شاہ نے ہاتھ سے ڈیرے کی طرف اشارہ کیا تو بلال کا گھونسا اس کے سر پر لگا اور وہ ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا۔ بلال نے اسے اٹھا کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیپ کے عقبی حصے میں ڈالا اور ڈیرے کی طرف بڑھا۔ جب وہ عابد کے گھر سے نکلا تو اس کا ارادہ سچ مچ چلے جانے کا تھا مگر کچھ دیر بعد اسے لگا کہ اس نے عابد کو اکیلا چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کی ماں اور بہن دشمن کی قید میں تھیں اور اسے ان کو آزاد کرانا تھا۔ اسے مدد کی ضرورت تھی۔ وہ نیچے ہائی وے سے پلٹ آیا لیکن براہِ راست اندر آنے کے بجائے وہ گیٹ کے پاس رک گیا۔ کچھ دیر بعد عابد جیپ لے کر نکلا۔ اس کے ساتھ اشرف بیٹھا تھا۔ بلال سمجھ گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ عابد کے جاتے ہی وہ گیٹ پھلانگ کر اندر گیا اور اس کی موٹر سائیکل لے کر نکل آیا۔ عابد نے بعد میں موٹر سائیکل اندر کھڑی کر دی تھی اور اس کی چابی بھی اس میں لگی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد وہ جیپ کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کی شناخت آسان تھی، اس کی ایک ٹیل لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی۔

وہ کسی قدر فاصلے سے تعاقب کرنے لگا کیونکہ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا پھر جب جیپ کچے راستے پر مڑی اور اس کی روشنیاں بند ہو گئیں تو اس نے بھی احتیاطاً موٹر سائیکل کی روشنیاں بند کر دیں۔ کچے پر موٹر سائیکل چلانا زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا اس لیے جیپ آگے نکل گئی اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو اس میں عابد نہیں تھا اور اشرف شاہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اس سے قادر حیات کے ٹھکانے کا پوچھ کر وہ اسے بے ہوش کر کے اس طرف بڑھا۔ اس نے سامنے والے حصے کا رخ کیا جہاں دیوار کے اندر کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی چھت کی لکڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ وہ سب سے آخری لکڑی پکڑ کر اوپر چڑھا۔ کھنچاؤ سے زخم میں تکلیف ہوئی مگر یہ زیادہ نہیں تھی۔ وہ چھت کے ساتھ دیوار پر چڑھا۔ چھت ٹین کی تھی اور اس پر دباؤ پڑتا تو وہ شور کرتی۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ وہ نیچے اتر آیا مگر جب اس نے دیوار سے جھانکا تو کوٹھریوں کے سامنے دو مسلح افراد ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔

ایک فرد صحن کے پار کھپریل والی عمارت کے سامنے تھا۔ اچانک اندر سے دبے دبے فائر کی آواز آئی اور باہر موجود فرد عمارت کی طرف لپکا۔ اس نے دروازہ کھولا تھا کہ اندر سے اس پر فائر ہوئے مگر وہ بچ گیا اور پھر اس نے رائفل سے جوابی فائر کیا۔ کوٹھریوں کے سامنے موجود افراد میں کھلبلی مچی اور وہ بھی عمارت کی طرف بڑھے۔ ان کے جاتے ہی بلال آڑ سے نکلا اور اس نے پہلی کوٹھری کا دروازہ چیک کیا۔ یہ زنجیر لگا کر باہر سے بند تھا اس نے اسے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہاں لالٹین کی روشنی تھی اور ایک بوڑھی خوفزدہ عورت چارپائی پر بیٹھی تھی۔ بلال نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور پھر آہستہ سے بولا۔

''آپ عابد کی امی ہیں؟''

''ہاں، تم کون ہو؟''

''میں اس کا دوست ہوں... اس کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔''

ماں بے چین ہو گئی۔ ''عابد یہاں آ گیا ہے، یہ اس نے کیا کیا؟''

''ماں جی فاریہ کہاں ہے؟''

ماں کا چہرہ ست گیا۔ ''وہ اسے یہاں سے زبردستی لے گئے ہیں۔''

بلال نے دروازے کی درز سے باہر جھانکا۔ ایک آدمی اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے ماں سے کہا۔ ''ایک آدمی ادھر آ رہا ہے۔ وہ اندر آئے تو آپ اسے متوجہ رکھنا، میں اسے قابو کر لوں گا۔''

مگر وہ کچھ کر نہیں سکی۔ کواڑ باہر کھل رہے تھے اس لیے بلال ان کی آڑ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ آنے والے نے فوراً اس کی موجودگی بھانپ لی مگر اس نے شور مچانے کے بجائے اپنی شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کرنے کی کوشش کی اور اسی سے بلال کو موقع مل گیا۔ اس نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور سر کی ٹکر ماری۔ وہ ڈھیلا ہوا تو اس کی رائفل چھین کر ایک طرف پھینک دی اور اسے گھما کر اس کی گردن ہاتھ سے دبا لی۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خاصا مضبوط نوجوان تھا مگر اناڑی تھا اس لیے شدید کوشش کے بعد بالآخر وہ ڈھیلا پڑ گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

بلال نے اسے ایک طرف پھینکا اور خود گہری سانس لی۔ اب اس کے زخم میں زیادہ تکلیف تھی۔ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے شاٹ گن اٹھا لی۔ بے ہوش آدمی کے پاس اس کے بلٹ کا پاؤچ بھی تھا۔ پھر اس نے اس کے سر پر شاٹ گن کا دستہ مارا۔ وہ قبل از وقت ہوش میں آ جاتا تو مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اشرف شاہ وقت سے پہلے ہوش میں آ گیا تھا۔ پھر اس نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا۔ ایک آدمی کھپریل والی عمارت کے دروازے پر مو[illegible] اندر فائر کر رہا تھا

اسے شک ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رائفل آگے کیے اس طرف آنے لگا۔ جب وہ دس قدم دور رہ گیا تو بلال نے اچانک نیچے بیٹھتے ہوئے اس پر پستول سے کئی فائر کیے اور فوراً آڑ میں ہو گیا۔ ایک دھماکے سے شاٹ گن کی گولی سامنے دیوار پر لگی۔ بلال نے جھانک کر دیکھا تو وہ نیچے ساکت پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

عابد محسوس کر رہا تھا کہ اسے موقع تو ملا ہے لیکن وہ اب بھی پھنسا ہوا ہے۔ اگر اس کی ماں کو لایا گیا تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دروازے پر موجود آدمی رہ رہ کر اس کی طرف شاٹ گن سے فائر کر رہا تھا اور اسے جوابی کارروائی کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے دیوار پر لگا ہوا کیروسین لیمپ اتار کر اسے نشست گاہ کی طرف اچھال دیا۔ وہ زمین پر گر کر ٹوٹا تو وہاں آگ لگ گئی۔ قادر حیات چلایا۔ وہ اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا، انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اسی لمحے باہر سے پہلے پستول کے فائر کی اور پھر شاٹ گن کے فائر کی آواز آئی۔ قادر حیات چلایا۔ ''اوہ حرامزادو... یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''ملک جی... ادھر کوٹھری میں کوئی ہے۔ جیدا واپس نہیں آیا اور سجل کو اندر موجود بندے نے گولی مار دی ہے۔''

''کوئی اور بھی اس کے ساتھ آیا تھا... تم سب آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔''

''وہ مجھے بھی گولی مار دے گا۔'' باہر موجود آدمی نے گھبرا کر کہا اور غائب ہو گیا کیونکہ قادر حیات چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہا تھا مگر اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ آگ اب صوفہ سیٹ کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہاں لکڑی کا خاصا سامان تھا۔ عابد نے کہا۔

''قادر حیات... اگر جل کر مرنا نہیں چاہتے تو ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاؤ۔''

''کبھی نہیں۔'' وہ غرایا۔ ''میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔''

''میں اور فاریہ پیچھے سے نکل جائیں گے، تم کیا کرو گے؟'' عابد نے کہا۔ ویسے اب وہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ آگ کی تپش یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فاریہ کو نکالنا چاہتا تھا مگر اسے خطرہ تھا کہ کہیں قادر حیات فرار نہ ہو جائے۔ [illegible] لے کمرے میں آیا۔ اس نے جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور بولا۔ ''جلدی نکلو... یہاں آگ لگی ہوئی ہے۔''

فاریہ سب سن رہی تھی۔ اس کے پاؤں کی چپل غائب تھی۔ وہ ایسے ہی عابد کے ساتھ باہر آئی۔ لیکن جب اس نے عقبی دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاک نکلا۔ نشست گاہ کی طرف اب آگ پوری طرح پھیل چکی تھی اور اس طرف سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اندر دھواں بھر رہا تھا۔ عابد نے کوشش کی۔ فاریہ نے ہراساں ہو کر کہا۔ ''بھائی، باہر کیسے نکلیں؟''

''پیچھے ہٹو۔'' عابد نے کہا اور دروازے کے لاک والے حصے پر لگاتار کئی فائر کیے۔ اس کے پرخچے اڑ گئے۔ عابد نے ہینڈل پکڑ کر کھینچا تو اس بار دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر نکلے تھے کہ ایک سایہ تمباکو کے پودوں میں گھستا دکھائی دیا۔ عابد نے اس پر فائر کیا تو ایک چیخ سنائی دی۔ عابد فاریہ کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اگلے حصے میں آیا۔ یہاں ایک آدمی شعلوں میں گھرا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ فاریہ نے کہا۔

''یہ قادر حیات ہے۔''

وہ قادر حیات ہی تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر باہر نکلنے کی کوشش کی تھی مگر وہ آگ کی زد میں آ گیا تھا۔ آگ نے پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ آواز نکالے بغیر جل رہا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ آواز سن کر عابد نہ آ جائے مگر کب تک... بالآخر اس کی برداشت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے اور چلانے لگا۔ کوٹھری سے ماں اور اس کے ساتھ بلال نکل آیا۔ فاریہ اور عابد ماں کی طرف دوڑے اور بیک وقت اس سے لپٹ گئے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اور ٹٹول رہی تھی۔ پھر عابد بلال کی طرف بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ ''تم واپس آ گئے دوست؟''

''ہاں یار! مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں تمہیں اس طرح درمیان میں چھوڑ کر چلا جاؤں... لیکن میں اپنے طریقے سے پیچھے آیا تھا۔''

''اسی وجہ سے ہم بچ گئے ورنہ یہ جانتا تھا کہ میں آؤں گا۔ اس نے میرے لیے ٹریپ بھی تیار کر لیا تھا۔ تمہارے بارے میں نہیں جانتا تھا ورنہ تم میرے ساتھ آتے تو پھنس جاتے۔''

''میں بروقت پہنچا۔'' بلال نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اندر تم نے کچھ کیا تھا جس کے بعد یہ ماں جی کو لینے آئے تھے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام